عالمی اردو ادب

حبیب جالب

شخصیت اور شاعری

مدیر

نند کشور وکرم

اردو کا واحد حوالہ جاتی جریدہ
عالمی اردو ادب
حبیب جالب نمبر
مدیر
نند کشور وکرم
جلد نمبر ۹
۱۹۹۴ء
قیمت ۱۵۰ روپے
پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے ۱۵ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱
فون نمبر: ۲۲۴۷۶۱۹

دار پر بھی سچ کہنے والے انسانوں کے نام
طالب علموں، محنت کاروں، دہقانوں کے نام
دنیا بھر کے اپنے جیسے دیوانوں کے نام
جالب

ترتیب

بیادِ جالب

نظمیں کلام جالب

دیباچے پیش لفظ

متفرق کلام

جالب کی چند تحریریں اور خطوط

نذرِ جالب

خراج عقیدت

پیش لفظ

عوام کے محبوب شاعر ــــ حبیب جالب کی پہلی برسی کے موقع پر اس خصوصی شمارے کی صورت میں ہم انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ۔

حبیب جالب جمہوریت کے حق میں اور آمریت کے خلاف ایک ایسے مردِ مجاہد تھے جن کے کلام کو پاکستان کے اربابِ حل و عقد بے حد خطرناک تصور کرتے تھے لہٰذا اُن کے کچھ شعری مجموعوں پر صرف پابندیاں ہی عائد نہیں کی گئیں ۔ بلکہ انہیں کئی غزلیں اور نظمیں لکھنے کی پاداش میں پابندِ سلاسل بھی ہونا پڑا لیکن قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک عوام کی بہتری اور جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے نبرد آزما رہے ۔ عوام کے لئے اُن کی اس ناقابلِ فراموش جد و جہد کی وجہ سے ہی عوام انہیں بے حد پیار کرتے تھے اس لئے جب کبھی بھی وہ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کے لئے مدعو کئے جاتے ، انہیں سننے کے لئے سامعین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے ۔ مشاعروں میں اُن کی اسی مقبولیت کے پیشِ نظر مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ مشاعروں میں جتنے سامعین انہیں نصیب ہوتے ہیں اُتنے ولی دکنی سے لے کر آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوتے ۔ پڑھے لکھے اور دانشور طبقے کے علاوہ کھیت مزدور ، صنعتی کارکن اور کسان بھی اُن کے کلام کے گرویدہ تھے ۔ اُن کی نظموں اور غزلوں کی مسحور کن خاصیت ہی کی وجہ سے انہیں چناؤ مہم میں بھی اکثر استعمال کیا جاتا رہا تھا ۔

عوام میں اُن کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے کارن ہی اکثر ناقدین نے اُنہیں نظیر اکبر آبادی کے بعد اُردو کا سب سے بڑا عوامی شاعر کہا ہے ۔ اور مزاحمت اور احتجاج کی سب سے بلند آواز ـــ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ دونوں ملکوں میں آمد و رفت کی پابندیوں اور اخبارات و رسائل اور کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے پاکستان کے اتنے مقبول و معروف شاعر کو یہاں کے اہلِ اُردو بہت کم جانتے ہیں ۔ حد تو یہ ہے کہ اُردو کے بڑے بڑے ادیب ، پروفیسر ، نقاد اور شاعر بھی ان کی شاعرانہ عظمت سے پوری طرح واقف نہیں اور بعض نے تو اُن کا نام تک نہیں سنا ہے ۔ اُس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کی تصنیفات اور اُن سے متعلق لٹریچر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں

تو چھوڑیئے۔ اُردو کے اہم مرکز دہلی میں بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

ہاں اُن کی وفات پر ہندوستان کے اخبارات میں اس سانحۂ ارتحال سے متعلق کچھ خبریں شائع ہوئیں اور انگریزی اور ہندی میں چند مختصر مضامین اشاعت پذیر ہوئے۔ اسی موقع پر خیال تھا کہ پاکستان میں اُن کی شاعری اور فن سے متعلق اخبارات و رسائل میں بہت کچھ لکھا جائے گا اور شاید کسی رسالے کا خصوصی نمبر بھی منظر عام پر آئے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ صرف چند اخبارات و رسائل ہیں ہی اِکادکا مضامین دیکھنے کو ملے۔ ایسے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی اُن سے متعلق خصوصی شمارہ پیش کرنے کا خیال آیا تاکہ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں، فنی عظمت اور قدر و قیمت سے اُردو قارئین خصوصاً ہندوستان میں رہنے والے اہلِ اُردو کو روشناس کرایا جاسکے۔

لیکن خصوصی نمبر نکالنا کوئی آسان کام تو ہے نہیں۔ ہم نے اس شمارے کی تیاری کے دوران ہند و پاک کے متعدد ادیبوں اور حبیب جالب کے پرستاروں کو خطوط لکھے لیکن اکثر نے تو جواب تک نہیں دیا اور چند نے امداد و تعاون کا وعدہ کرکے بھی اسے پورا نہ کیا تاہم ہم ماہنامہ منشور کراچی کے ذکی عباس صاحب کا اور دہلی کے عتیق الرحمٰن صاحب کا جو کہ جالب کے بہت بڑے پرستار ہیں شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے جالب سے متعلق دستیاب کچھ مواد فراہم کرنے کی زحمت کی۔ اس کے علاوہ ہم ان ادباء و شعراء کے بھی شکرگزار ہیں۔ جن کے مختلف رسائل و کتب میں شائع مضامین اور نظموں کو زیر نظر شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔

اور ہاں اس شمارے میں شامل مضامین کی تخصیص نہیں کی گئی بلکہ حبیب جالب سے متعلق جتنے بھی مضامین دستیاب ہوئے ان میں سے زیادہ تر شامل کرلئے گئے حالانکہ ان میں سے اکثر میں تکرار پائی جاتی ہے اور ان میں حبیب جالب کی مقبول عام نظموں کے اشعار کا بار بار حوالہ اچھا نہیں لگتا۔ ان اشعار کو ترتیب و تدوین کے دوران قلمزد کیا جاسکتا تھا لیکن شاید ایسا کرنا مضمون نگار حضرات کو اچھا نہ لگتا لہٰذا انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں دستیاب مضامین کو شاملِ اشاعت کرنے کے ساتھ حبیب جالب کا جتنا بھی کلام ہمیں حاصل ہوسکا اُسے بھی اس میں شامل کرلیا گیا ہے تاکہ حبیب جالب میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اور مستقبل کے محققین کو زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیا جاسکے۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ ہمیں اس خصوصی شمارے سے متعلق اپنی قیمتی آرا سے مطلع کریں اور لکھیں کہ انہیں یہ شمارہ کیسا لگا؟

نند کشور وکرم

جے۔۶ کرشن نگر دہلی ۵۱ ۰۰ ۱۱

۱۲ر مارچ ۱۹۹۴ء

اعتراف
حبیب جالب کی زندگی میں مختلف رسائل و کتب میں شائع مضامین

احمد بشیر

میں نہیں مانتا

پاکستان میں عوامی بیداری کی جو لہر چلی اس کے نغمہ خوانوں میں حبیب جالب سب سے آگے ہیں اور اگر لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا تو اپنے فرض کو پہچانا ۔ حبیب جالب کے ساتھ ایک شام صرف حبیب جالب ہی کو خراج نہیں بلکہ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کی خدمت میں خراج ہے جو فن کو زندگی کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور عوامی زندگی کو اپنے تخلیقی عمل کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں ۔ حبیب جالب کی شعری مسیحائی کے ہم شروع سے قائل تھے مگر ان کا نعرہ جمہور ہم نے پہلی بار صدر ایوب کی انتخابی مہم کے درمیان سنا ۔ پھر انہوں نے لاٹھیاں کھائیں ۔ قید خانے دیکھے ان کا مجموعہ کلام بھی بحق سرکاری ضبط ہوا ، یہ الگ بات ہے کہ ان کی پوری کتاب لوگوں کو زبانی یاد ہے ۔ یہ کتاب دراصل حبیب جالب کی نہیں ان کی اپنی زندگی کی کتاب ہے ۔ اب اس پر نئے صفحوں کا اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے ۔ صدر ایوب کی انتخابی مہم کے دوران ان کے سفر و حرکت پر پابندیاں لگیں تو ان کی نظموں کے ٹیپ ریکارڈر لاکھوں کے اجتماعات نے بار بار سنے ۔ ادب و شعر سے جن فنکاروں نے عوام کا شعور بیدار کرنے کا کام لیا ہے ۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ایک محدود عرصے میں اتنی موثر اور ہمہ گیر کامیابی حاصل کی ہو ۔ حبیب جالب خالص عوامی شاعر ہیں اور اسی لئے اردو اور پنجابی میں ایک ساتھ لکھتے ہیں ۔ وہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہیں کیونکہ سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے پروگرام اور نظم و ضبط کی پابند ہوتی ہیں ۔ حبیب جالب کی اپنی سیاسی پارٹی کا نام عوام ہے اور وہ ہر اس پارٹی کے ساتھ ہیں جو عوام کے مسائل کو سمجھتی ہے اور اسے عوام کے حوالے سے دور کرنا چاہتی ہے مثلاً حبیب جالب صاحب کہتے ہیں کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ حد ملکیت پر پابندی لگانے کا جھگڑا حقائق سے گریز ہے ۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کے ایک عام فرد کا کم سے کم معیار زیست کیا ہو کوئی جمہوریت کوئی نظام حکومت پائیدار

نہیں ہو سکتا ۔ اقتصادی میدان میں یہی لا الہ کا مقصد ہے اور یہی پاکستان کا مقصد ہے ۔

حبیب جالب کے جلسے کی ابتداء رفیق احمد خاں بنگش کی مختصر تقریر سے ہوئی ۔ انہوں نے شاعرانہ انداز میں کہا کہ حبیب جالب کی شام اس وقت منائی جارہی ہے جب صبح کے آثار افق پر ہویدا ہیں مگر غنیمت ہے ۔ ان کے بعد افتخار جالب نے ان کے بارے میں تاثرات پیش کئے اور کہا کہ حبیب جالب کروڑوں پاکستانیوں کی قوت کی آواز ہیں ۔ وہ ایک علامت ہیں ۔ یہ آواز سماجی جبر و تشدد سے نجات اور ابھرتی ہوئی قوتوں کے حق میں نعرہ تحسین ہے ۔ انہوں نے عملی طور پر اردو کو نئی توقیر دی اور بتایا کہ اردو ہی پورے پاکستان کے عوام کی صدا بن سکتی ہے ۔ ایک زمانے میں لوگ ترقی پسند مصنفوں کی تعبیر فن میں کیڑے ڈالتے تھے مگر زندگی کے تجربے نے سب کو سمجھادیا ہے کہ خالی افراد کے داخلی واہمے اور ان کا اظہار ادیب کا منصب نہیں ہے ۔ جمعیت علمائے اسلام مزدور اور کسان تحریکیں اور بھٹو اور بھاشانی کی جند مساوات ابوذر غفاری ادیب کے منصب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں اور حبیب جالب جشن عوام میں مشعل بردار ہیں ۔ ان کی مشہور نظم پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ اس دور کی نمائندہ نظم ہے ۔

تقریروں کے بعد حبیب جالب نے کچھ پرانی اور ایک نئی نظم سنائی ۔ اسلام خطرے میں نہیں ۔ سب سے پہلے انہوں نے پاکستان کا مطلب کیا سنائی ۔ لاہور میں آخری بار انہوں نے یہ نظم کوہستان کے صحافیوں کے جلوس میں سنائی جو گزشتہ ماہ انجمن صحافیان کے زیر اہتمام نکالا گیا تھا ۔ ایک بند آپ بھی سن لیں

پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ
گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت مجھے تعلیم دلا
میں مسلماں ہوں واللہ
لا الہ الا اللہ

یہ نظم جب جلوس میں پڑھی گئی تو لوگوں کے دل دھڑکنے لگے اور میکلوڈ روڈ کے کے لوگ کھڑکیوں میں آکھڑے ہوئے ۔ اتنے میں صفدر صدیقی صاحب جو چند مزدور لے کر کوہستان کے عملے کی ہمدردی میں شریک جلوس ہوئے تھے ۔ بھاگے بھاگے آئے اور کہا کہ صاحب یہ نظم بند کردیجئے ۔ اس کا یہ مطلب ہماری سیاسی پالیسی کے خلاف ہے ۔ چنانچہ

حبیب جالب صاحب کی یہ نظم نہ صرف بند کرادی گئی بلکہ ان کو لاؤڈ اسپیکر والی گاڑی سے اتار دیا گیا مگر اس نظم کو گاڑی سے کون اتار سکتا ہے۔

شام کے جلسے میں یہ نظم اسی اشتیاق سے سنی گئی۔ جس اشتیاق سے یہ موچی دروازے میں سنی جاسکتی ہے کیونکہ ادیب اب اپنے حجرے سے نکل کر موچی دروازے میں جگہ بنارہا ہے تاکہ وہ عوام کے ساتھ مرے اور جئے۔ حبیب جالب نے اور نظمیں بھی سنائیں۔

لوگوں نے عوامی تحریک کو الجھاؤ میں ڈالنے کے لئے اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگانا شروع کردیا ہے۔ حالانکہ اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ اس کا دین ہے اور وہ خود اس کا محافظ ہے۔ خطرہ اگر ہے تو چند خاندانوں کے لامحدود منافعوں کو۔ یہ حبیب جالب کی تازہ نظم کا موضوع ہے۔ "اسلام خطرے میں نہیں۔"

(یہ کالم ۱۹۶۰ء میں روزنامہ امروز میں چھپا تھا جب جالب صاحب پہلی بار ایوب خان کے زمانے میں رہا ہوئے تھے)

احمد ندیم قاسمی
جالب کی انفرادیت

دوامی موضوعات کی دوامی شاعری کی اہمیت مسلّم ہے ۔ مگر بعض صورتوں میں ہنگامی اور لمحاتی شاعری بھی دوام حاصل کرنے کی توانائیوں کا مظاہرہ کرتی ہے اور اس طرح لمحے فن میں ڈھل کر صدیاں بن جاتے ہیں ۔ حبیب جالب نے شاعری کا آغاز دوامی موضوعات سے کیا اور کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنی انفرادیت یوں تسلیم کرا لی کہ اس شاعری کو سہل ممتنع کی ایک بلیغ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ سلاستِ اظہار بہت مشکل فن ہے ، خاص طور سے جب اظہار ایسے جذبات و تصوّرات کا ہو جن کو فن میں منتقل کرتے ہوئے بیشتر اردو شاعروں نے طویل تراکیب اور پے در پے اضافتوں اور عربی فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ کی بھرمار کر دی ہو ۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ سلاستِ اظہار اردو شاعری کی ایک قدیم روایت سے باقاعدہ بغاوت ہے اور جالب نے ابتدائی دور کی غزلوں میں اپنے آپ کو اس طرح کا ایک کامیاب باغی ثابت کیا ہے ۔

اس کے بعد جالب نے اپنے فن میں اظہار کی ایک اور صفت کو اتنی خوبی اور تسلسل سے برتا کہ وہ پاکستان کی گذشتہ بیس برس کی تاریخ میں آزادیِ اظہار اور جرأت کی ایک علامت بن گیا ۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آزادی و جرأت کے اظہار میں بھی وہ سلاستِ اظہار سے دست کش نہ ہوا ۔ بلکہ میری رائے کے مطابق اس دور میں جالب کی ملک گیر مقبولیت

میں اس کے موضوعات کی اہمیت اور ہمہ گیری کے علاوہ اس کی سلاست اظہار کا بھی بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ جو بھی کہتا ہے، کچھ اس طرح عام بول چال کے انداز میں کہتا ہے کہ اس کا کلام پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ میں براہِ راست اُتر کر اُس کی شخصیت میں رَچ بس جاتا ہے۔

حبیب جالب ترقی پسند ادب کی تحریک کی پیداوار ہے مگر گذشتہ بیس برس کے ادبی منظر میں اس کی شخصیت شاید واحد شخصیت ہے جس نے بجائے خود ایک تحریک کا منصب ادا کیا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک تو اَب تک رواں دواں ہے مگر اس کی تنظیم آج سے ربع صدی پہلے انتشار کا شکار ہو گئی تھی اور تنظیم کی غیر موجودگی میں کسی واحد شاعر کا ایک تحریک ساز بن کر نمایاں ہونا بہت ہی دشوار مرحلہ ہے۔ حبیب جالب نے یہ مرحلہ کمال پامردی سے طے کیا ہے اور اس لئے وہ معاصر اُردو شاعری میں حق گوئی اور بیباک گوئی کی ایک علامت بن گیا ہے ہر فرد اپنی اپنی معاشرتی مجبوریوں کا اسیر ہوتا ہے اور شعرا بھی معاشرے ہی کے افراد ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اس اسیری سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ حبیب جالب بھی آپ کی اور ہماری طرح اس معاشرے کا ایک رُکن ہے۔ مگر اُس کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اس طرح کی کسی مجبوری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ اس نے نہ تو علامت کا سہارا لے کر خود کو چلمن کے پیچھے چھپایا اور نہ استعارے کو پھیلا کر اپنے مافی الضمیر کو فنی پینتروں کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا۔ ہر بات براہِ راست کی اور قطعی طور پر غیر مبہم اور دو ٹوک الفاظ میں کی اور یہ سب کچھ اُس دَور میں کیا جب سچ بولنا اپنا سَر کاٹ کر ہتھیلی پر دھر لینے کے مترادف تھا۔

بے شک علامہ اقبال اور اُن کے بعد متعدد ترقی پسند شعراء، غزل کو عصری حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں قابلِ قدر کام کر چکے تھے اور غزل کو قدیم دَور کے معیّن موضوعات کے جس سے نکالنے کے لئے زمین ہموار کر چکے تھے مگر جب کوئی کاشت کرنے والا ہی نہ ہو تو ہموار زمینیں

بھی ویرانوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس دور میں صرف جالب ہی ایک شاعر ہے جس نے چھپ چھپا کر نہیں بلکہ دن کی روشنی میں اور ساری دنیا کے سامنے ان ممنوعہ زمینوں کا رخ کیا اور ان میں حق و صداقت اور حوصلہ و جرأت کی ایسی فصلیں کاشت کیں کہ خود اس کے حصے میں تو قید و بند کی صعوبتیں آئیں مگر اس نے آنے والی نسلوں کے لئے سچ بولنا آسان بنا دیا۔

اس کے سیاسی رجحانات سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ بعض شخصیات کی تنقید سے بھی اس کے ساتھ متفق ہوں مگر یہ طے ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا، حیرت انگیز حوصلے اور خلوص کے ساتھ کہا۔ یہ حوصلہ اسے صداقت کے اعتماد نے بھی دیا اور ملک کے ان عوام کی حمایت نے بھی جن کی محرومیاں اور جن کے بنیادی حقوق کی پامالی جالب کی شاعری کا موضوع بنی اور اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک LEGEND بن گیا۔ یہ شہرت اور مقبولیت اور عزت اس پر آسمان سے نہیں پھٹ پڑی، اس نے یہ سب کچھ بے شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے کہ اس کی عظیم جدوجہد ہی اس کا استحقاق ہے۔

انتظار حسین

آج کا نظیر اکبر آبادی

ہمارے یہاں شاعر دو ہی راستوں سے ادب کی اقلیم میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں ادبی رسالے کے راستے یا مشاعرے کے راستے۔ حبیب جالب تیسرے راستے سے آئے۔ قومی سیاست کے راستے سے۔

میں نے پوچھا کہ حضرت مروجہ دو راستوں میں کیا قباحت تھی۔ جواب دیا کہ جتھے بندیوں نے وہ دونوں رستے مجھ پر بند کر دیئے تھے۔

اصل میں حبیب جالب اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی نوع کا دوسرا واقعہ ہیں۔ ان سے پہلے ایک بڑا واقعہ نظیر اکبر آبادی کی صورت میں گزر چکا ہے۔ اس زمانے کے ثقہ شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے نظیر کو میلوں ٹھیلوں اور گلی کوچوں میں نظم سناتے دیکھا اور اسے مبتذل شاعری کہہ کر رد کر دیا تھا۔ حبیب جالب کی شاعری پر بھی آج کل کے ثقہ ادیبوں نے کم ناک بھنوں نہیں چڑھائی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ نظیر کی شاعری کو میلوں ٹھیلوں میں پر لگے تھے۔ حبیب جالب کی شاعری کو سیاسی مجلسوں میں پر لگے۔ ان کی شاعری کو پہلے قبول عام حاصل ہوا۔ پھر خواص نے چار و ناچار انہیں قبول کیا۔

یوں میں نے حبیب جالب سے کبھی نظیر اکبر آبادی کا نام نہیں سنا تھا۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ جس قسم کی شاعری آپ کر رہے ہیں اس کے سلسلہ میں کسی پچھلے استاد سے بھی فیض حاصل کیا اور میرا گمان یہ تھا کہ وہ مولانا ظفر علی خاں کا نام لیں گے۔ مگر انہوں نے مولانا ظفر علی خاں اور حسرت موہانی دونوں کا نام بعد میں لیا۔ پہلے تو چھوٹتے ہی نظیر اکبر آبادی کا نام لیا۔ بولے کہ میں نے نظیر کو بہت پڑھا ہے۔

ویسے یہ مت سمجھئے کہ روایتی شاعری کی فضا حبیب جالب نے نہیں دیکھی۔ یہ فضا بھی بہت دیکھی ہے اور وہاں سے اچھی خاصی تربیت حاصل کی ہے۔ مزاج تو لڑکپن ہی سے شاعرانہ تھا ساتویں جماعت میں استاد نے کہا کہ وقت سحر کو جملہ میں استعمال کرو۔

انھوں نے اسے شعر میں استعمال کر ڈالا ۔

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور ہم
وعدہ شکن کو دیکھتے وقت سحر گیا

بس اسی زمانے میں حبیب جالب نے ہوشیار پور کو چھوڑا اور دلی کی راہ لی ۔ چندرے جمنا کا پانی پیا ۔ پھر ۴۷ء آگیا ۔ اور حبیب جالب دلی سے کراچی میں 'کراچی میں چھپنے والے مشاعرے اپنے ساتھ لے کر پہنچے ۔ حبیب جالب نے اس شہر میں مشاعرے دیکھے ' استاد دیکھے استادوں کی جتھہ بندیاں دیکھیں ۔ تھوڑے دنوں راغب مراد آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشاعرے میں غزل حبیب جالب پڑھتے اور داد راغب مراد آبادی وصول کرتے ۔ کہتے ہیں کہ لکھوں میں اور داد دوسرا وصول کرے ۔ بس میں اس حصار کو توڑ کر باہر نکل آیا ۔

بس پھر تو حبیب جالب حصار توڑتے ہی چلے گئے ۔ غزل کے حصار کو توڑا اور نظم میں آگئے ' مشاعرے کے حصار کو توڑا اور سیاسی جلسہ کے اسٹیج پر پہنچ گئے ۔

راغب مراد آبادی سے محترمہ فاطمہ جناح کے جلسہ کے اسٹیج تک کی مسافت معمولی مسافت تو نہیں ہے ۔ میں نے پوچھا کہ عاشقانہ غزل کہتے کہتے اس راہ پر کیسے پڑ لئے ۔ بولے کہ تصور میں یہ بات تھی کہ پاکستان ہمارے خوابوں کی تعبیر بنے گا ۔ مگر خواب ایک ایک کرکے ٹوٹتے چلے گئے ۔ اور میرے یہاں رومانیت کم ہوتی چلی گئی دکھ پیدا ہوتا چلا گیا ۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی معرفت مزدوروں اور کسانوں سے رابطہ پیدا ہوا ۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ میں ۱۹۵۶ء میں نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو گیا ۔ بستی بستی پھرتا ' عام لوگوں کے مسائل کو سمجھتا اور شعر کہتا ۔

بس اسی عمل میں حبیب جالب کی شاعری نے عوامی رنگ پکڑا اور ایسا رنگ نکالا کہ ترقی پسند شاعری سے نظریاتی اعتبار ہم رشتہ ہونے کے باوجود اس سے بالکل الگ نظر آتی ہے ۔ ترقی پسند شاعر تو ایک گروہ کی صورت میں ہمارے سامنے آئے تھے ۔ حبیب جالب جب ہمارے سامنے آئے تو اکیلے تھے میں نے کہا جالب صاحب ۳۶ کے ترقی پسند شاعر کو جس طرح پوری کمپنی ملی تھی آپ کو کوئی کمپنی نہیں ملی ۔ کیوں ؟

بولے کہ میں سادہ دل ' یار لوگ مجھے اس رستے پر لگا گئے اور خود اور راستوں پر نکل گئے ۔ جس نظام کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے مجھے اکسایا تھا خود اس کے محافظوں کے

مشیر بن گئے ۔ میں حیران کہ ہم سفر مجھے کس کربلا میں چھوڑ گئے ۔ انہیں بہت پکارا ' واپس نہیں آئے ۔ مجھے اکیلے وہ کام کرنا پڑا جو ان سب کے ساتھ مل کر انجام دینا تھا ۔ اب وہ پس و پیش کر رہے ہیں کہ مجھے قبول کیسے کریں ۔ میری مجوزہ پچاسویں سالگرہ بھی اسی وجہ سے ان کے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے میرے بارے میں کچھ کہیں گے تو اپنے بارے میں بھی تو کچھ کہنا پڑے گا ۔

"جالب صاحب ! آج کل کس پارٹی سے آپ کا تعلق ہے ؟"

"کسی سے نہیں ۔ میرے ہم عصر پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ جالب ! پارٹی کو چھوڑو اور آزاد ہو جاؤ ۔ اب میں آزاد ہوگیا ہوں تو دیکھ رہا ہوں کہ میرے ہم عصر پابند ہو گئے ہیں"

نئی شاعری کے بارے میں پوچھا تو بولے کہ یہ نئے شاعر شاکی ہیں کہ ان کی شاعری پڑھی نہیں جاتی ۔ پڑھی کیسے جائے ' سمجھ ہی میں نہیں آتی ۔ لوگوں کی بات ہو تو لوگ اسے سمجھیں ۔ میں کہتا ہوں کہ عشق کی بھی بات کرو تو ایسے کرو کہ لوگوں کو وہ اپنی بات نظر آئے ۔

میں نے کہا کہ پھر عشق کی بات ہو جائے ۔ آخر آپ نے سیاسی شاعری ہی تو نہیں کی ہے عاشقانہ کلام بھی کہا ہے ۔ اس پر ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے کہ عشق بھی ' روپے پیسے والا ہو تب ہی کامیاب ہوتا ہے ۔ غربت میں کسی کو عشق کا عارضہ لاحق نہ ہو ۔ مجھے تیس بتیس صفحوں کے رقعے بھی موصول ہوئے ۔ کونے میں یہ لکھ کر واپس کر دیتا کہ شکریہ ! مگر اپنے والدین سے بھی تو ملاؤ کہ پھر ہم اکٹھے ہی ملیں ۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہم حدود ہی میں رہے ۔ احترام احترام ہی میں مارے گئے ۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرا ' کہا کہ یہ ایسی بات ہے کہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے ۔

انور سدید

انقلابی حقیقت کی ایک مثال ۔ جالب

حبیب جالب کے ہاں جذبہ جمہور اتنا نمایاں ہے کہ ان کے معاصرین کے ایک طبقے نے ان کی شاعری کو سیاست کا بلاواسطہ ردعمل کہہ کر اس کی قدروقیمت کم کرنے کی کوشش کی ہے ایک اور طبقے نے حبیب جالب کے احساس کی شدت کا اعتراف تو کیا لیکن اسے نعرے کی زرکار قبا میں یوں لپیٹا کہ معصومیت میں کہی ہوئی اس بات سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ حبیب جالب کی اساسی عطا ان کی شاعری ہے یا صرف نعرے .... چنانچہ حبیب جالب پر کام کرنے والوں کو جو مشکلات درپیش ہیں وہ درحقیقت حبیب جالب کے مخلص دوستوں کی ہی پیدا کردہ ہیں اور اگر کوئی شخص ذرا ہمت کر کے ان مشکلات کو سر کرنے اور حبیب جالب کی انقلابی آواز کے عقب سے ان کے دل کی واردات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو حبیب جالب کے متذکرہ دوست اس پر طعن و تشنیع کے ساتھ یوں جھپٹتے ہیں جیسے یہ اقدام خود ان کے خلاف ہو۔

حبیب جالب شاعری کے افق پر اس وقت نمایاں ہوئے جب ترقی پسند تحریک اپنی بساط سیاست لپیٹ رہی تھی اور اس کے باقیات الصالحات اپنی مبینہ خدمات اور قربانیوں کے ضخیم پشتارے اٹھائے اس جابر سلطان کو تلاش کر رہے تھے جو مناسب قیمت چکا کر ان کے قلم خرید لے۔

اس زمانے میں جس بحث نے سب سے زیادہ توجہ کھینچی وہ "ادب اور انقلاب" کی بحث تھی ۔ چنانچہ وہ لوگ جو ادب کے تخلیقی اور تعمیری پہلو کے حامی تھے ادب کو زندگی اور حسن کے ایک نئے توازن کی تلاش کا وسیلہ قرار دیتے اور ادب میں تخریب کا عنصر شامل کرنے والوں پر شدید نکتہ چینی کرتے ۔ اسی زمانے میں اس حقیقت کو بھی اہمیت حاصل ہوئی کہ تخریب برائے تخریب بڑا ادب پیدا نہیں کرتی اور اس پر نہ صرف ہر طبقہ خیال کے ادبا نے غور کرنا ضروری سمجھا بلکہ حد یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بعض ثقہ ادبا نے بھی

اس نکتہ کی تائید کی۔ چنانچہ اس تحریک کے ایک ممتاز نقاد ممتاز حسین نے "زنداں نامہ" اور "دست تہہ سنگ" کے غائر مطالعہ کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھا کہ

"کسی فنکار کے ساتھ اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو براہ راست یا بالواسطہ کسی نظریہ کے لئے قربان کر دیتے ...... شاعری محض نعرہ یا محض جذبہ یا محض الفاظ کی بازی گری نہیں۔"

افکار ۔ فیض نمبر ص ۳۲۷

اور اسی مضمون کے آخر میں انہوں نے لکھا کہ :

"فیض صاحب کو ابھی غزل کے گیسو سنوارنے کا اور موقع ملے گا اور ان کے اس دور کی غزلیں بھی غزل کے ایک نئے دور کی ترجمان ثابت ہوں گی۔"

فیض صاحب کو نئے دور میں غزل کے گیسو سنوارنے کا موقع ملا ہے یا نہیں فی الوقت یہ میرا موضوع نہیں ۔ البتہ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے رفیقان تحریک نے بیشتر نئے حالات سے مفاہمت کرلی اور غزل کو چھوڑ کر اپنے گیسو سنوارنا شروع کر دیئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی انقلابی آواز "خود تعریفی" کی گونج میں ایسی گم ہوئی کہ وہ خارجی جبر کا انقباض تک محسوس نہ کرسکے ۔ اور اپنے عہد کی شعوری اور غیر شعوری خواہشوں کا احترام اور تبدیلی حالات کا عمل ایک ایسے شاعر کو سونپ دیا جس نے انقلاب کے ایک مخصوص تصور کو تو اپنے ذہن میں جگہ دی تھی لیکن جماعتی ضرورتوں اور ذاتی سہولتوں کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا تھا ۔ یہ شاعر حبیب جالب تھا اور اس کی ابتدائی ادبی تربیت غزل کے گہوارے میں ہوئی تھی ۔ یہ وہ دور تھا جب حبیب جالب نے اک نزہت ماہتاب کو اپنی زیست بنا رکھا تھا اور اک نازش خورشید کے پائے زرنگار پر اپنی آنکھوں کی شبنم قربان کر دی تھی ۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ حبیب جالب کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ اپنے گرد و پیش کو نہ صرف حیرت سے تک رہا تھا بلکہ آہستہ آہستہ پراسرار طور اس کے خلاف اپنے دل میں رد عمل بھی مرتب کر رہا تھا۔

گلشن کی فضا دھواں دھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے

بکھری ہوئی پتیاں ہی دل کی ٹوٹی ہوئی شاخ آشیاں ہے

حبیب جالب کی یہ حیرت اس لئے بجا تھی کہ ان کے بیشتر معاصر جو عرصے سے عظمت انسان کا پرچم بلند کئے ہوئے تھے اب آنکھیں نیچے کئے حاکم وقت کے سامنے منمناتی ہوئی آواز میں مدح سرا تھے اور حاکم وقت کی صورت یہ تھی کہ وہ اپنے راج سنگھاسن کو مضبوط

کرنے کے لئے جبرواستبداد کے پھندوں کو سبز اور سرخ رنگ کی نظر افروز جھنڈیوں سے آراستہ کر رہا تھا۔ حبیب جالب نے اس گھٹی ہوئی فضا میں انقباض اور تنہائی کی کیفیت محسوس کی اور اپنا رشتہ غالب اور یگانہ جیسے لوگوں سے قائم کر لیا جو.... اپنے زمانے میں حبیب جالب کی طرح کے ہی ODD MAN OUT تھے۔

غالب و یگانہ سے لوگ بھی تھے جب تنہا
ہم سے ملے نہ ہوگی کیا منزل ادب تنہا
فکر انجمن کس کو، کیسی انجمن پیارے
اپنا اپنا غم سب کو سوچئے تو سب تنہا
سن رکھو زمانے کی کل زباں پہ ہوگی
ہم جو بات کرتے ہیں آج زیر لب تنہا

اس اجمال سے ایک بات تو واضح ہوتی ہے کہ حبیب جالب جب غزل میں شاعری کر رہے تھے۔ تب بھی وہ روایتی قسم کے مضامین کو گل و بلبل کے اشعار میں باندھنے سے گریزاں تھے۔
ان کی نظر خارج کی طرف تھی۔ جہاں خوں بستہ آنکھیں ظلم و جور کا نظارہ تو کرتی تھیں لیکن اس پر اشک خوں بہا نہیں سکتی تھیں۔ اس دور میں حبیب جالب نے خود اپنے آپ سے جنگ لڑی اور جب ادب کے بیشتر سربرآوردہ لوگ سربازار نیلام ہو رہے تھے تو حبیب جالب نے اپنی تنہائی کو راہنما بنایا اور اپنا سفر جاری رکھا۔

اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے، ہو گئے جو اب تنہا

دوسری بات یہ کہ غزل کے متذکرہ دور میں بھی حبیب جالب کا سیاسی شعور بیدار تھا اور ان کی متجسس روح انہیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ موجود سیاسی حقیقت کے مصنوعی خول کو توڑ کر کسی ایسی صحت مند تبدیلی کو روبہ عمل لائیں جس سے صادق اقدار کی راہ ہموار اور پاکستانی معاشرہ جسے ارباب سیاست کی سالخوردہ ذہنیت نے زنگ آلود کر دیا تھا ترقی کی طرف صحت مند قدم اٹھا سکے۔ ذہنی اضطراب کی اس منزل پر نقشہ ترقی پسند شعراء کی طرح حبیب جالب نے وطن کو محبوبہ بنا کر پیش نہیں کیا کہ ارباب نقد ان کے صادق جذبے سے جنسی الجھنوں کو سراغ لگانے کی سعی فرماتے بلکہ انہوں نے غزل کی بیشوی صورت سے

کنارہ کشی اختیار کر کے آتش فشانی اظہار کے لئے نظم کی ہیت کا انتخاب کیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حبیب جالب کے داخل کی جنگ نے اب واضح طور پر خارج اختیار کرلیا اور وہ تمام مشاہدے ، حقیقتیں اور تصویریں جنہیں وہ رمزو کنایہ کے انداز میں غزل کی زیرلب کیفیت میں ظاہر کرتے تھے اب بلند بانگ انداز میں ان کی زبان پر آگئیں ۔ چنانچہ ان کے ہاں خطابت پیدا ہوئی ۔ آہنگ تبدیل ہوگیا ۔ نغمہ ہائے گل نے آوازہ انقلاب کی صورت اختیار کرلی ۔ اور وہ قاری جو پہلے نظر سے پوشیدہ تھا اب حبیب جالب کے روبرو بیٹھ کر اس کے جذبات و احساسات پر مہر تصدیق ثبت کرنے لگا ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رابطۂ عوام کی اس مہم میں حبیب جالب نے اپنے دھیمے لہجے ، زبان کی لطافت اور گل آفرینی الفاظ کا بلیدان دیا اور ان کی شاعری کا مجموعی لہجہ خاصا متاثر ہوا ۔ تاہم یہ کہنا درست نہیں کہ حبیب جالب اپنی اس فنی قربانی سے واقف نہیں تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی شعور کی زیر سطح لہر سے ابھر کر اظہار کی بالائی سطح پر آنے کی کوشش حبیب جالب کی شعوری کوشش تھی ۔ اور یہ اس بے اطمینانی کا بدیہی نتیجہ تھا جو گردوپیش کی قنوطیت نے عرصے سے پیدا کر رکھی تھی اور جس کے خلاف کوئی موثر آواز اٹھ نہیں رہی تھی ۔ اس دور میں حبیب جالب نے اپنے داخل سے خارج کی طرف شعوری مراجعت کی اور اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا کہ ۔

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

میں غزل کہوں تو کیسے کہ جدا ہیں میری راہیں
مرے اردگرد آنسو ، مرے آس پاس آہیں

شہر غزل سے آہوں اور آنسوؤں کے دیار تک حبیب جالب کے راستے میں جو ان گنت مشکل مقامات آئے ہیں یہاں ان کا تذکرہ اس لئے مقصود نہیں کہ حبیب جالب نے نہ ان کو اہمیت دی ہے اور نہ ان کا صلہ مانگا ہے ۔ تاہم اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ انہوں نے معاشرے کو جارحانہ انداز میں ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے خنجر زنی ، شمشیر آزمائی ، خون چکانی اور آتش زنی پر آمادہ نہیں کیا ۔ ان کے ہاں ترقی پسندوں جیسا کھوکھلا نعرہ انقلاب بھی نہیں ابھرا ۔ وجہ یہ کہ حبیب جالب نہ صرف شاعر کے انقلابی کردار کو قبول کرتے ہیں بلکہ

اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ شاعر معاشرے کی تعمیر، تشکیل اور تخلیق کا ذمہ دار بھی ہے۔ بلاشبہ ایک شاعر کی حیثیت میں اس کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ زندگی اور حسن میں نیا توازن پیدا کرے تاہم ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت میں وہ اس توازن کا امین بھی ہے۔ چنانچہ حبیب جالب کی ایک منفرد عطا یہ ہے کہ انہوں نے موخر الذکر فریضہ سر انجام دینے کے لئے جبری خاموشی کی فضائے بسیط میں احتجاج کی پہلی پر زور آواز بلند کی اور عوام کو حکمراں طبقے کے خلاف صف آراء کرنے کے بجائے اس طبقے کے جبر کا وار خود اپنی ذات پر قبول کرلیا۔ ایک ترقی پسند انقلابی اور حبیب جالب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ترقی پسند انقلابی پس منظر میں رہ کر عوام کو گولیوں کی باڑ کے سامنے سینہ سپر ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ جب کہ حبیب جالب نے اپنی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائی اور دہر کے اندھیروں میں روشنی پھیلانے کے لئے وقت کے خداؤں کے خلاف انکار کی اولین آواز بلند کردی۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو
صبح بے نور کو
میں نہیں جانتا ...... میں نہیں جانتا

آج حکومت کے در پہ
ہر شاہیں کا سر خم ہے
درس خودی دینے والوں کو
بھول گئی اقبال کی یاد
صدر ایوب زندہ باد

حبیب جالب کی متذکرہ بالا قسم کی نظموں کو ان کے سیاسی ردعمل کی فوری پیداوار کہا جاتا ہے۔ یہ نظمیں بلاشبہ دیکھی ہوئی حقیقیت کو بے باکانہ انداز میں بیان کرتی ہیں اور ایک مخصوص پس منظر کے بغیر معرض تخلیق میں نہیں آسکتی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ ایک مخصوص سماجی عمل کا نتیجہ ہیں تاہم حبیب جالب کی اس فنکارانہ خوبی سے انکار

ممکن نہیں کہ انہوں نے معروضی انداز اختیار کرنے کے باوجود شاعری کی بالواسطہ زبان ترک نہیں کی ۔ اور معاشرے کی گھناؤنی تصویر پیش کر کے انسان اور انسانی معنویت کو مجروح نہیں کیا ۔ بلکہ نظم کی طرف مراجعت کر کے انہوں نے شاعری کی زبان میں ہی اس بڑے خطرے کی طرف متوجہ کیا جو معاشرے کو دیمک کی طرف چاٹ گیا تھا اور جس کے تدارک کے لئے تحرک ضروری تھا ۔ اسی مقصد کے لئے حبیب جالب نے عوامی لہجہ اختیار کیا ۔ شعر کے باطن سے نغمگی کو ابھارا ' رواں دواں بحروں کو ٹکڑوں میں بانٹا ' ردیف قافیہ کی آہنگ سے سرور نغمہ بیدار کیا اور حقیقت کے جراحت کو موثر بنانے کے لئے طنز کے اسالیب کو اس فنکارانہ خوبی سے استعمال کیا کہ اس سے عوامی شعور نہ صرف متاثر ہوا بلکہ تبدیلی کو روبہ عمل لانے کے لئے تیار بھی ہو گیا ۔ یہ اہم فریضہ مصلح اور ترقی پسند دونوں ادا کر سکتے تھے لیکن ان دونوں نے مصلحت وقت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور لبوں پر خاموش اختیار طاری کر لی ۔ لیکن حبیب جالب جنہیں سقراط کا انجام اچھی طرح معلوم تھا اس صورت میں حالات کے ساتھ مفاہمت نہ کر سکے ۔ انہوں نے اپنی صریری غزل کا ریشمی ملبوس چاک کیا اور میدان عمل میں آکر اس فرض کو تیشہ عمل سے یوں ادا کیا کہ ان کی شاعری انقلابی حقیقت سے ہم آہنگ ہو گئی ۔ حبیب جالب کی اس خدمت کو کون نظر انداز کر سکتا ہے ۔ ؟

توقیر چغتائی

اختلاف کا شاعر

عوامی شاعر حبیب جالب ہندوستان کے دورے پر گئے تو بہت سارے ہندوستانی اخبارات اور رسائل نے ان کے انٹرویوز چھاپے اور عوام نے ان کا اور ان کے کلام کا والہانہ استقبال کیا۔ زیر نظر مضمون ہندوستان کے مشہور ترقی پسند ادبی پرچے " آرسی" کے شکریئے سے چھاپ رہے ہیں " آر سی " پچھلے تینتیس سال سے چھپ رہا ہے۔ اور پنجابی ادبی رسالوں میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

پاکستانی شاعر حبیب جالب کچلے ہوئے لوگوں معصوموں اور محروموں کی آواز ہے۔ اس نے اپنے دیس کی ہر سرکار کے خلاف اپنے جذبات اور لوگوں کے حق کے لئے نعرہ لگایا وہ تقریباً ۴۴ سال بعد اپنی جنم بھومی ہوشیار پور آئے۔ حبیب جالب کہتے ہیں۔

" مجھے کئی بار احساس ہوا کہ جیسے میں کسی پاگل کی طرح اکیلا ہی اپنے راستے پر گامزن ہوں۔ جب کے دوسرے تمام سوچ سمجھ رکھنے والے لوگ کسی اور کے گھر میں بول رہے ہوں۔"

حبیب جالب کا انسانی دکھ اس شاعر کا دکھ ہے جس کو کوئی خرید نہیں سکتا، کوئی لالچ ڈگمگا نہیں سکتا، کوئی ڈر اپنے راستے سے بھٹکا نہیں سکتا۔ وہ اپنے شعروں میں جس دکھ کو بیان کرتا ہے وہ عام دکھی لوگوں کی زبان بن جاتا ہے۔ شاید اس وجہ سے اس نے جنرل ایوب سے جنرل ضیاء الحق تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ مگر وہ تو پاکستانی عوام کا ضمیر ہے جس کو کوئی بھی طاقت نہیں دبا سکی

پچھلے دنوں دلی کے دورے کے دوران جالب نے بتایا کہ اپنے لوگوں سے غداری اس کے ضمیر میں نہیں ہے۔ انہوں نے کہا۔

"ہر حکومت نے مجھ سے کہا کہ اپنا ضمیر بیچ دے اور کمینوں میں شامل ہوجا، مگر میں نہیں مانا۔"

اس دوران حبیب جالب نے بہت سارے شعر سنائے جو انقلاب کی لوٹ کھسوٹ کی اور عوام کی طاقت کی بات کرتے تھے ۔

حبیب جالب میں کوئی بناوٹ نہیں ۔ وہ بغیر کسی ہیر پھیر کے اپنی بات کہتا ہے ' وہ دلیر ہے ' سورما ہے ' اس بارے میں کوئی شک نہیں ۔ جالب کے بقول آج کل کا ریاستی نظام قابل نفرت اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے ۔ اور یہ چند لوگوں کے جینے کے لئے بنا ہوا ہے ۔ وہ حق کی آواز بن کر بولتا ہے ۔

جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

حبیب جالب کو اگر ایک طرف سے طاقت کے دلالوں کے وار سہنے پڑ رہے ہیں تو دوسری طرف نقادوں کے ' مگر وہ بے دھڑک ہو کر قاتل اور لٹیروں پر ہتھوڑے چلاتا ہے وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا اور سمجھوتہ کرنے والوں اور نازک مزاج شاعروں سے کہتا ہے کہ وہ سماج میں تبدیلی کرنے کے بجائے اپنی قلموں کو شلواروں میں آزاد بند ڈالنے کے لئے استعمال کریں ۔

اس کا پاسپورٹ ضبط ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنی جنم بھومی ہوشیار پور کو دیکھنے کے لئے آ نہیں سکا تھا ۔ آج جمہوریت کی بحالی کے صدقے وہ ۳۴ سال کے بعد ہند یاترا پر آیا ہے ۔ وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ یہاں بہت کچھ بدلا ہے ۔ دلی بہت بڑی نظر آتی ہے ۔ سڑکیں اچھی ہیں ۔ " اجمیری گیٹ " جہاں میں نے تعلیم حاصل کی ہے پہچانا ہی نہیں جاتا ۔ اس نے عام تبدیلیوں کی طرف دھیان دیتے ہوئے کہا ۔

"اس تبدیلی کا مطلب بے شمار عمارتوں کا تعمیر ہونا ہے یا کہ جھونپڑیوں اور کھولیوں کو بھی پکا کیا جارہا ہے؟"

زاہدہ حنا

یہ عشق نہیں آساں

عشق ابتداء ہے ' عشق انتہا ہے - کوئی انسان اس کی قلمرو سے باہر نہیں - کسی کو اس کی حکمرانی سے مفر نہیں - انسان کا اور عشق کا ساتھ پرانا ہے ' یہ دونوں جنگوں اور غاروں میں پہلو بہ پہلو رہے اور جب ستاروں پہ بستیاں بسیں گی وہاں بھی ' انسان عشق کی رسائی سے باہر نہ ہوگا -

عشق کے باب میں انسانوں کے اپنے دائرے اور اپنے زاویے ہیں - اپنی گلیاں ' بستیاں اور محلے ہیں ' اپنی تانیں اور اپنی اڑانیں ہیں - کچھ مہ جبینوں اور نازنینوں کے عشق میں ہی زندگی بسر کرجاتے ہیں - انہیں چشم و ابرو اور لب و گیسو کے معاملات سے ہی فراغت میسر نہیں آتی کہ نگاہ کسی اور طرف بھی ڈالیں - اور کچھ دیوانے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دل میں ساری خدائی کی سمائی ہوتی ہے - جنہیں انسانوں سے عشق کا آزار اور زندگی سے پیار ہوجاتا ہے - اس عشق کے موسم کو زوال نہیں آتا اور آئے بھی کیسے کہ اس میں ہجر در ہجر کے معاملات ہیں اور جدائی در جدائی کے مرحلے ہیں - اس اسیری سے رہائی نہیں ملتی ' اس کی کھٹک تا عمر چین سے نہیں رہنے دیتی اور اس کی بے قراری ' اپنوں سے بیگانہ کردیتی ہے -

اسی عشق کے بارے میں کہا گیا ہے -

یہ عشق نہیں آساں ' بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جالب کی ماں نے اسے جنم دیتے ہوئے بھلا کب یہ خیال کیا ہوگا کہ اس کا بیٹا محلے اور بستی کی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو ' سو ہو ' عشق بشر میں یوں گرے گا کہ پھر پایا نہ جائے گا - درد سے تڑپتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں ہوا ہوگا کہ جس کا نام وہ ' حبیب '

رکھے گی ۔ وہ اپنے نام کی تصویر بن جائے گا ۔ اسے بے نو اور درماندہ انسانوں کی دوستی اور رفاقت یوں راس آئے گی کہ پھر وہ ان ہی کا یار بیلی ' سنگی ساتھی رہے گا ۔ آخری سانس تک کرب تخلیق سے تڑپے گا اور اس کا سینہ اپنے لوگوں کے غم میں تڑپے گا ۔ لوگ اسے دیوانہ کہیں گے اور وہ دیوانہ کہنے والوں کے بارے میں لکھے گا ۔

جسے ملیئے ' ہمیں اس شہر میں دیوانہ کہتا ہے
نہ جانے کیا خرابی ہے مری جاں ' عشق انساں میں

احباب جالب نے آج اس رمز شناس اور درد آشنا کی محفل آراستہ کی ہے جس کی آنکھوں میں عشق انساں نے ' عشق بشر نے کیسے کیسے خوابوں کے چراغ رکھ دیئے ۔ محرومی و محکومی سے آزادی ' جبر و ظلم سے رہائی اور ناانصافی و نابرابری سے رستگاری کے خواب اور وہ ان خوابوں کے فراق میں قرۃ العین طاہرہ کے شعر کی تصویر بن گیا ۔

ی زود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم ' چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

اپنے لوگوں کے لئے اچھے دنوں کے خوابوں کے فراق میں ' اپنی دو آنکھوں سے خون کی دھارائیں بہانے والے جالب کے ساتھ اسی شہر میں ہونے والا وہ جلسہ بھی مجھے یاد ہے ۔ جب خیالوں اور خوابوں پر پہرے تھے ۔ اس وقت بھی اس کا نام بغاوت کی علامت تھا اور اس کے کلام کی اشاعت پر تعزیریں تھیں ۔ تب بھی اس کے چاہنے والے شہر کی چاروں سمتوں سے اسی طور پر اُمڈے تھے اور انہوں نے اسی دیوانگی سے ' ان سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا تھا ۔

اس دن کی اور آج کی یہ وارفتگی یہ وابستگی جالب کے قالب سے نہیں ' اس پیمان وفا سے ہے جسے جالب نے اپنے لوگوں سے استوار کیا تو اسے نباہنے کے لئے ہر مرحلے سے سرخرو اور سرفراز گزر گیا ۔ یہ عشق بشر تھا ۔ مجبوروں اور مظلوموں سے پیمان وفا تھا ۔ جس نے جالب سے کہلوایا ۔

ہماری قید سے لمبی نہیں ہے ظلم کی عمر

یا پھر یہ کہ

شاہوں سے جو کچھ ربط نہ قائم ہوا اپنا
عادت کا بھی کچھ جبر تھا ' کچھ اپنی زباں تھی
صیاد نے یونہی تو قفس میں نہیں ڈالا
مشہور گلستاں میں بہت میری فغاں تھی!

جالب ان خوش نصیبوں میں سے ہے جو خود بھی پابند سلاسل رہے اور جن کی تحریروں پر بھی قدغن رہی ' اس زمانے کے آمروں کو شاید اس کا علم نہ تھا کہ صدیوں پہلے جتائل کے بندی خانے میں کتابیں بھی پابہ زنجیر کی جاتی تھیں ۔ انہیں معلوم ہوتا تو پیروی میں وہ بھی اس کی کتابوں کو کوٹ لکھپت جیل میں یا شاہی قلعہ کے تہہ خانوں میں زنجیروں سے جکڑ کر رکھتے اور خوش ہوتے کہ وہ صرف جالب کو ہی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں ' انہوں نے اس کے لکھے ہوئے لفظوں کو بھی آہنی زنجیروں کا اسیر کیا ہے خوشبو کو بیڑیاں پہنائی ہیں ' روشنی کو ہتھکڑیاں ڈالی ہیں اور زندگی کے گلے میں طوق غلامی آویزاں کیا ہے ۔

سچے لفظ آمروں اور غاصبوں کی راتوں کی نیندیں اڑا دیتے ہیں ۔ ان کا چین چھین لیتے ہیں ۔ سکون غارت کردیتے ہیں ۔ سچے لفظوں کی سیج پر خیال کی رفعتیں آرام کرتی ہیں لیکن یہی سیج ' غاصبوں کے لئے کانٹوں کا بستر ہوتی ہے ۔

سچے لفظ شاعروں ' ادیبوں ' دانشوروں ' فن کاروں اور سیاست دانوں کے لبوں کی منڈیر سے اڑتے ہیں تو مظلوموں کے دلوں کی چھتریوں پر اترتے ہیں ' بندی خانوں کی سلاخوں پر سر رکھ کر کٹکتے ہیں ۔ ان کی روشنی زندانیوں کے دلوں کو اجلاتی ہے اور سرا فکندہ انسانوں کے دلوں میں بغاوت کا شعلہ بن جاتی ہے ۔

جالب نے ہر عہد میں روشن حرف لکھے ہیں ' سچے بول بولے ہیں ' اسی لئے اس نے اپنے لوگوں سے جو پیمان وفا باندھا ' اس میں ہمیشہ سچا رہا ۔ اس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے ' اس نے جھوٹے لفظ نہیں لکھے ' کھوٹے گیت نہیں گائے ۔ وہ ان اہل صدق و صفا میں سے ہے ۔ جنہوں نے مشرقی پاکستان کے بے گناہ شہریوں پر وحشیانہ فوج کشی کے خلاف آواز بلند کی ۔

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو

گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

وہ ہر آمر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا اور ہر جابر کو اس کی طرف سے دھڑکا رہا۔ وہ اس دھرتی کے ان لکھنے والوں میں سے ہے جن کا رشتہ ہمیشہ اپنے لوگوں کے دکھوں اور سکھوں سے استوار رہا۔ وہ ان سورماؤں میں سے ہے جو ان زمانوں میں بھی شیر کی طرح ہونکتے رہے جب یہاں ہر طرف بھیڑیوں اور لکڑ بگھوں کا، گیدڑوں اور گھڑیالوں کا راج تھا جب بہت سے لکھنے والے اپنے خاموش رہنے کے حق میں خوبصورت دلیلیں لاتے تھے اور کسی سولی کے سائے میں بچھائے جانے والے دسترخوان پر بیٹھ کر تر نوالے کھاتے تھے اور اپنی شرکت کی سو سو تاویلیں بناتے تھے۔ جالب کے دم قدم سے لکھت کی اور لکھنے والوں کی توقیر ہے۔ اس کے قلم نے جانے کتنے لکھنے والوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے اور تب ہی تو جالب فخر سے یہ کہہ سکا ہے۔

مجھ سے خفیف ہیں میرے ہم عصر اس لئے
میں داستان عہد ستم کھل کے کہہ گیا

جالب ان تخلیق کاروں میں سے ہے جنہوں نے لفظوں کے چراغ اپنے لہو سے روشن کئے ہیں اور پھر ان چراغوں کو لیلائے وطن کے چاہنے والوں نے اپنا لہو دیا ہے۔ وہ چراغ جن میں لہو جلتا ہو وہ بجھتے نہیں۔

لہو کسی امیر المومنین کی مملکت میں کنوؤں سے نکلنے والا تیل تو نہیں کہ خشک ہوجائے۔ یہ لہو ہمارے نوجوانوں کی رگوں میں پھیلتا ہے۔ ہماری عورتوں اور ہمارے مردوں کے بدن میں دھڑکتا ہے۔ ہمارے بچوں کی نسوں میں ہمکتا ہے۔ جب تک ہماری دھرتی میں آزادی کا ایک بھی متوالا زندہ ہے اس وقت تک یہ چراغ جلتے رہیں گے اور رات کو دن سے بدلتے رہیں گے۔

رستہ کہاں سورج کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر بند!

آج ہم جس زمانے میں جالب کو لفظوں کا خراج ادا کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں وہ جزوی جمہوریت کا زمانہ ہے یہ زمانہ کسی کی عطا نہیں کسی حادثے کا نتیجہ نہیں، یہاں تک پہنچنے کے لئے شاعروں اور دانش وروں نے جیلیں کاٹی ہیں۔ نوجوان اور سیاست دان پھانسی چڑھے ہیں۔ اس زمین سے عشق کرنے والے جلاوطن ہوئے ہیں۔

اس زمانے کو پانے کے لئے اس علاقے کے ان گنت مردوں اور عورتوں ' جوانوں اور بچوں نے اپنی خوشیاں اور اپنی زندگیاں وان کی ہیں اس کے شہروں اور دیہاتوں میں گنج شہیداں آباد ہوئے ہیں ۔ اس کے زندانوں کی دیواروں میں نہ جانے کتنی چیخیں اور کتنی کراہیں جذب ہوئی ہیں اور اس کی عقوبت گاہوں کے نزدیک گوشوں میں نہ جانے کتنے خوش خیال اور خوش جمال نوجوان اپنی تڑتی ہوئی ہڈیوں اور اپنے جلتے ہوئے زخموں کو سمیٹے ' بے نام و نشان قبروں میں سوتے ہیں ۔

جمہوریت کی وہ ننھی سی کونپل جو آج بھی طوفانوں کی زد میں ہے اسے جالب اور اس جیسے دوسرے لکھنے والوں نے اپنی بے باکی اور حق گوئی سے پرورش کیا ہے ۔ جس طلوع سحر کے دھندلے سے آثار آج ہمیں نظر آرہے ہیں اسے آواز دینے کے لئے جالب کا سینہ خرچ ہوا ہے ' اس کے لب سوکھے ہیں ' اس کی توانائیاں لٹی ہیں ' اس کے پیاروں کی خوشیاں چھنی ہیں ۔

اپنے شاعر سرکشیدہ کے لئے ہم سب مل کر یہی خواہش کرتے ہیں کہ وہ شاد کام اور شاد خواب رہے ۔ اس کی انگلیاں وقت کی نباضی کریں اور اس کا دل عشق بشر کے سمندر کی غواصی کرے ۔ اس کے قدر شناسوں کی تعداد بڑھتی رہے ۔ اس پر باران سخن ہوتی رہے ۔ اس خستہ بدن اور نجستہ ذہن انسان نے اپنی تمام زندگی منصور کی شریعت پر بسر کی ہے اور ہمیں اس میں شک نہیں کہ اگر پھر کوئی بری گھڑی آئی تو جالب اسی شریعت پر چلے گا ۔

میر نے آج سے صدیوں پہلے اسی قبیلے کے لوگوں کے لئے کہا تھا ۔

موسم آیا تو نخل دار پہ میر
سر منصور ہی کا بار آیا !

زہرہ نگاہ

روداد وفاداریہ

سچ پوچھئے تو جالب کی محفل صدارت کے تکلف سے آزاد ہونا چاہئے' کیونکہ وہ خود اس طرح کی درجہ بندیوں کے قائل نہیں ہیں بلکہ مساوات پر یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی محفل میں ہر شخص اپنی جگہ میر محفل ہے۔ پھر بھی میں آپ سب کی ممنون ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے یہ عزت بخشی خاص طور سے جالب کی ------ ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے سہی۔ انہوں نے کسی کی صدارت مانی تو --- اردو کے نامور نقادوں کو جالب کو دیکھ کر کبھی سورداس کا خیال آتا ہے تو کبھی اختر شیرانی کا' نظیر اکبر آبادی کی یاد تو بہت سوں کو آتی ہے --- اسے میری کمزوری سمجھئے یا کم علمی کہ مجھے جالب کو دیکھ کر شاعروں میں سے کوئی یاد نہیں آتا ہاں اگر یاد آتے ہیں تو بڑے نامی گرامی پہلوان ------ مجھے اکثر اس آدمی کا خیال بھی آتا ہے جسکا تماشہ آپ سب نے "ٹیلی ویژن" پر دیکھا ہوگا۔ وہ آدمی سڑک پر لیٹ جاتا ہے اور ایک بھاری ٹرک اسکے سینے پر سے گزر جاتا ہے پھر وہ شخص نہایت اطمینان سے مٹی جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اگر جالب کو دیکھ کر مجھے پہلوانوں کا خیال آتا ہے تو ایسی کوئی بے جا بات نہیں ہمارے یہاں اردو شاعروں میں ناسخ صاحب بھی گزرے ہیں جو باقاعدہ پہلوان تھے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ وہ تو اپنے ایک ہم عصر آتش کے چند مطلعوں ہی سے چت ہوگئے تھے۔ جالب کا مقابلہ نہ اپنے ہم عصر شاعروں سے ہے نہ مشاعروں سے ان کی زور آزمائی اپنی ہم عصر حکومتوں سے ہے۔ جن کے جبر و قہر کا ٹرک ہر دفعہ جالب کے سینے پر سے گزر جاتا ہے اور وہ ہر بار مٹی جھاڑ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ ابھی تک ان کا نام کسی ریکارڈ میں نہیں لکھا گیا' اور نہ ہی وہ کسی اشتہاری ادارے سے وابستہ ہیں ------ آخر یہ حوصلہ یہ ہمت یہ طاقت انہیں ملی

کہاں سے ۔ جو آئے دن نہایت مستعدی سے جیل چلے جاتے ہیں ' پھر واپس آتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں جبکہ اس کوچے میں جانے کے بعد بڑے بڑے معافیوں اور سفارشوں کی پناہ تلاش کرنے لگتے ہیں ۔ اس سوال کے جواب کے سلسلے میں اور اس ہمت کی اساس تک پہنچنے کے لئے میں نے تمام تفصیلات مہیا کیں ـــــ آخر یہ کس چکی کا پسا کھاتے ہیں ـــــ اور کیا کھاتے ہیں کس اکھاڑے میں زور آزمائی کرتے ہیں ۔ مگدر کانسی کے ہلاتے ہیں یا چاندی کے معلوم ہوا غذا تو وہی ہے جو عام طور سے سی کلاس کے قیدیوں کو ملتی ہے اکھاڑہ بھی جیل کی کوٹھری ہی ہے ۔ مگر روئی کی جگہ لوہے کی ہتھکڑی پہن لیتے ہیں جسے ہلا تو نہیں سکتے ' مگر ہاتھ اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس پر نظم لکھ لیتے ہیں ۔ ان تمام تفصیلات کے جاننے کے بعد بھی اس سوال کا جواب نہ ملا تو پھر یہ طاقت آئی کہاں سے ۔

خواتین و حضرات ! جالب کی ہمت کی اصل ڈھونڈنے میں مجھے دقت نہیں ہوتی ۔ ان کی ہمت اور حوصلے کی اساس تو دراصل آپ لوگ ہیں ۔ وہ سب لوگ جو جالب کو چاہتے ہیں جنکی تعداد سینکڑوں سے گزر کر اب لاکھوں میں پہنچ گئی ہے ۔ جالب کے کمزور جسم میں ان سب کی قوت سا گئی ہے جالب کی تھکی ' نڈھال باتوں میں ان سب کا دم خم ہے ان کی جلتی بجھتی آنکھوں میں لاکھوں کے خواب ہیں ۔ دلاویز اور معصوم خواب ـــــ جنہیں ان سب نے جالب کو سونپ دیا ہے جبھی تو جالب ڈرتے نہیں جھکتے نہیں ۔ جھکتے نہیں رکتے نہیں ۔

جالب نے ایک زمانے میں بہت خوبصورت شاعری کی ہے ۔ نک سک سے درست ' دلہن کی طرح آراستہ ' فنی خوبیوں سے مرصع ' دلوں میں اتر جانے والی ـــــ شاعری کی یہ گلپوش راہ جالب پر بہت مہربان تھی ۔ مگر جالب نے دوسرے لبھانے والوں راستوں کی طرح اس راہ سے بھی اپنا رخ موڑ لیا ۔ جان بوجھ کر اپنے طرز فکر کو ایک ایسا لہجہ دیا جو سب کا تھا ۔ جسے سب نے اپنے دل کی آواز سمجھا اور جسے سمجھنے میں لاکھوں لوگوں کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑی اور انکی ہر نظم مشاعرے کے اختتام پر ترانے کی شکل اختیار کرتی گئی ۔ کیسی اچھی بات ہے کہ اتنی ہر دلعزیزی کے باوجود جالب برتری کے کسی عذاب میں مبتلا نہیں ہیں ـــــ نہ اس الجھن کا شکار ہیں کہ وہ بہت بڑے بڑے مشاعروں کے پرخچے اڑا سکتے ہیں اور نہ ہی وہ زعم کی اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ جو درجہ بلند ان کو مل گیا اور کسی کو نہیں ملے گا ۔ اللہ نے انہیں ایک بڑی نعمت بخش دی ہے اور وہ ہے ان کا غنی دل ۔ جسکی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک بھولپن ہے ایک سادگی ہے ۔ ایک فقیرانہ دلکشی ہے ایک درویشانہ ادا ہے جو ان کو ہر کٹھن راستے پر سبک رکھتی ہے ۔ شاید یہی سبب

ہے کہ درد اسیری کا کوئی تمغہ ان کے سینے پر سجا نظر نہیں آتا۔ جیل کی بات کیجئے تو یوں شرمانے لگتے ہیں کہ نجانے کس علت میں جیل گئے تھے ـــــ میں جالب کے دکھوں کی داستان آپ کو نہیں سناؤں گی، اس لئے کہ جالب کو اچھا نہیں لگے گا۔ انہوں نے ظلم کی حکایت نہیں بنائی بلکہ اسے حقارت سے دیکھا ہے جس چیز کو حقارت سے دیکھا جائے اس کا تذکرہ بھی نہیں ہونا چاہئے ـــ

علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر جالب نے کہا تھا۔ علامہ مرحوم میری ڈیوٹی لگا گئے تھے کہ " اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو " میں اس ڈیوٹی کو بھگتانے کے سلسلے میں پندرہ بار جیل جا چکا ہوں۔

علامہ مرحوم تو ہم سب کی ڈیوٹیاں اپنے مختلف مصرعوں میں لگا گئے تھے۔ ہم نے پہلے تو ان مصرعوں کو سکہ رائج الوقت کی طرح خوب چلایا۔ پھر سڑکوں پر لگے ہوئے اشتہاروں ور دفاتر میں ٹنگی ہوئی جنتریوں کے سپرد کر دیا اس پر بھی سیری نہ ہوئی تو سارے مصرع قوالوں کی نذر کر دیئے مجھے حیرت ہے جالب کو ان ترکیبوں میں سے کوئی ترکیب نہیں سوجھی۔ ویسے جالب نے حقیقتاً علامہ کے جس مصرع کی ڈیوٹی کی ہے وہ غریبوں کو جگانے والا مصرعہ نہیں ہے۔ (ایک تو غریب سوتا ہی نہیں ہے تو جاگے گا ہی کیا۔)

دراصل وہ مصرعہ ہے " آئین جوانمردی حق گوئی و بیباکی " ۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں آئین تو ہے نہیں چاہے اسکا تعلق جوانمردی میں کیوں نہ ہو ؟

جوانمردی کے جوہر البتہ دکھائے جاتے ہیں مگر اسکے لئے بھی فریق ثانی کا ہموطن اور نہتا ہونا ضروری ہے۔ اس قسم کے جوہر آج سے دو ڈھائی سال قبل لاہور میں دکھائے گئے تھے جب پاکستانی خواتین نے اپنے حقوق کی پامالی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا تھا۔ اس جلوس میں مائیں، بہنیں، بیٹیاں سبھی شامل تھیں اور جوانمردان پر دھڑا دھڑ لاٹھیاں برسا رہے تھے، اور عورتوں کے ساتھ لاٹھیاں کھانے والوں میں اور ان کو لاٹھیوں سے بچانے والوں میں ایک کمزور دل حبیب جالب بھی شامل تھے۔ حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن حبیب جالب کے ساتھ ہر حکومت کا سلوک یکساں رہتا ہے حکومتوں کے منظر بدل جاتے ہیں جالب کا منظر نہیں بدلتا۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ آخر ہم سب جالب کو کس طرح یاد رکھیں گے۔ کس طرح اس جرائت کا صلہ دے سکیں گے، کس طرح اس احسان کا بدلہ اتار سکیں گے! تو میرے ذہن میں ہلکے ہلکے دو ایک تصویریں ابھرتی ہیں ـــ

ایک تو یہی کہ ہم سب محفلوں میں اور اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ان کی شجاعت اور

حوصلے کی داد دیتے رہیں ' اور اکیلے میں ان سے معافی مانگتے اور اپنے آپ سے شرمندہ ہوتے رہیں ۔ لیکن دوسری تصویر جو میں سوچتی ہوں زیادہ واضح اور بہت خوبصورت ہے شاید ایک عورت کی آنکھیں ہی یہ منظر دیکھ سکتی ہیں ۔ کچھ اس طرح کہ ہو سکتا ہے اس احتجاجی جلوس میں کسی نوعمر لڑکی پر برسنے والی لاٹھی کو جالب نے اپنے ہاتھوں پر روک لیا ہو ' برسہا برس بعد وہ لڑکی اپنے بچوں کو ایک کہانی سنائے اور کہے کہ " سنو یہ کہانی نہ کسی بادشاہ کی ہے نہ وزیر کی نہ کسی جنگ جیتنے والے کی نہ ہارنے والے کی ---- یہ ایک سیدھے سادھے انسان کی کہانی ہے جس نے ظلم و جبر کا مقابلہ کرتے وقت ---- میری مدد کی تھی ۔ وہ ایک شاعر تھا ۔ اور اسکا نام حبیب جالب ---- مجھے یہ نام آج بھی یاد ہے اور میرے بچو تم بھی اس نام کو یاد رکھنا "

اس سے زیادہ میں جالب کے بارے میں آپ سے کیا کہوں ۔

(لندن کے ایک جلسے میں کی جانے والی تقریر)

سبطِ حسن

سچّا عوامی شاعر

اردو زبان نے نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر سچ مچ کوئی عوامی شاعر پیدا کیا ہے تو وہ حبیب جالب ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح وہ بھی عوامی انسان ہیں ان کا رہن سہن عوامی ہے۔ ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عوامی ہے ان کی قدریں عوامی ہیں۔ ان کی محبتیں اور نفرتیں عوامی ہیں۔ اور وہ عوام کے دکھ درد' آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی عوام ہی کی زبان میں کرتے ہیں یہ جو ہزاروں لاکھوں انسان حبیب جالب سے اتنا پیار کرتے ہیں اور ان کے اشعار سن کر فرط جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں تو ان کا پیار' ان کی وارفتگی بے سبب نہیں ہے۔

یونانی دیو مالا کے ہیرو پرومیتھوس کا قصور یہ تھا کہ اس نے انسان کو آگ کا استعمال سکھایا تھا اور اس طرح دیوتاؤں کا راز آدمیوں پر افشا کردیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں دیوتاؤں نے پرومیتھوس کو چٹان سے بندھوا دیا تھا جہاں ایک گدھ دن بھر اس کی بوٹیاں نوچ کر کھاتا تھا۔ اس اذیت ناک سزا کے باوجود جب دیوتا اس سے کہتے کہ معافی مانگ لو تاکہ اس عذاب سے چھٹکارہ پاؤ تو وہ جواب دیتا کہ مجھے یہ ....اذیت منظور ہے مگر تمہاری غلامی نامنظور۔ ایک رمزیہ کہانی ہے ورنہ شعور و آگہی کی سوغات دیوتاؤں کے دربار سے کبھی نہیں آئی بلکہ انسان نے سدا اپنے تجربے' مشاہدے اور قوائے عقلی کی مدد سے تحقیق و تخلیق کے مراحل طے کئے ہیں اور فہم و ادراک کی بلندیوں تک پہنچا ہے۔ البتہ تاریخ کے ہر دور میں ہم کو ایسے خطر پسند بھی ملتے ہیں جنہوں نے ہمیں حریت ذات کا درس دیا اور ہمارے سماجی شعور کی لو تیز کی۔ ایوب خان کی آمریت اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گی کہ اس تاریک دور میں بخشی گیانی مرحوم اور حبیب جالب ابھر کر سامنے آئے۔ جب کبھی اس ملک کی سچی تاریخ لکھی جائے گی تو

دنیا کو معلوم ہو گا کہ خوف اور دہشت کی اس فضا میں جہاں سانس لیتے ہوئے گھٹتا تھا انہوں نے قوم کی ڈوبتی نبض میں کس طرح زندگی کا خون دوڑایا۔

کانوں کی پیاس بجھانا حبیب جالب کا مقدر بن گیا ہے اور چارہ غم کی نوید سنانا ان کا مسلک زیست' وہ اگر ایک آنکھ سے روتے اور دوسری آنکھ سے ہنستے ہیں تو ان کا یہ رونا اور ہنسنا دونوں عوام ہی کے حوالے سے ہے وہ روتے ہیں' عوام کے حال زار پر اور ہنستے ہیں ان کے روشن مستقبل پر۔ ان کی شاعری شکست دل کی صدا بھی ہے اور سوز یقین کی للکار بھی۔ وہ دل توڑنے والوں کے ثروت و اقتدار سے کبھی نہیں ڈرے بلکہ اندھیرے کے پجاریوں نے شب خون مارنے کے بعد جو نقاب بھی اوڑھی حبیب جالب نے اس کو نوچ کر پھینک دیا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس درویش خاک نشیں میں یہ جرأت انکار کہاں سے آئی۔ وہ کون سی قوت ہے جو اس نیک دل اور نرم خو انسان کو باطل سے لڑنے اور حق کا اقرار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ درحقیقت وہ قوت عوام کی محبت ہے اور وہ چشمۂ حیواں جو حبیب جالب کو ولولہ اور جوش عطا کرتا ہے عوام کی طاقت ہے۔ حبیب جالب نے اپنی شخصیت اور شاعری کو عوام کی خاطر وقف کردیا ہے۔

لوگ اٹھتے ہیں جب تیرے غریبوں کو جگانے
سب شہر کے زردار پہنچ جاتے ہیں تھانے
کہتے ہیں یہ دولت ہمیں بخشی ہے خدا نے
فرسودہ بہانے ، وہی افسانے پرانے
اے شاعرِ مشرق، یہی جھوٹے یہی بد ذات
پیتے ہیں لہو بندۂ مزدور کا دن رات

شاعر کی صرف ایک قسم ہے اور وہ ہے شاعر ۔ جہاں تک شعراء پر مختلف لیبل چسپاں کر کے انہیں مختلف کابکوں میں بند کرنے کے رجحان کا تعلق ہے تو یہ غلط ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قومی، رومانی، اشتراکی یا اسلامی شاعر ہونے کے باوجود بھی اپنی اصلیت میں وہ شاعر ہی رہتا ہے ۔ کسی خاص طرز احساس کی نمائندگی کسی دبستاں سے وابستگی یا فکری تحریک سے تعلق اس بنا پر اضافی امور ہیں کہ یہ اس کی شاعری کو ایک خاص لہجہ تو عطا کرتے ہیں لیکن اسے شعر کہنے کی قوت نہیں عطا کر سکتے ۔

اگر شعراء کی اقسام کرنی ہی ہوں تو اچھا اور بُرا شاعر کی صورت میں ان کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے اور بس ۔

اس تمہید کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ حبیب جالب کی شاعری پر جس انداز کی آرا سننے کو ملتی ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ حبیب جالب بہت اچھا شاعر ہے ۔ کیونکہ اس نے سیاسی نظمیں لکھی ہیں ۔ بالفاظ دیگر سیاست کی تلوار اس کے دفاع میں بھی استعمال ہوتی ہے اور اس پر وار کرنے کے لئے بھی !

جہاں تک حبیب جالب کے شاعر ہونے کا تعلق ہے تو یہ کوئی نزاعی بحث نہیں ہے لہٰذا اُسے شاعر بلکہ بہت اچھا شاعر تسلیم کرانے کے لئے تنقیدی استدلال کی ضرورت

نہیں ۔ لیکن اس کی سیاسی شاعری ۔ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ اس کا اپنا سیاسی مسلک یقیناً باعث نزاع رہا ہے ۔ اس حد تک کہ بعض اوقات تو اس نزاع میں اس کے شاعرانہ محاسن بھی دَب جاتے ہیں ۔

اور پھر سیاسی شاعری کوئی آج کی نہیں بلکہ ایک قومی روایت کی حیثیت رکھتی ہے جس کی ابتدائی صورت اکبر الٰہ آبادی کے طنزیہ اشعار میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے ۔ اس کے بعد چکبست آتے ہیں جنہوں نے انگریزی سرپرستی میں "ہوم رول" مانگا ۔ ان کے بعد اقبال آئے ، جن کا اپنا ایک مخصوص سیاسی فلسفہ تھا ۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے بعض مقبول سیاسی تصوّرات (جیسے وطنیت ، قومیت ، جمہوریت اور اشتراکیت) وغیرہ کا ژرف نگاہی سے تجزیہ کرتے ہوئے اُن کی خامیاں اُجاگر کیں ۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند اَدب کی تحریک آتی ہے جس نے نہ صرف یہ کہ سیاست پر بطورِ خاص زور دیا بلکہ اس کے ڈانڈے اشتراکیت سے بھی ملا دیئے ۔

تقسیمِ ملک تک ہر مسلک کے حامل شعراء کی سیاست میں غلامی سے نجات قدرِ مشترک تھی لیکن تقسیمِ ملک کے بعد کے حالات کا تقاضا کچھ اور ہی تھا ۔ جیسے کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے اور کچھ سمجھ کر چُپ رہے جبکہ بعض نہ سمجھ کر بولے ! الغرض عجب ذہنی خلفشار کا عالم رہا ۔ جن کا سب سے بڑا باعث ملک میں حقیقی جمہوریت کا فقدان تھا ۔ یہ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ اسے جب کبھی بھی سیاسی استحکام نصیب ہوا وہ ہمیشہ آمروں کے ہاتھوں ہوا ۔ یوں کہ ہر آواز دبادی گئی اور خوش آئند مستقبل کا خواب دیکھنے والے عوام کا یہ حال رہا !

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم !

ہمارے شعراء کبھی بھی بے شعور نہیں رہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ خوف یا وقتی مصلحتیں لب وا نہ ہونے دیں ۔

حبیب جالب سب سے پہلے محترمہ فاطمہ جناح کی الیکشن مہم میں ایوب خان کے خلاف پُرجوش نظموں کے ذریعہ عوام کے سامنے آیا ۔ اس سے قبل وہ ایک غزل گو کی حیثیت سے اپنا مقام بنا چکا تھا ۔ اگرچہ اس وقت بھی اس کے بارے میں یہ نزاعی بحث جاری تھی کہ اس کی مقبولیت میں کس حد تک ترنّم کا ہاتھ ہے اور کس حد تک اس کے اشعار کا ! جالب محض ترنّم کا شاعر ہوتا تو وہ آج بھی مشاعرے لوٹنے والا شاعر ہوتا ۔ لیکن بقدرِ ظرف نہیں ہے یہ

تنگنائے کے مصداق اس نے خود کو مشاعروں کی گھٹی فضا سے باہر نکالا اور سیاسی جلسوں میں تاحدِ نگاہ پھیلے پاکستانی عوام سے براہِ راست اُن کی زبان میں خطاب کیا۔ یہ تبدیلی کیسے آئی ؟

حبیب جالب نے ایک عام روائتی غزل گو کی حیثیت سے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ چنانچہ "برگِ آوارہ" کی غزلیں دیکھیں تو غزل کے مخصوص اسالیب و مضامین ہی ملتے ہیں۔ کسی طرح کی بغاوت یا احتجاج کا اندازہ روا نہیں رکھا گیا۔ اس دَور کے کلام میں ایسے رجحانات عنقا ہیں جنہیں اس کی سیاسی شاعری کا پیش خیمہ قرار دیا جاسکے۔

اگرچہ اُردو میں حسرت موہانی کی مانند ایسے غزل گو بھی ملتے ہیں جنہوں نے غزل کو سیاسی افکار کا آئینہ بنا دیا۔ مگر حبیب جالب نے غزل کو سیاسی ابلاغ کا ذریعہ نہ بنایا۔ اس عہد کا حبیب جالب تو سیدھا سادا غزل گو ہے اور بس !

لیکن اچانک حبیب جالب ایک دوسرے روپ میں نظر آتا ہے۔ وہ غزل گو کی محفوظ زندگی تیاگ کر سیاست کے خار زار میں قدم رکھ چکا ہے۔ زلف و رخسار کے گیت گانے والا اَب دار و رسن کی حکایات سُنا رہا ہے اور یوں حبیب جالب کی صورت میں جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے شاعر کا ظہور ہوتا ہے اور گزشتہ چودہ پندرہ برس سے وہ اپنی ساختہ روایت کو نبھاتا چلا آرہا ہے۔ ان برسوں میں پاکستان نے بہت کچھ دیکھا بہت کچھ گنوایا، بہت سے لوگوں کو برداشت کیا۔ بہت سوں پر کچھاور ہوا مصلحت پسند شعراء کہاں سے کہاں پہونچ گئے۔ لیکن حبیب جالب محض حبیب جالب ہی رہا۔ اور وہ بھی زیادہ تر جیل میں ! اس میں اس کے سیاسی مسلک کا قصور کم ہے اور اس کی شاعرانہ ہٹ دھرمی کا زیادہ ! کہ اس نے خود کو سب سے زیادہ انمول جانا، نہ خود کو منڈی میں لایا اور نہ اپنی قیمت چکائی۔

حبیب جالب پیشہ ور سیاست داں نہ بنا۔ اس لئے لچکیلی ڈال کی مانند بدلتی ہواؤں کے ساتھ ساتھ رُخ نہ بدلتا گیا، بلکہ ایک مضبوط تنے کی مانند آندھیوں کے جھکڑوں میں بھی قائم رہا، اور اسی لئے آج اس کا نام عزت و احترام سے لیا جا رہا ہے۔ اپنی تخلیقی زندگی کی ربع صدی جس میں پریشانیوں کے برسوں کی بھی کمی نہیں گزارنے کے بعد حبیب جالب اب سیاست سے بے زار ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ جن کی خاطر اس نے مصائب برداشت کئے وہ بھی اسے استعمال

ہی کرتے رہے مگر شاعر محض شے کبھی نہیں بن سکتا۔ اور بالخصوص حبیب جالب ایسا شاعر جس کی متاع ہی شاعرانہ اُنا ہو، اس لئے آج وہ سیاست دانوں سے، جلسوں سے، جلوسوں سے حتیٰ کہ اپنے بیشتر ہم عصر شعراء سے بھی بے زار ہو کر الگ کھڑا ہے۔ غالباً اسے اپنے مشن کے بے مصرف ہونے کا تلخ احساس بھی ہے اور یہ بھی کہ میں نے جو کاٹا وہ بویا نہ تھا۔ اور جو بویا تھا اس کی فصل دوسرے لے گئے۔ لیکن اپنی تمام شاعرانہ بصیرت کے باوجود حبیب جالب اس حقیقت کو نہ سمجھ سکا کہ سچ بولنے والا ہمیشہ تنہا ہی رہتا ہے۔ دشمن کو سچ گوارا نہیں جبکہ دوست سچ کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اسی لئے سچ بولنے والا معاشرہ میں اچھوت بن کر رہ جاتا ہے۔ آج حبیب جالب نے بھی سیاست میں اچھوت کی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ اب اس کی پارٹی بھی اسے اپنانے کی روادار نہیں۔

یہ سب اس میں ایک باطنی کشمکش پیدا کر سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش جس کی آنچ کمزور اعصاب کو سوکھی گھاس کی طرح جلا کر راکھ کر دے۔ لیکن سچی شاعری کا سونا اس میں سے کندن بن کر نکلے۔ زمانہ حبیب جالب کی تخلیقی زندگی کے دو ادوار دیکھ چکا ہے، غزل گو اور سیاسی نظم گوئی۔ ہم نے اس کی تخلیقی شخصیت کے یہ دو روپ تو دیکھ لئے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کا خاموش حبیب جالب جب کل بولے گا تو یہ اس کی تخلیقی شخصیت کا تیسرا روپ ہوگا۔ میں اُدب میں جین ڈکسن کی مانند پیشین گوئی کا قائل نہیں لیکن مستقبل کے حبیب جالب کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ گزشتہ دونوں ادوار کا امتزاج ہوتے ہوئے بھی ہر دو سے منفرد ہوگا۔ حبیب جالب کا ایک بہت پرانا شعر ہے۔

پھر جا رہا ہوں تیرے تبسم کو لوٹنے ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

اور مجھے یقین ہے کہ وہ تبسم لوٹنے کا فن ابھی بھولا نہ ہوگا۔ ابھی اسے مزید تبسم لوٹنا ہے اور لوٹ کے اس مال کو سب میں تقسیم بھی کرنا ہے کہ اسی طرح اس کے حصہ کا تبسم اسے مل سکتا ہے۔

حبیب جالب کی ایک تازہ غیر مطبوعہ غزل کا یہ مقطع —

شعر کا عشق اگر ہو تو غزل میں جالب
کیوں کسی اور کا انداز بیاں یاد آئے

سن کر، اس دور کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے جب یار لوگوں نے میر تقی میر کے انداز میں غزلیں کہنے کی طرح ڈالی تھی۔ یہ ایک ایسی منفی رو تھی جس کے خلاف جالب نے اپنی شاعری میں آواز بلند کر کے نہ صرف اپنا راستہ متعین کیا تھا بلکہ اپنے ہمعصروں کو بھی مثبت جہت پر چلنے کی ترغیب دی تھی۔

دہلی کے "آل انڈو پاک مشاعرے" میں جس کی صدارت فراق گورکھپوری نے کی تھی۔ حبیب جالب نے اپنی اس غزل پر ڈھیروں داد وصول کی تھی۔

جس کی آنکھیں غزل، ہر ادا شعر ہے
وہ میری شاعری ہے، مرا شعر ہے

غزل پڑھتے پڑھتے جالب، جب اس شعر پر پہنچے تو انہوں نے داد طلب انداز میں فراق کو مخاطب کیا: "فراق صاحب! یہ شعر آپ کی نذر ہے:

اپنے انداز میں بات اپنی کہو!
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

ابھی ردیف ان کے لبوں پر ہی تھی کہ محفل "واہ وا" اور "مکرر ارشاد" کی صداؤں سے

گونج اٹھی۔ جالب نے "فراق صاحب۔ شعر نذر کرتا ہوں" کہا اور شعر کو پھر فضا میں اچھال دیا۔ پھر داد برسی اور "مکرر ارشاد" کے نعرے گونجے۔ جالب نے تیسری بار "فراق صاحب۔ یہ شعر آپ کی نذر کرتا ہوں" کے الفاظ کے ساتھ پھر فضا میں ترنم بکھیر دیا۔ مگر فراق گورکھپوری ہر بار اپنے غصے کو ضبط کئے بیٹھے رہے۔ چند روز کے بعد کلکتے میں مشاعرہ تھا جس میں جالب بھی مدعو تھے اور فراق گورکھپوری بھی۔ فراق (غالباً ہوٹل کے) کسی کمرے میں اکیلے محفلِ کیف و سرور جمائے بیٹھے تھے۔ ایک شاگرد عزیز اُن کی خدمت میں حاضر تھا۔ جالب نیاز مندی کی خاطر اُن کے حضور پہنچے ہی تھے کہ فراق جلال میں آگئے اور بولے "میاں، اُس دن کیا شعر پڑھا تھا تم نے؟ بھلا یہ بھی کوئی انداز ہے؟ اگر ہم نے میر کے انداز میں دو چار غزلیں کہہ دی ہیں تو اُس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارا سارا کلام میر کے رنگ میں ہے۔ یہ بات جالب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ دہلی کے مشاعرے میں فراق بُرا مان گئے تھے اور انہوں نے نہایت سادہ شعر کو اپنے آپ پر طنز سمجھ لیا تھا۔ جالب معاملہ کی سنگینی کو بھانپ گئے اور عرض گزار ہوئے کہ انہوں نے تو فراق کو داد طلب انداز میں مخاطب کیا تھا۔ ان کا مقصد نہ تو فراق پر چوٹ کرنا تھا اور نہ ہی انہوں نے فراق کی غزلیں پڑھی تھیں جو انہوں نے میر کے انداز میں کہہ رکھی تھیں، بلکہ انہوں نے تو اپنے ملک میں چلی ہوئی ایک منفی رَو پر طنز کیا تھا ـــــ اور بس۔ "میں تو آپ کو صاحبِ طرز شاعر مانتا ہوں۔ بھلا میری کیا مجال کہ آپ کی شان میں گستاخی کروں! جالب کی اس وضاحت کے بعد اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ پھر گلے بھی لگایا اور "شریکِ محفلِ کیف و سرور" بھی کیا۔ اور پھر مشاعرے میں جالب کا نام پکارا گیا تو فراق خود مائیک پر آئے اور ان الفاظ کے ساتھ جالب کا تعارف کرایا۔

"میرا بائی کا سوز اور سور داس کا نغمہ جب یکجا ہو جاتے ہیں تو حبیب جالب اُن چند خوش قسمت شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ کام کر کے تجربہ حاصل کرنے کے مواقع میسر آتے رہے ہیں۔ انہوں نے اس تجربے

کو اپنے فن میں یوں رچا بسا لیا کہ ہر دکھی انسان کو حبیب جالب کے شعر اپنے ہی دکھ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ حبیب جالب ایک عوامی شاعر ہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ انہوں نے عوام میں اتر کر عوام کی زبان میں ــــ اس زبان میں، جسے لوگ سمجھتے ہیں ــــ نہایت سادہ اور سلیس الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے اُن دکھوں کو نظم و غزل کیا ہے جو ہم سب کے، تمام دکھی انسانیت کے مشترکہ دکھ ہیں ؎

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

حبیب جالب کو شعر کہنے کا شوق بچپن سے ہے۔ ساتویں جماعت کے سالانہ امتحان میں، جالب کے لئے "وقتِ سحر" کو نثر کے جملے میں استعمال کرنا مشکل تھا اور شعر میں باندھنا آسان۔ چنانچہ جب اس شعر میں ؎

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور ہم
وعدہ شکن کو دیکھتے وقتِ سحر گیا

اُن کے رہتکی استاد یقین شاہ نے "وقتِ سحر" کا استعمال دیکھا تو عش عش کر اٹھے اور ملنے پر یوں گویا ہوئے "حبیب تم تو شاعر ہے بھئی!" انہیں خوشی تھی کہ اُن کا ایک شاگرد (حبیب جالب) بامعنی اور باوزن شعر کہہ لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ شوق بڑھتا گیا۔ قیامِ پاکستان کے دن ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جالب کراچی چلے آئے۔ شعر کہنے کا شوق بھی ہجرت کر کے ساتھ ہی آیا۔ کراچی میں دلی کے اور یوپی کے تقریباً تمام اساتذہ اور اُن کے شاگردانِ عزیز بھی آہستہ آہستہ جمع ہوتے گئے۔ حبیب جالب اُن کی محفلوں میں جاتے۔ اُن کا کلام سنتے، اُن کی چپقلشوں سے مستفیض ہوتے۔ مشاعروں میں باقاعدہ شرکت کرتے (غالباً ۱۹۴۸ء میں راغب مراد آبادی بھی کراچی چلے آئے۔ جالب نے جب اُن سے "شعر العجم" اور "نکاتِ سخن" ایسی کتابوں کا ذکر سنا تو بہت مرعوب ہوئے، کیونکہ اُن کے لئے کتابوں کے یہ نام بالکل نئے

تھے۔ وہ تو سادہ اور سلیس زبان میں شاعری کرتے تھے۔ اُن کا ذخیرۂ الفاظ بہت محدود تھا
دلی اور یوپی کا یہ رواج بھی کہ اساتذہ کرام اپنے شاگردوں کو غزلیں خود لکھ کر دیا کرتے تھے
لیکن حبیب جالب اس رواج کو پسند نہ کرتے تھے۔ انہیں اچھا نہ لگتا تھا کہ اُن کی غزل
میں راغب مراد آبادی کچھ ایسے الفاظ رکھ دیں کہ ؎

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

لوگ بھاری بھر کم الفاظ کے معنی پوچھیں اور جالب بتا نہ سکیں ۔ یہ اُن کے لئے
قابلِ قبول نہ تھا۔ تاہم جب وہ کسی محفل یا مشاعرے میں شعر سناتے تو راغب مراد آبادی
سے کچھ نہ کچھ تعلق کی بناء پر شروع شروع میں لوگ یہی سمجھتے رہے کہ جالب، راغب کا
کلام پڑھ رہے ہیں۔ "اپنا ہی بچہ ہے" جیسے الفاظ کہہ دینا اساتذہ کی عادت جو ٹھہری تھی۔
ایک مشاعرے میں جالب نے جب اپنی غزل پر راغب کو داد وصول کرتے دیکھا تو بغاوت پر
آمادہ ہوگئے، اور اُن سے ناطہ توڑ لیا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ راغب مراد آبادی،
حبیب جالب کو جمیل الدین عالی سے ملوانے کے لئے ساتھ لے گئے۔ عالی اپنے دفتر کی کینٹین
میں بیٹھے تھے۔ کچھ عالمِ کیف طاری تھا۔ اسی کیفیت میں راغب نے تعارف کراتے ہوئے
کہا: "نوجوان بہت اچھا کہتے ہیں اور بہت اچھا پڑھتے ہیں ـــــــ جالب تخلص کرتے
ہیں۔" عالی نے فوراً جالب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

"تم خود شعر کہتے ہو؟"

"جی ہاں"

"اچھا، کوئی شعر سناؤ!"

مدتیں ہوگئیں خطا کرتے   شرم آتی ہے اب دعا کرتے"

"اگر یہ شعر تم نے خود کہا ہے تو پھر اس ـــــــ کے ساتھ کیوں آتے ہو؟"
اس واقعے کے بعد جالب، راغب کے ساتھ نہ کسی شاعر کے پاس گئے اور نہ کسی

محفل یا مشاعرے میں۔ گویا جالب کی شعری تربیت بھی ایسے ماحول اور ایسی فضا میں ہوئی جہاں پابندیوں کے ہوتے ہوئے بھی جالب نے آزاد رہنا ہی پسند کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ جو مصرعہ، جو شعر کہتے ہیں اپنے رنگ میں کہتے ہیں، اپنے ڈھب میں کہتے ہیں ؎

یہ کونسی بستی ہے جہاں چاند نہ سورج
کس درجہ بُری رات ہے، کس درجہ بُرا دن

معاشی حالات کے دباؤ کے تحت، حبیب جالب اپنا سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ان کے والد جو دہلی میں رہ گئے تھے، تقریباً ڈیڑھ برس بعد پاکستان آئے۔ جالب ۵۲،۵۱-۱۹۵۱ء میں لاہور آکر سید فرید کاظم گیلانی کے والد سید اولاد علی شاہ گیلانی (جو ان دنوں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لکھ رہے تھے) کے ہاں رہنے لگے۔ اورنٹیل کالج میں داخلہ لے لیا۔ روزنامہ آفاق میں پچھتر روپے ماہوار مشاہرہ پر "پروف ریڈر" کا کام بھی کرتے تھے۔ گیلانی صاحب کے مکان کا راستہ "اُس بازار" سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ دو اڑھائی بجے رات میزبان کے مکان کی طرف جاتے وقت اکثر پولیس والے دھر لیا کرتے تھے اور ہر بار گیلانی صاحب کو چھڑوانا پڑتا تھا۔ گیلانی صاحب اس روز روز کی حراست اور رہائی سے تنگ آگئے۔ اَسی بیاسی سال کے بوڑھے تھے، روزانہ آتنی رات گئے دروازہ کھولنے میں دقت ہوتی تھی۔ انہوں نے جالب کو اپنے لئے کوئی اَور انتظام کر لینے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سید وقار عظیم جیسے شفیق اور محسن اساتذہ کی بدولت فیس تو معاف ہو گئی لیکن باقی کہاں تک ہوتا۔ پچھتر روپے میں کتنے کا مکان لیتے اور کتنے میں گزارہ کرتے؟ آخرکار، ناچار و لاچار تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ فاقے زندگی کا مقصد تھے۔ صبح کہیں، شام کہیں۔ آج یہاں، کل وہاں ؎

آج اس شہر میں، کل نئے شہر میں، بس اسی لہر میں
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا، شوقِ آوارگی

شہروں شہروں گھومے۔ قریوں قریوں خاک چھانی۔ مگر لاہور کی یاد ستاتی رہی۔

اتنی تو خبر ہے کہ پریشان تھا جالب
کس شہر گیا چھوڑ کے لاہور، کہیں کیا

"لاہور کی گلیوں میں رہنے کے لئے آدمی میں بہت خون ہونا چاہیئے" یہ الفاظ بھی جالب کے کہے ہوئے ہیں۔ چنانچہ

اب کس پہ ستم، نئے ستم ایجاد کرو گی
لاہور کی گلیو! مجھے تم یاد کرو گی!

جالب خون جمع کرتے رہے اور جب اس قابل ہو گئے تو پھر لاہور میں آن ڈیرا جمایا لیکن یہ خون جمع کرنے میں انہیں کتنا وقت لگا —— کون کونسے مراحل طے کرنا پڑے —— کتنے جتن اٹھانے اور کیا کیا مصائب جھیلے —— یہ جالب ہی جانتے ہیں۔

کسی نے طنز کے لہجے میں کہا تھا کہ جالب بھی کوئی شاعر ہے ؟ فیض احمد فیض نے جواب دیا تھا کہ جتنے سامعین جالب کو میسر آئے ہیں، کتنے آج تک (اُن سمیت) کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے۔ یوں دیکھا جائے تو جالب اُردو اَدب میں وہ پہلا شاعر ہے جسے سُننے کے لئے لاکھوں آدمیوں کا مجمع اُن کا منتظر رہا ہے۔ وہ لائل پور کے صرف ایک مشاعرے میں شریک ہوئے تو راتوں رات سارے شہر میں مشہور ہو گئے اور جس غزل کی بدولت انہیں شہر گیر شہرت ملی تھی، اُس کے اس شعر نے انہیں ملک گیر شہرت کا حامل بنا دیا ہے

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں!
دُنیا والے، دل والوں کو اَور بہت کچھ کہتے ہیں

ایک بار گھنٹہ گھر کے قریب خواجہ ناظم الدین (اُس وقت کے وزیر اعظم) کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ سہگل برادران منتظمین تھے جبیب جالب نے خوب داد سمیٹی۔ سعید سہگل نے کوہ نور ملز

کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ اس ملازمت کے دوران جالب نے کوہ نور ملز میں م حسن لطیفی اور تاج محمد خیال کی صدارتوں میں مشاعرے کرائے۔ لیکن وہ مالکان کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہو سکے اور مزدور دوستی کی بدولت ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے ؂

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

عشق کے باب میں، حبیب جالب کہتے ہیں کہ وہ جو ایک روایتی عشق ہے، فقط شاعری کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں تو شادیاں بھی انسانوں کی بجائے ہندسوں سے ہوتی ہیں۔ ہندسے جو اس دور کی قوت سمجھے جاتے ہیں۔ ہندسے، جن کے بغیر آج کے انسان کو ادھورا گردانا جاتا ہے ہندسے جو چیک میں بھرے جاتے ہیں۔ ہندسے، جن کے ساتھ چہروں کی پہچان وابستہ کر دی گئی ہے۔ فون پر اَن دیکھے لوگوں کا نکاح ہو جاتا ہے۔ صرف ان ہندسوں کی بدولت جو بنک میں محفوظ ہوتے ہیں اور ؂

تیرے کوچے اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

جیسا کلام اس دور میں حوصلے کی بات ہے۔ قصہ یہ نہیں کہ حبیب جالب کو کسی نے نہیں چاہا۔ وہ چاہے بھی گئے ہیں لیکن ان کی بے سرو سامانی ہمیشہ اُن کے آڑے آئی ہے۔ انہیں مسجدوں سے اٹھا کر باہر پھینکوا دیا گیا۔ وہ مقبروں، مزاروں اور تھڑوں پر کرتے۔ بھلا ایسے آدمی کے ساتھ بھی کوئی صاحبِ دختر اپنا رشتہ استوار کر سکتا ہے ؂

غم یہاں پر، وہاں پہ شادی ہے
مسئلہ سارا اقتصادی ہے

پھر انہوں نے سوچا کہ پہلے ایک خوبصورت، مثالی معاشرہ تشکیل دے لیں۔ جس میں پیار ہی پیار ہو، محبت کی فراوانی ہو۔ کوئی اونچا نہ ہو، کوئی نیچا نہ ہو، کوئی چھوٹا نہ ہو، کوئی

بڑا نہ ہو۔ سب برابر ہوں۔ پھر عشق بھی کر لیں گے اور یوں حبیب جالب کا عشق سارے ملک کا عشق بن گیا۔ گھر سے گلی میں۔ گلی سے شہر اور پھر ملک میں ــــــ اور پھر پوری دنیا کا غم انہیں چاٹ گیا۔

حبیب جالب کے اس خیال سے کسے اتفاق نہیں کہ ایسے سرمایہ دار اور جاگیردار بہت کم ہوتے ہیں جو سچی سیاست میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ "امروز" اور پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے دوسرے جریدوں کی مثال دیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کہ اُن کے اجراء کا مقصد کوئی تجارتی فوائد حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ میاں افتخار الدین کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پاکستان میں قوم پرستی اور ترقی پسندی کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ ان حالات میں اگر وہ ملیں بھی لگا لیتے تو ہم اُن کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ جب کہ انہوں نے ایک ادارے میں ایسے لوگوں کو یکجا کیا جو ملک اور قوم کو ہر اعتبار سے خود مختار اور آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ حبیب جالب نے ایک "پروف ریڈر" کی حیثیت سے امروز لاہور میں کام کیا پھر کراچی منتقل ہوتے تو امروز ہی سے وابستہ ہوئے۔ وہاں "آزاد پاکستان پارٹی" کی بنیاد رکھی گئی تو جالب کا ذہن چونکہ اس پارٹی کے منشور سے نظریاتی طور پر ہم آہنگ تھا، اسلئے انہیں کسانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے دیہات میں جانا پڑا۔ فرض کے تحت حیدر بخش جتوئی کے الیکشن میں گئے اور گیت پڑھا جس کا ایک حصہ درج ذیل ہے۔

حیدر بخش جتوئی رے بھیا

حیدر بخش جتوئی

ہاری کا غم کھانے والا اور نہ دوجا کوئی

حیدر بخش جتوئی

ہم لاکھوں کی پونجی لوٹے جاگیردار اکیلا

اچھا پہنے، کار میں گھومے، ٹھاٹھ کرے البیلا

ہم تو روئیں بھوک کے مارے اور اُسکے گھر میلہ
آپ تو اوڑھے شال دوشالہ، ہمیں ملے نہ لوئی
حیدر بخش جتوئی رے بھیا
حیدر بخش جتوئی

حبیب جالب انجمن ترقی پسند مصنفین کے رُکن رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس انجمن سے وابستگی کی بدولت اُن کے خیالات کو جلا ملی۔ سب کے دُکھوں کو اپنا دُکھ سمجھ لیا۔ سب کا دُکھ اپنا دُکھ ہو گیا۔ اسی طرح زندگی گزارتے چلے گئے۔ ذاتی مفاد کو کہیں سامنے نہ رکھا۔ کئی سابقہ حکمرانوں نے انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن نہ جھکنا جانتے تھے اور نہ جھکے:

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے کا اتنا ہی یقیں تھا

انہوں نے دن کو ہمیشہ دن اور رات کو سدا رات کہا۔ شاہوں کے قصیدے کہنے کی بجائے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کی بجائے کسانوں اور مزدوروں کی مدح سرائی میں مصروف رہے ؎

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو

رہے نہ کوئی عالیجاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ!

حبیب جالب نے ہر میدان میں ادب کی خدمت کی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے سیاسی جلسوں کو بھی نرمی اور محبت کے گہواروں میں ڈھال دیا۔

اور یہ بات کتنے نقادوں کی بات پر بھاری ہے کہ ایوب خان جیسے حکمران نے اپنے
دورِ اقتدار سے ہاتھ دھونے کے بعد ایک بار اپنے ایک محسن سے کہا تھا کہ:

"مجھے حبیب جالب سے ملاؤ! ـــــ میں اس شخص سے
وہ نظمیں سننا چاہتا ہوں جو اس نے میرے خلاف، میری حکومت
کے خلاف کہی تھیں!"

عبادت بریلوی

نظریئے کا شاعر

کوئی بیس پچیس سال ادھر کی بات ہے لاہور کی ادبی محفلوں میں ایک نوجوان باقاعدگی سے شریک ہوتا مشاعروں میں لہک لہک کر اپنا کلام پڑھتا اور سننے والوں کو اپنے کلام اور اپنے لحن سے مسحور کر دیتا تھا۔ اس کی باتوں میں تو مسحور کر دینے والی کیفیت نہیں تھی، جوش و جذبہ سے بات کرتا لیکن اس کی باتیں پوری طرح واضح نہیں ہوتی تھیں۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوتا کہ اس کی باتیں دل سے نکلی ہوئی ہیں اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس میں صداقت ضرور ہے۔ یہ نوجوان حبیب جالب تھا۔

میانہ قد گول چہرہ، بھرا بھرا جسم، سر پر لمبے لمبے بال، گندمی رنگ، آواز میں گرج، مزاج میں باقاعدگی لیکن رندی اور درویشی کے رنگ کے ساتھ ہم آہنگ۔ وہ عام طور پر کرتے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس نظر آتا۔ کبھی کبھی مغربی لباس بھی زیب تن کرتا۔ لیکن ہر لباس میں اس کے ایک ایک انداز سے وجاہت ٹپکتی۔ کیا خوب نوجوان تھا۔

اس زمانے میں ہم لوگ شام کا تھوڑا سا وقت کسی نہ کسی اوسط درجے کے ریستوران میں گزارتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے تو ہمارے ساتھ نہیں بیٹھتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی موڈ ہوتا تو ہمارے پاس بھی آجاتا۔ مجھے وہ اچھا لگتا تھا، اس کی باتیں بھی مزہ دیتی تھیں، اس کے شعر بھی متاثر کرتے تھے۔ اس لئے جب بھی وہ ہماری محفل میں شریک ہوتا میرے لئے خاصی دلچسپی کا سامان فراہم ہو جاتا۔

کبھی کبھی وہ لاہور سے غائب بھی ہو جاتا اور ہفتوں اور مہینوں نظر نہ آتا۔ واپس آتا تو بڑے ہی خلوص اور محبت سے ملتا۔ گلے سے ملتا، معانقہ کرتا، مزاج پوچھتا، سفر کی تفصیل سناتا ہمارے حالات معلوم کرتا اور مجھے اس کے اس انداز میں خلوص اور محبت کے سمندر موج زن نظر آتے۔

اسی زمانے میں ایک دن ایسا ہوا کہ حبیب جالب میرے پاس اورینٹل کالج میں آیا اور

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگا "مجھے آپ اورینٹل کالج میں داخل لیجئے" میں اس کی بات سن کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ حیران تو اس لئے کہ حبیب جالب کو یہ کیا سوجھی' اور پریشان اس لئے کہ دوست اگر شاگرد بن جائے تو استاد کی حیثیت کچھ ڈانوا ڈول سی ہو جاتی ہے اور کچھ عجیب سا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس لئے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے حبیب جالب کو ٹالنے کی کوشش کی اور اسے یہ سمجھایا کہ اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ طالب علم ہو جانے سے اسے کچھ فائدہ نہ ہو گا لیکن حبیب جالب نے میری ایک نہ سنی اور داخل ہونے پر اصرار کرتا رہا۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ داخلے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے اور میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں تو میں نے سپر ڈال دی۔

اور اس طرح وہ اورینٹل کالج میں داخل ہو گیا۔

میں نے اس کو اورینٹل کالج میں اس لئے داخل کیا کہ ایک تو اس زمانے میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اس طرح وہ اردو ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کر سکے گا میں نے سوچا ڈگری تو اس کے لئے بے معنی چیز ہے وہ ان ڈگریوں کو لے کر کیا کرے گا۔ ہاں ہمارے کالج میں ذرا شعر و ادب کی فضا پیدا ہو گی' اور لڑکوں لڑکیوں پر اس کا اچھا اثر ہو گا۔

اس لئے میں نے حبیب جالب کو اپنا شاگرد بنا لیا۔

لیکن میں نے اس کے بعد' اس میں ایک عجیب سی تبدیلی دیکھی۔ مہذب اور شائستہ تو وہ اس سے قبل بھی ایسا تھا کہ اس کی مثال دینی چاہئے۔ لیکن اب یہ ہوا کہ احترام کا احساس اس کے ہاں بہت بڑھ گیا' اور وہ عام طالب علموں سے بھی کہیں زیادہ اپنے عمل سے اس کا اظہار کرنے لگا مجھے اس کے اس انداز سے شروع شروع میں کچھ الجھن بھی ہوئی لیکن میں نے اس کے اس رویئے سے مطابقت پیدا کر لی کیونکہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں جو فطری نیکی اور شرافت ہے' اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اورینٹل کالج میں حبیب جالب کے آنے سے ادبی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ شعر و شاعری کا ماحول پیدا ہو گیا اور چھوٹے یا بڑے پیمانے پر مشاعرے باقاعدگی سے ہونے لگے۔

اور میں اس فضا اور ماحول سے بہت خوش تھا۔

یہ زمانہ حبیب جالب کی شاعری کے لئے بھی بہت ممد اور بار آور ثابت ہوا۔ اس زمانے میں اس نے جو غزلیں تخلیق کیں ان میں ایک نیا احساس تھا۔ زندگی کو جاننے اور

حالات کو پہچاننے کا ایک نیا شعور تھا ۔ زمانے کی مزاج دانی اور ماحول کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی خواہش اس میں کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی اور اس صورتحال نے حبیب جالب کو صداقت کا ترجمان ' خلوص کا عکاس اور حقائق کا نباض بنا دیا ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ خصوصیات حبیب جالب کے کلام میں اس سے قبل موجود نہیں تھیں ۔ ایسا نہیں ہے لیکن اب اس کے شعور پر خاصی نظر ہوگئی اور نظریئے کی پختگی کا احساس اس کے یہاں زیادہ نمایاں ہونے لگا ۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ جس کلاسیکی رنگ پر اس کی شاعری کی بنیاد استوار تھی ' وہ اس کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرا ہوتا گیا ۔

اور یہ سب اس کی کلام کی ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی دلکش اور دلنشین شاعری میں آج بھی نمایاں ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ نمایاں رہیں گی ۔

حبیب جالب نظریئے کا شاعر ہے ۔ اس لئے کہ وہ نظریئے کا انسان ہے ۔ زندگی کی قدریں اسے بے حد عزیز ہیں ۔ وہ بے قاعدگی ' ظلم ' ناانصافی ' تعیش پسندی ' اخلاقی پستی ' سماجی ناہمواری کا دشمن ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں ہر اس شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے جو ان قدروں کو ساتھ لے کر ملتا ہے ۔ لیکن جہاں ان قدروں سے اس کا دامن چھوٹتا ہے ' حبیب جالب اس سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے ۔ اور اپنے فکر و فن کے نشتروں سے اس کو ادھیڑ دیتا ہے ۔

اس وطن عزیز میں جو کچھ ہوا ہے ' اور مختلف لوگوں نے اس پر مختلف طریقوں سے جو ستم ڈھائے ہیں ' اس کی تاریخ مرتب کی جائے تو اس میں حبیب جالب کے اس جہاد کا ذکر سنہرے حروف میں لکھا جائے گا ' جو اس نے جبر و استبداد کے خلاف کیا ہے ۔

میرے نزدیک وہ ایک اہم شاعر ہی نہیں ایک اہم انسان بھی ہے ' کیونکہ اس نے خیر کی قدروں کے لئے قید و بند کی صعوبتیں تک اٹھائی ہیں اور اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا ہے ۔

میں جب بھی اس سے ملتا ہوں تو وہ مجھے بریشم کی طرح نرم نظر آتا ہے لیکن میری نظریں اس کی شخصیت میں باطل کے لئے ایک شمشیر برہنہ کو بھی پنہاں دیکھتی ہیں ۔
اور یہی اس کی شخصیت اور شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے ۔

عبدالقادر حسن

یہ جرم ہے مرا کہ مجھے ہو گئی خبر

یہ مصرع اس غزل کے مطلع کا مصرع ثانی ہے جو حبیب جالب نے میرے ایک کالم خواتین یونیورسٹی کے لئے گورنر ہاؤس" پر کہی ہے۔ جالب اور میں نظریاتی مخالف ہیں۔ وہ غریبوں، مظلوموں اور مقہوروں کا علاج آنجہانی کیونزم سے کرنا چاہتا ہے میں اس کا مداوا اسلام میں تلاش کرتا ہوں، بس یہی ہمارا اختلاف ہے۔ لیکن ہماری خواہش ایک ہے ہماری منزل ایک ہے ہمارا مقصد ایک ہے البتہ اس تک پہنچنے اور اس کے حصول کے طریقے مختلف ہیں۔ جالب اور میرا یہی ایک اشتراک ایسا ہے کہ جب بھی اس پر کوئی مصیبت آتی ہے اور ایسا اکثر ہوتا ہے تو وہ مجھے بھی یاد کرلیتا ہے۔ جب وہ حیدر آباد میں نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ بھٹو صاحب کی جیل میں رہا تھا تو اس پورے ملک میں صرف ایک میں تھا جو جیل سے آنے والے اس کے خطوط اور اس کے شعر اپنے ہفت روزے میں باقاعدگی کے ساتھ چھاپا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم بھٹو صاحب کی جمہوریت نے

ع لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

کہنے والے جالب کا نام لینا ممنوع قرار دے رکھا تھا۔

جالب کے بارے میں کچھ مزید عرض کرنے سے پہلے اس کی تازہ غزل ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے کالم کی اشاعت کے دوسرے روز مجھے فون کیا اور کہا کہ چند شعر ہوگئے ہیں وصول کرو۔ میں نے عرض کیا بسم اللہ! عطا فرمایئے۔ اور جو اشعار موصول ہوئے وہ پیش خدمت ہیں۔ اگر ممکن ہو تو مذکورہ کالم ذہن میں رکھیئے تاکہ ان اشعار کے شان نزول کے پس منظر میں

رہنے سے ان سے صحیح لطف اور کیف اٹھایا جا سکے۔

خوں سے مرے بنے ہیں وسیع و عریض گھر
یہ جرم ہے مرا کہ مجھے ہوگئی خبر
یہ آگہی ہوئی تو حسیں مفلسی لگی
ڈھلتے ہیں کس طرح سے زمانے میں اہل زر
ہر دور میں رہے ہیں مسلط سفید خوں
ہر دور میں رہے ہیں تہی دست! چشم تر
جو چیز مل سکے نہ، عبث اس کی آرزو
جو بچ رہا ہے جان! اسی کا بچاؤ کر
اے ہمدم عظیم! وہ خرچ اپنا کیوں گھٹائیں
شاہان وقت پر کہاں مہنگائی کا اثر

زندگی میں ایسے کئی مواقع آئے کہ میں نے جالب سے اپنے پیار کا اظہار کیا لیکن افسوس کہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ ادیب کہ اس سے اپنے پیار اور محبت کا اس کی طرح حسین اظہار کر سکتا۔ بس جو کرسکا وہ یہی کہ جب اس کی آواز محبوس ہوتی ہے تو جہاں کہیں ہوتا ہوں اس کی آواز کو پھیلانے اور عام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ جیل میں ہوں یا جیل سے باہر، سرکار کا معتوب ہو یا مقبول جیسا اور جہاں بھی ہو میرے لئے وہ صرف جالب ہی رہتا ہے جس کے نظریات سے سو فیصد اختلاف اور جس کے جذبات سے میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ میں نے جالب سے کئی بار کہا اور سمجھایا کہ کیمونسٹوں کے چکر سے آزاد ہوجا لیکن وہ نہ مانا۔ کیمونزم کے انتقال کے بعد میں نے اس سے کہا کہ اب تو گورباچوف نے بھی کیمونزم چھوڑ دیا ہے تو بھی باز آجا لیکن وہ چپ رہا۔ وہ کہتا تو غالباً یہ چاہتا تھا کہ

آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

لیکن کیمونزم کی شکست کا صدمہ اس قدر شدید ہے کہ ہمارے دوستوں کے دماغ شل ہوگئے ہیں تاہم جالب جیسے نیک نیت اور مظلوموں کے حقیقی دوست کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ اس دھوکے سے نکل آئے گا۔ جالب ہمارے کیمونسٹ دوستوں کی طرح اپر نہیں وہ محنت کش اور ایک مظلوم انسان ہے لیکن وہ اپنی غربت کے باوجود ایک سیرچشم

انسان ہے ۔ اسے اپنے فن کی وجہ سے امارت حاصل کرنے کے جتنے موقعے ملے شاید ہی کسی دوسرے کو ملے ہوں ۔ اس کی اصل عظمت یہی ہے کہ اس نے وقت کے سکندر سے اگر کبھی کچھ کہا تو صرف یہ کہ " آگے سے ہٹ جاؤ دھوپ چھوڑ دو " کاش ہم بھی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے کبھی اپنے اور دھوپ کے درمیان حائل گھوڑے پر سوار کسی سکندر سے کہہ سکتے کہ ہٹ جاؤ دھوپ چھوڑ دو ! یا اس درویش کی طرح کہ جس کا شہرہ سن کر بادشاہ نے اسے دربار میں بلایا اور درویش سے نصیحت حاصل کرنے کے بعد اس سے کہا کہ میرے لئے کوئی حکم ؟ درویش نے جواب دیا ہاں ! ایک حکم ہے ۔ بادشاہ خوش ہوا اور عرض کیا کہ فرمایئے ۔ درویش نے کہا "ہمیں بھول جایئے پھر کبھی یاد نہ کیجئے" مگر ہماری ایسی قسمت اور نصیب کہاں مگر وقت کے بادشاہوں کا مظلوم و مقہور جالب ایسی قسمت اور ایسا نصیب رکھتا ہے ۔
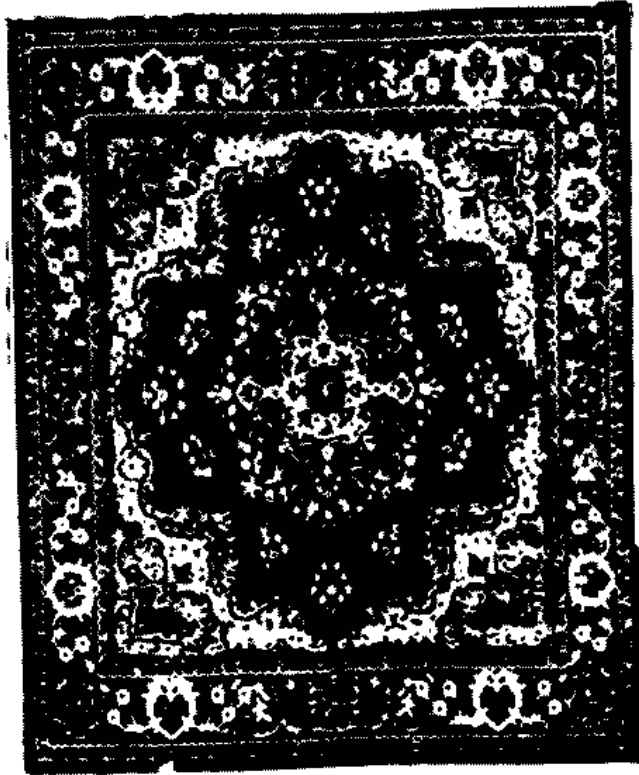
عبداللہ ملک
گریبان چاک جالب

نہ جانے کیوں زمانہ ہنس رہا ہے میری حالت پر
جنوں میں جیسا ہونا چاہئے ویسا گریباں ہے

سراج لکھنوی

جالب اس گئے گزرے زمانے میں عشق اور جنوں کا مظہر ہے کیونکہ شاعری تو بہت سے کرتے ہیں اور شعر و ادب کی وادی میں پچاس سے بھی زیادہ برس گزار دیتے ہیں لیکن نہ ان کا دامن تار تار ہوتا ہے ' نہ ان کے پاؤں لہولہان ہوتے ہیں اور تو اور ان کا تو گریباں بھی چاک نہیں ہوتا۔ اس لئے جب گریباں چاک جالب کے لئے عقیدت کا نذرانہ لے کر بڑی ' بوڑھی ' جوان رعنا اور مہ وشین سبھی قطار اندر قطار آتے ہیں تو یہ تہی دامن جالب سے ہی صرف اظہار عقیدت و محبت نہیں ' بلکہ یہ عقیدت و محبت جالب کے آدرشوں کے لئے ہے۔ اپنے شعروں میں ان آدرشوں کو سمونے کے لئے عقیدت کا اظہار ہے یہ عقیدت کا اظہار ہے اپنے آدرشوں کے لئے کچھ کر گزرنے کا۔ یہ عقیدت ہر ان جنوں خیزیوں کے لئے نہیں جن سے ہماری دامن تہی ہیں اور جالب نے ان جنوں خیزیوں سے اپنی جھولیاں بھری ہوئی ہیں۔

یہ رُتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہا

آج سے تیس چالیس برس پہلے جب اس برصغیر کے ادب میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا تو سالہا سال تک ترقی پسند ادیب معتوب ٹھہرے یہ ادیب اور شاعر صرف

سرکار دربار میں ہی معتوب نہیں ٹھہرے • بلکہ ادیبوں اور عالموں کے وسیع حلقوں میں بھی راندہ درگاہ تھے - کیونکہ بقول ان عالموں کے یہ ادیب نہیں بلکہ ایجی ٹیٹر AGITATOR تھے لیکن آج کیفیت ہی بدلی ہوئی ہے ' کل جو باتیں ادب کی حدود سے باہر تصور ہوتی تھیں آج انہیں باتوں کے سننے کے لئے کان ترستے ہیں ' اور ان باتوں کو کہنے والے ہمارے محبوب ٹھرتے ہیں - اور جالب تو وہ شاعر ہے جو ایجی ٹیٹر AGITATOR ہے اور وہ سر بلند کرکے نعرہ لگاتا ہے اور شعر کہتا ہے -

میں تو مایوس نہیں اہل وطن سے یارو
کوئی ڈرتا نہیں اب دارورسن سے یارو

پچھلی ربع صدی میں اس جہاں رنگ وبو میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس نے شعوری اور غیر شعوری طور پر ہماری علم و دانش اور فکرو نظر میں نمایاں تبدیلی اور انقلاب بپا کردیا ہے - ہمارے ہاں الجزائر کے حریت پسندوں اور ویت نام کے جیالوں کی جدوجہد کے دور میں یہ سوال بار بار اٹھایا گیا تھا کہ ادب میں COMMITMENT ہونی چاہئے یا نہیں ؟ یہ دراصل وہی جادو تھا جو تیس چالیس برس پہلے ترقی پسندوں نے جگایا تھا اور اب وہ سر چڑھ کر بول رہا تھا - گستاخی معاف حلقہ ارباب ذوق کو ہی لے لیجئے ایک زمانہ تھا کہ حلقہ ارباب ذوق کے رہنما سیاست اور اس کے متعلق گفتگو تک کو شجر ممنوعہ سمجھتے تھے اور ان کی محفل کے تمام دروازے سیاست پر لکھنے والوں اور شعرو افسانہ میں انقلاب اور سوشلزم کی بات کرنے والوں کے لئے بند ہوئے تھے ' برسوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام لیواؤں اور حلقہ ارباب ذوق کے ناخداؤں کے درمیان یہ مسئلہ نزاعی سے لے کر جنگ وجدل کا موجب بنا رہا ' لیکن آج وہی حلقہ ارباب ذوق " کچھ بدلا بدلا سا نظر آتا ہے کل جو الفاظ جو نعرے " ادب کی دنیا کے لئے ممنوع ٹھہرے " تھے وہی آج مقبول اور محبوب ہیں اور اس کا ثبوت خود یہ ہجوم داستاں اور عشاق کی فوج ظفر موج ہے جو آج جالب کو پاکستان کے شہروں اور قصبوں اور دیہات میں پھول نچھاور کررہے ہیں ' یہ دراصل خراج ہے جنوں کے حضور میں اور COMMITMENT کے لئے یہ خراج ہر قبیلے کو ' یہ خراج ہر انقلاب کو ' یہ خراج ہے سوشلزم اور جمہوریت کو - یہ بحث اب لاحاصل ہے کہ یہ ادب اور شعر کے موضوع ہیں یا نہیں - جب لاکھوں کا مجمع جالب کو سنتا ہے اس کے ایک ایک شعر پہ سر دھنتا ہے تو یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں -

ایک اور سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ جالب اور اس کے قبیل کی شاعری وقتی ہے ' فانی ہے ' ختم ہوجانے والی ہے ۔ لیکن کوئی ان سوال کرنے والوں سے پوچھے کہ ظلم جب تک رہے گا اس وقت تک یہ شاعری بھی زندہ رہے گی اور انسانوں کے لہو کو گرماتی رہے گی اسی لئے تو جالب نے کہا تھا

یہ عہد ستم ' سلسلہ وار کہاں تک
رستے میں اندھیرے کی یہ دیوار کہاں تک
اے صبح میرے دیس میں تو آکے رہے گی
روکیں گے تجھے شب کے طرف دار کہاں تک

اور جب امریکی سامراج قوموں کو لوٹتا ہے' ان کی آزادی کی تحریکوں کو کچلتا ہے اور افریقہ کے تپتے صحراؤں اور ویت نام کے جنگلوں میں مقہور و مجبور عوام اپنے آقاؤں کے خلاف جن کی پشت پناہی امریکی سامراج کرتا ہے مصروف پیکار ہوتے ہیں تو ان عوام کے حق میں آواز کہاں تک وقتی ہے ۔ کیا امریکہ کی ریشہ دوانیاں ایک حقیقت نہیں اور جالب اس حقیقت کو بیان کرتا ہے تو وہ ایک زندہ حقیقت کو بیان نہیں کرتا ۔

پنڈت اور ملا دونوں دشمن ہیں آزادی کے
آج ہے ڈیرا دیر و حرم کے سائے تلے' امریکہ کا

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جالب نے ہماری شاعری کو ایک نیا اسلوب بخشا ہے اور عوام کے ذوق شعری کی تشنگی بجھائی ہے ' ان کی تشفی کی ہے ' ان کی مایوس اور غمزدہ زندگی میں امیدوں کے دیپ جلائے ہیں جالب نے اپنی شاعری کے بارے میں خود" میری غزل کی ہے " میں کہا تھا ۔

انسانیت کے قتل پہ جو بولتا نہیں
کہنا پڑے گا وہ بھی ہے قاتل کا ہم زباں
بزدل ہیں ' کم نظر ہیں ' سپاہی نہیں ہیں وہ
شہروں میں جو چلائیں نہتوں پہ گولیاں

فارغ بخاری

ایک سچا عوامی شاعر حبیب جالب

عوامی ادب عوام کی دھڑکنوں کی زبان بولتا ہے۔ اپنے دور کے تقاضوں اور عصری صداقتوں کا عکاس ہوتا ہے، جو اہلِ قلم داخلیت کے خول میں مقید ہو کر ادب تخلیق کرنے کے قائل ہیں وہ ادبی رہبانیت کا شکار ہیں جو انہیں ثریا کی قدیم بنانے کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ ادب تو روشنی کا مینار ہے جو ہر عہد میں ظلمات کا سینہ چیر کر بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایسا باغ ہے جس کی خوشبو سے ساری دھرتی فیض یاب ہوتی ہے، ایسی حقیقت ہے جسے جھوٹ کی تمام ابلیسی قوتیں مل کر بھی نہیں مٹا سکتیں۔ وہ ازلی و ابدی سچائی ہے جس کا پرچم ہمیشہ اسی آن بان سے لہراتا رہے گا۔

حبیب جالب انہی ازلی و ابدی سچائیوں کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کی بنیاد انسان دوستی پر استوار ہوتی ہے۔ اس میں بانکپن ہے، توانائی ہے۔ محبت اور امن کا پیغام ہے

امن کا پرچم لے کر اٹھو، ہر انسان سے پیار کرو
اپنا تو منشور ہے جالب سارے جہاں سے پیار کرو

وہ سوشلزم کا علمبردار ایک ایسا ترقی پسند شاعر ہے جس کے قول و فعل میں مکمل ہم آہنگی ہے وہ نہ صرف انقلابی نغمے لکھتا ہے بلکہ عملی طور پر خود بھی انقلابی تحریک کا ایک نڈر اور بیباک سپاہی ہے اور اپنی حق گوئی کے سبب ہمیشہ رجعت پسند حکمرانوں کے عتاب کا شکار ہو کر قید و بند کے مصائب

جھیلتا رہا ہے۔ اس کی نظمیں "ایسے آئین کو میں نہیں مانتا" اور "صدر امریکہ نہ جا" اس کی جرأت مندی کا کھلا ثبوت ہیں۔ یہ نظمیں جب وہ پبلک جلسوں میں اپنے مخصوص ترنم میں لہک لہک کر پڑھتا، اسوقت عوام کا جوش وخروش دیدنی ہوتا تھا۔ یہ سابق صدر ایوب خان کا دور تھا۔ اسے بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے طویل عرصہ کے لئے کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا اور اس کے مجموعۂ کلام "سرِ مقتل" پر پابندی لگا دی گئی۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کے بعد حبیب جالب دوسرا عوامی شاعر ہے، وہ عوام کی بات کرتا ہے، عوام کی زبان میں بات کرتا ہے، عوام کے مسائل پر بات کرتا ہے، اسی لئے عوام اسے اپنا شاعر سمجھتے ہیں اس سے پیار کرتے ہیں اس کے گرویدہ ہیں، اسے سُن کر سر دھنتے ہیں۔ اس کے نغمے زبان زدِ عوام ہیں اور وہ انہیں خلوت جلوت میں لوک گیتوں کی طرح گنگناتے ہیں۔

حبیب جالب نے اپنے عوامی رویّہ سے عوام سے تو اپنے آپ کو ایک عوامی شاعر کے طور پر منوا لیا لیکن اُدبی اجارہ دار اسے تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے نظیر اکبر آبادی کو بھی سستا اور تُک بند شاعر کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔ لیکن اس کے انتقال سے ایک صدی بعد انہیں نظیر کی عظمت کا احساس ہوا اور اُسے ایک مجتہد العصر شاعر ماننا پڑا۔ نظیر کی طرح جالب بھی اپنے دور سے پہلے پیدا ہونے کا گنہگار ہے۔ اس لئے اس کا مقام بھی شاید اگلی صدی ہی میں متعین ہو سکے گا۔

نظریاتی بنیاد مستحکم ہو، فن کے ساتھ خلوص ہو تو کوئی طاقت بھی فنکار کو اس کی راہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ سچائی کا سفر کٹھن ہے، مصلحت اندیش اور عافیت پسند ذہن جو خطرات مول لینے کی ہمت نہیں پاتے ہمیشہ دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں جس میں قدر و منزلت ہے، منفعت ہے، کامرانی ہے۔ دار و رسن کی آزمائش اور فقر و فاقہ کی صعوبتوں کے سفر میں انہی سر پھروں کے قدم اُٹھتے ہیں جن کے پیشِ نظر عوام کی فلاح و بہبود کا عظیم مقصد ہوتا ہے جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے نقیب ہوتے ہیں جو روشن مستقبل کے داعی ہوتے ہیں۔ حبیب جالب اسی سرکش قبیلے کا فرد ہے جس نے جابر حکمرانوں کے سامنے اظہارِ حق سے کبھی کوتاہی نہیں کی، جس نے زخموں سے چُور ہوتے ہوئے بھی سینہ تان

کر اور سر اٹھا کر عدل و انصاف کا پرچم بلند رکھنے میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔

جینے کی آرزو ہے تو مرنا پڑے گا اب ۔۔۔ اشکوں سے اپنے زخم کوئی کب تک سینچے
ہو گا طلوع کوہ کے پیچھے سے آفتاب ۔۔۔ شب مستقل رہے گی کبھی یہ نہ سوچئے

وہ نسل و رنگ کی تفریق، طبقاتی تفریق اور محنت و سرمایہ کی تفریق کے خلاف ہمیشہ بانگ دہل آواز بلند کرتا رہا اور عوام دشمن سامراجی قوتوں کے خلاف زندگی بھر پوری بے جگری سے نبرد آزما رہا۔

پھر توڑیں گے ہم زنجیریں، ہر لب کو آزاد کریں گے
جان پہ اپنی کھیل کے پھر ہم شہر وفا آباد کریں گے
آخر کب تک چند گھرانے لوگوں پر بیداد کریں گے

"گھیراؤ"

تم سے پہلے بھی وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے کا اتنا ہی یقیں تھا

چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے زندگی
چھین لیتے ہیں جب چاہتے ہیں خوشی
اونچے اونچے گھروں میں ہے جو روشنی
جل رہے ہیں ہمارے لہو کے دیئے
کیوں کہیں یہ ستم آسماں نے کئے ۔۔۔ "گیت"

جالب کی بعض نظمیں تو اتنی سادہ، عام فہم اور غنائیت سے بھرپور ہیں کہ عوامی نعرے بن گئی ہیں

روٹی، کپڑا اور دوا ۔۔۔ گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت ہمیں تعلیم دلا ۔۔۔ میں بھی مسلماں ہوں واللہ

لا الٰہ الا اللہ

امریکہ سے مانگ نہ بھیک ‏ مت کر لوگوں کی تضحیک
روک نہ جمہوری تحریک ‏ چھوڑ نہ آزادی کی راہ

لا الٰہ الا اللہ

——— (پاکستان کا مطلب کیا)

خطرہ ہے زرداروں کو ‏ گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو ‏ خطرے میں اسلام نہیں

——— (خطرے میں اسلام نہیں)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ استحصال گزیدہ عوام کو بیدار کرنے، انہیں توہمات، جہالت، بے حسی کے دلدل سے نکالنے اور ملک میں دوستی اور سماجی انقلاب لانے کے لئے جس اسم اعظم کی ضرورت ہے وہ شاعروں اور ادیبوں کے سوا کسی کے پاس نہیں اور ان میں بھی وہ جو حبیب جالب کی طرح انقلابی شعور رکھتا ہے، جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہے۔

یہ جوان فکر تمہیں خون نہ پینے دیگی ‏ صاحبو! اب نہ تمہیں چین سے جینے دیگی
قاتلو! راہ سے ہٹ جاؤ کہ ہم آتے ہیں ‏ اپنے ہاتھوں میں لئے سرخ علم آتے ہیں
توڑ دے گی یہ جوان فکر حصارِ زنداں
جاگ اٹھے ہیں مرے، بے کس انساں

——— (جواں آگ)

جالب بلاشبہ مستقبل کا شاعر ہے اور یہ اعزاز اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

فردوس حیدر
مخالف ہواؤں کا شاعر

یوں لگتا ہے میں ایسا مسافر ہوں جو عرصۂ دراز تک اس لئے سفر کرتا ہے کہ دو دریا ملیں گے لیکن اس مقام پر جہاں دو دریا ملتے ہیں ایسی بھول ہوجاتی ہے کہ اختیار کی مچھلی ہاتھ سے چُھٹ جاتی ہے میں نے ہمیشہ چاہا کہ دنوں ' ہفتوں اور مہینوں اباجی کے پاس رہوں - ان سے ڈھیروں باتیں کروں - ان کے دوستوں کی باتیں سنوں - ان سے اپنی تحریروں کے حوالے سے گفتگو کروں لیکن میرے کام الجھے ہوئے تھے کبھی اتنی فرصت نہ ملی - وہ میرا انتظار نہ کرسکے - اور ایک دن بنا مجھ سے ملے بنا کچھ کہے چھوڑ کے چلے گئے -

حبیب جالب ابا جان کے ان دوستوں میں سے ہیں کہ جب وہ بیٹھک میں آتے مجھے خود بخود علم ہوجاتا اور میں چولھے پر چائے کا پانی رکھ دیتی - امی کو شاعروں سے چڑ تھی - وہ سمجھتی تھیں یہ لوگ گھر کی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں - اباجان حبیب جالب کے بارے میں کچھ نہ کہنے دیتے - ہمیشہ کہتے " وہ دلوں میں بستا ہے بلا خوف ہربات اعلانیہ کہتا ہے "

ہمارے گھر دستو وسکی ' ٹالسٹائی ' کارل مارکس ' لینن اور اسی قسم کی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا - ایک دن وہ پشکن کے بارے میں پڑھنے کے بعد کہنے لگے " حبیب جالب پاکستان کا پشکن ہے " شہنشاہیت کے خلاف جہاد ' جبر و ظلم کے خلاف نعرہ ' زار کا دور تو کسی نہ کسی شکل میں رہتا ہے - شہنشاہ کے شمشیر زن بھی کسی نہ کسی بھیس میں ہماری عورتوں کو ہتھیانے کی کوشش کرتے ہیں - بہانہ یا حوالہ کیسا بھی ہو ایسے لوگ سوئے دار چلتے ہیں اور ہمیشہ زندہ رہتے ہیں - "

پھر یوں ہوا کہ میں پاکستان سے باہر چلی گئی - مجھے " سرِ مقتل " کے شاعر کی خبریں ملتی رہیں - جمہوری اقدار کا علمبردار ظلم کے خلاف عوام کے ساتھ ڈٹا رہا - ڈائریکٹ پوئٹری وقت کی اہم ضرورت رہی ہے - یہ جہاں عوام کی آواز بنتی ہے انہیں MOTIVATE بھی کرتی ہے - جالب کی شاعری بہتر نظام کی خواہش کا اظہار ہے - بھوک و افلاس کے خلاف '

بددیانتی ' بدعہدی اور ظلم و جبر کے خلاف جہاد ہے ۔ یہ شاعری بغاوت پر نہیں اکساتی بلکہ اپنا حق مانگنا سکھاتی ہے ۔ اسی لئے سچی شاعری ہے اور سچ بولنے والا حاکم وقت کی بھول چوک کیسے معاف کرسکتا ہے ۔

غالباً ۷۳ یا ۱۹۷۴ء کا زمانہ ہوگا میں چند دنوں کے لئے پاکستان آئی ۔ ایک دوست کے ہاں اچانک جالب صاحب سے ملاقات ہوگئی ۔اب میں ای کی گرفت سے آزاد ہوچکی تھی ۔ اسلئے جالب صاحب سے باتیں کرسکتی تھی ۔

" میں خواجہ محمد منظور ایڈووکیٹ کی بیٹی ہوں ۔ " میں نے کہا

انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا ۔

" وہ گوجرانوالہ جسے دیوان سنگھ مفتون نے شیراز ہند کہا ہے ۔ " میں نے دوسرا اشارہ کیا

" تم خواجہ صاحب کی بیٹی ہو " وہ اٹھ کے کھڑے ہوگئے اور گلاس میز کے نیچے رکھ دیا۔

" میں ان کا بے حد احترام کرتا ہوں ۔ اس لئے تمہارے سامنے بھی نہیں پیوں گا ۔ "

میری آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ ایسا پیار تو خوش نصیبوں کو ملتا ہے ۔ میرے والد کے پاس واقعی محبت کا یہ خزانہ تھا ۔ میں جب گوجرانوالہ گئی اور انہیں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے کہنے لگے " اپنی ماں کو بتاؤ جالب کی بیوی کتنی جی دار ہے ہر دور میں ثابت قدم رہی ہے اور اس نے ؟ اس نے تو میری شاعری کو جلا دی ۔ "

میں نے ابا جان کے چہرے پر مایوسی و پژمردگی کی لہر دیکھی لیکن وہ فوراً جالب صاحب کی باتوں سے بہل گئے ۔ نہ جانے کیسے انہیں جالب صاحب کے اندر اپنی شخصیت نظر آتی ۔

" نظیر اکبر آبادی کو ادب کے برہمن شاعر نہیں مانتے تھے لیکن بعد میں انہیں رائے بدلنی پڑی۔ جالب میں نظیر اکبر آبادی کا مقامی رنگ ' آسان زبان ' دلنشیں انداز اور اثر انگیزی ہے نا؟"

وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھے دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے ۔

چند دن قبل بشیر مرزا کے ہاں میری ان سے ملاقات ہوئی ۔ برسوں بعد مجھے بہت کچھ یاد آگیا

جالب صاحب میں وہی ہوں جو آپ کو چائے بنا کر بیٹھک میں بھیجتی تھی ۔

" میرے بہت ہی عزیز بزرگ دوست کی بیٹی " کہہ کر انہوں نے مجھے اپنے گلے لگالیا

اباجان تو اب نہیں رہے ۔ان کی خوشبو ان کے دوستوں میں موجود ہے ۔ میں انہیں دیکھتی رہی ۔ وہ اپنی علالت کے باوجود شعر سناتے رہے ۔ میں سنتی رہی اور دل ہی دل میں دعائیں دیتی رہی ۔

اے مخالف ہواؤں کے مسافر ' جیتے رہو ' حالات کا مقابلہ کرتے رہو ' تم سے نوجوان نسل کو حوصلہ ملتا ہے اور ملتا رہے گا ۔

محسن احسان

دل دریدہ، سرکشیدہ

حبیب جالب شعرا کی اُس روایت سے تعلق رکھتا ہے جس میں محمد علی جوہر، حسرت موہانی ظفر علی خان، شورش کاشمیری اور کچھ دوسرے نام نمایاں ہیں۔ یہ وہ قد آور شخصیتیں ہیں جنہوں نے شاعری کو بلند و بالا بارہ دریوں سے اُتار کر تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والے مفلوک الحال اور فاقہ زدہ انسانوں کے دُکھ درد کے بیان کا وسیلہ بنایا۔ اُن کے مسائل کی بات کی۔ اُن کے جذبات و احساسات کی بھرپور آئینہ داری کی اور اُن کے رنج و الم کو زبان بخشی اور یوں ادب کے حوالے سے عوامی خدمات سرانجام دیں۔ اس کٹھن سفر میں حبیب جالب نے بھی اپنے پیشروؤں کی طرح صعوبتیں اُٹھائیں اور زنداں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں شب و روز بسر کئے لیکن سر کو نہ تو کسی امیرِ شہر کی دہلیز پر خم ہونے دیا اور نہ ہی حوصلے کو پستی سے ہمکنار کیا۔ اس نے ہمیشہ رئیسانِ وقت اور مفتیانِ شہر سے بے نیاز ہو کر، اور بسا اوقات اُن سے ٹکرا کر ذہن کی روشنی اور دل کی گرمی کو خارجی اعتبار سے ایک نئے معاشرے کے روپ میں منتقل کرنے کی سعی کو جاری رکھا۔ اس کا منتہائے نظر نام و نمود کی خواہش سے زیادہ صداقت کی تلاش رہی۔ اس نے جسم و جاں کی کڑی سے کڑی آزمائش سے گزر کر بھی ضمیر اور قلم کی عبارت کو نوواردانِ بساطِ سیاست کے دست ہائے ناپاک سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ وہ دل دریدہ ہوتے ہوئے بھی سرکشیدہ رہا کہ یہی اس کے اندر کی آواز تھی۔ اس نے خستہ حال مخلوق کے دلوں کی دھڑکنوں کو شعر کا لباس عطا کر کے اپنی عالمگیر محبت کا پیغام پھیلایا اور سیاسی پلیٹ فارم سے بحیثیت شاعر عوامی رابطہ قائم کر کے حق گوئی و بیباکی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اسکی

یہ جرأت و بے باکی بعض "باضمیر شاعروں" کی پیشانیوں پر تیوری کا باعث بن گئی کیونکہ اس نے اپنے تخلیق کردہ حرف سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ عدالت کے سامنے بھی اسی طرح سینہ تان کر کھڑا رہا جس طرح وہ سیاسی جلسوں اور مشاعروں میں سینہ تان کر کھڑا ہوتا ہے۔ اور اپنی دلکش اور مترنم آواز میں فضا میں ہاتھ لہرا لہرا کر شعر پڑھتا ہے۔ اس کے کلام میں انفرادیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی احساس کا شعور بھی ملتا ہے۔ جو اسے اپنے دیگر ہم عصروں سے ممتاز مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ غزل کے علائم و رموز کے حوالے سے تخلیقی اور فنی اظہار کی ایسی راہیں تراشتا ہے جن پر اس کا نظریاتی کارواں پڑاؤ ڈالنے کی بجائے منزل بہ منزل آگے بڑھتا ہے۔ اس کے کلام میں راہبر و راہزن تیرگی و روشنی قفس و آشیاں طوق و سلاسل طائر و صیاد زمین و آسمان اندھیرے اور اجالے راستے اور منزلیں اور ایسے کئی دوسرے علائم و رموز نئی سیاسی و اقتصادی معنویت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور روحِ عصر اور کربِ ذات کا ایک متوازن امتزاج اس کے فن کو حسن بخشتا ہے۔ جالب کی تخلیقی شادابی میں کسی زمانے میں ہی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے جن بنیادی اصولوں پر ابتدا میں صاد کیا وہ آج بھی اس کا جزوِ ایمان ہیں اور ان کا بے باکانہ اظہار اس کی زندگی کا اولیں مقصد۔ میرے نزدیک جالب کے فن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے تجربے کی روشنی اور جذبے کی حرارت سے کام لے کر روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا گہرا مشاہدہ کیا اور ان کو قبائے الفاظ سے آراستہ کر کے دوام بخشنے کی کوشش کی اور یوں وہ سچائی کی جستجو اور اسکے اظہار کے دشوار گزار راستوں سے ہمیشہ سرخرو گزرا ہے۔ اسکے ہاں خارجی محرکات داخلی کیفیات کے ساتھ اس خوش سلیقگی سے ضم ہوتے ہیں کہ فن اور حقیقت کے امتزاج کی ایک دلکش اور خوشنما تصویر آنکھوں کے سامنے ابھر آتی ہے۔ اس نے پسی ہوئی انسانیت کے دکھ کو اپنے فن میں سمو کر کرب کے ثمر اور درد کے پھل کے سوا کچھ نہیں پایا۔ اور اسکی اسی دولت نے اسے مسِ خام سے کندن بنا دیا ہے۔

محمد حسن

حبیب جالب ایک جائزہ

حبیب جالب قلم کا پیمانِ وفا ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب جبر اور مصلحت پرستی کا چلن ہو اُس زمانے میں کوئی شاعر دُور دراز پاکستان کے آمریت زدہ نظام میں ایسا بھی ہے جو اپنی بات بے جھجک کہنے کی ہمت رکھتا ہے اور اُس کی پاداش میں کبھی جیل خانوں میں زندگی گزارتا ہے کبھی پولیس کی لاٹھیاں کھاتا ہے کبھی دَر دَر بھٹکتا ہے اور حکومت اور دولت کا عتاب سہتا ہے مگر جس بات کو حق سمجھتا ہے اُسے کہنے سے باز نہیں آتا۔

صفحے کے صفحے وفا اور محبت، عارض و رخسار کی مہک اور دمک، انسانوں سے پیار کی نرمی، آسمانوں پر پھوٹتی شفق اور دبے پاؤں گزرتی ہوئی ہوا کے تذکرے سے لبریز ہیں، کڑواہٹ نام کو نہیں تیکھا پن ہے درد ہے مگر وہ بھی ناقابل برداشت نہیں کہ دل کو پارہ پارہ کر ڈالے۔ ہاں ایک طرفہ تیکھا پن ہے ایسی جو ٹوٹنا نہیں جانتی جھکنا نہیں جانتی اور اسی تیکھا پن سے زندگی کا پورا رویّہ اُبھرتا ہے۔

یہ رویّہ کیا ہے اُس کا اندازہ اُن کی نظم ایک شام" سے ہوتا ہے ارمان یہ ہے کہ

کریں بہار کی باتیں صبا کے لہجے میں — کسی حسیں سے کہیں فیضؔ کی غزل گائے
دیارِ دل کو اجالیں عدمؔ کے شعر ملے — رُخِ حیات پہ رنگ آئے روشنی آئے
زمانے بھر کے غموں کو "ہے دعوتِ آزار" — ہمارے دل کو نہیں چھو سکے گا غم کوئی

ہمارے ہاتھ میں ہے آفتاب عالم تاب   قریب آ کے دکھائے شب الم کوئی

یہ مسرت، لطافت اور کیف و مستی کی تلاش۔ ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارنے کی آرزو سے عبارت ہے اور اس راہ میں جو مشکلیں اور رکاوٹیں آتی ہیں اُن سے ٹکراتا، انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا اور یہ نہ ہو سکے تو اُن کے خلاف احتجاج کرنا ـــــ یہی حبیب جالب کی زندگی بھی ہے اور شاعری بھی اور اُس میں کوئی دوغلا پن یا منافقت کہیں نہیں ہے۔

ظلمت، جبر اور مصلحت کی فولادی قوتیں ان صحت مند ارمانوں کے خلاف صف آرا ہیں اور ان کے مقابلے کے لئے ضروری ہے عوام اور مستقبل پر بے پناہ اعتماد اور ایثار و قربانی کی بے اندازہ صلاحیت۔ یہی دونوں ستون ہیں جن پر حبیب جالب کی شاعری کی فلک بوس عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

عوام اور مستقبل پر اعتماد کی آواز جگہ جگہ اُن کی شاعری میں جگمگاتی ملے گی جیسا کہ ان کے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

تیرے لئے میں کیا کیا صدمے سہتا ہوں   سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھول بھی ہیں   تیری خاطر کانٹے چنتا رہتا ہوں
تو آئے گا اسی آس پر جھوم رہا ہے دل   دیکھ اے مستقبل

اور اُن کے تازہ ترین مجموعے کا گیت ان اشعار پر ختم ہوتا ہے۔

کھل جائیں گے در زنداں کے   جاگ اُٹھیں گے بھاگ انساں کے
دیدۂ پرنم پیار کا پرچم   چاروں طرف لہرائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

اس اعتماد کے سامنے وقتی پریشانیاں، سختیاں، اور درد و الم کے پہاڑ سب گوارا ہیں۔

رستہ کوئی سورج کا کوئی روک سکا ہے   ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر بند

یا اس قسم کے اشعار ـــــ

آنے لگی ہے یہ صدا دور نہیں ہے شہر گل   دنیا ہماری راہ میں کانٹے بچھا چکی بہت
کھلنے کو ہے قفس کا در پانے کو ہے سکوں نظر   اے دل زار شام غم ہم کو رُلا چکی بہت
اپنی قیادتوں میں اب ڈھونڈیں گے لوگ منزلیں   رہزنوں کی رہبری راہ دکھا چکی بہت

رہزنوں کی یہ رہبری کیا تھی اور اُس نے کیا راہ دکھائی۔ اس کے بیان سے حبیب جالب کی شاعری نے گریز نہیں کیا۔ اُن کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے ضمیر کی بکری۔ یعنی لالچ اور مصلحت کی خاطر خاموش رہنا یا اپنے قلم کا سودا کرنا ایسے شعر لکھنا جو قصیدے میں شمار ہوں اور پڑھنے سننے

والوں میں آگہی پیدا کرنے کے بجائے بزدلی اور ظالموں سے سمجھوتے کی للک پیدا کریں بقول اُن کے یہ صورت ہو تو ۔

بے ضمیری کا اور کیا ہو مآل　　　　اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

یہی انجام ہوگا اِس ظلمت پرستی کا دوسرا مظہر ہے سماجی ناانصافی اور پھر اُس ناانصافی کو برقرار رکھنے کے لئے بے پناہ ظلم و ستم ، لہٰذا حبیب جالبؔ اپنا رشتہ اُن مظلوموں سے جوڑتے ہیں جو اُس بے انصافی کا شکار ہوتے ہیں ۔

یہ بھی ایک عجیب و غریب اتفاق ہے کہ جب کوئی غیر منصفانہ نظام قائم ہوتا ہے خواہ وہ جاگیرداری کا ہو یا آمریت کا اُس کی ابتدا عورتوں کے استحصال سے ہوتی ہے عورت کو کھلونہ بنا کر نچانا آمروں اور سامنتوں کا پہلا کھیل ہوتا ہے بقول جالبؔ :

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا　　　　دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے چنوایا

اور اسی لئے عورت کی آزادی کا نعرہ حبیب جالبؔ کے یہاں جابجا ملے گا ۔　　　　(صفحہ ۲۲۸)

جہاں میں محبوس اب بھی ہم وہ حرم سرائیں نہیں رہیں گی
لرزتے ہونٹوں پہ اب ہمارے فقط دعائیں نہیں رہیں گی
غصب شدہ حق پہ چپ نہ رہنا ہمارا منشور ہو گیا ہے
اٹھے گا اب شور ہر ستم پر دبی صدائیں نہیں رہیں گے　　　　(صفحہ ۳۴۲)

محض اتفاق نہیں ہے کہ اہلِ اقتدار کی ہوس رانی کی شکار عورتوں کو حبیب جالبؔ نے موضوعِ سخن بنایا ہے 'نیلو' ہو یا ممتاز دونوں شاعر کے نزدیک قابلِ احترام ہیں کیونکہ وہ اُس غیر منصفانہ سماج کے اجارہ داروں کی ہوس کا شکار ہوئی ہیں ۔

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی　　　　رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیونکر　　　　سایۂ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے؟

یا وہ ہنگامی سی نظم جو ممتاز کے لئے کہی گئی ۔　　　　(صفحہ ۲۴۰)

قصرِ شاہی سے یہ حکم صادر ہوا لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو گیت گانے چلو ورنہ تھانے چلو . . . .
حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو ذہن پر چھائی ہو
جسم کی لَو سے شمعیں جلانے چلو ورنہ تھانے چلو　　　　(صفحہ ۳۸۳)

کم سے کم اُردو شاعری میں عورت کا یہ نیا پیکر ہے جو حبیب جالبؔ کی شاعری میں پہلی بار اُبھر

کر سامنے آیا ہے ورنہ اکثر عورت کے لب و رخسار کو سامان نشاط سمجھ کر ہی شاعری میں اُسے جگہ دی گئی ہے اور یہ بھلا دیا گیا ہے کہ اِس سامان نشاط کا اپنا کوئی انسانی وجود بھی ہے۔

عورت پر ظلم و ستم ہی نہیں اُس کے علاوہ دوسرے رجعت پسندانہ اقدامات کا جواز بھی غیر منصفانہ سماج اپنے نظام اقدار سے پیدا کرتا ہے اور یہ نظامِ اقدار اکثر یا تو مذہب کے غلط اور گمراہ کن تصور پر قائم ہوتا ہے جس کی بنیاد عصبیت اور تنگ نظری پر ہوتی ہے (جس کی علامت اُردو شاعری میں مولوی یا واعظ کو قرار دیا گیا ہے) یا پھر وطن پرستی کے غلامانہ اور استحصالی تصور پر ہوتی ہے۔ مذہب سے اہلِ اقتدار وہی مراد لیتے ہیں جو اُن کے استحصالی مقاصد کے کام آسکے۔ اِسی لئے اپنے ہر غیر منصفانہ اقدام کی سند میں مذہب اور مذہب کے تنگ نظر کٹھ ملاؤں کو پیش کرتے ہیں اور یہ کوئی پاکستان ہی کی خصوصیت نہیں۔ اس میں رجعت پسندی اور مذہب کا غلط تصور پیش کرنے والے پنڈتوں اور کٹھ ملاؤں کا سمجھوتہ رہا ہے حبیب جالب نے اس کے خلاف کھلم کھلا آواز اُٹھائی ہے اتنی کھلم کھلا کہ کبھی کبھی شاعرانہ لہجے کی نزاکتوں کی بھی پروا نہیں کی۔

داورِ حشر بخش دے شاید ہاں مگر مولوی سے ڈرتے ہیں (صفحہ ۱۳۴)

امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتویٰ
نہیں ہے دین فروشو، ہم پہ یہ کوئی نیا فتویٰ (صفحہ ۱۸۳)

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تقریر مولانا مگر بدلی نہیں اب تک مری تقدیر مولانا
زمینیں ہوں وڈیروں کی مشینیں ہوں لٹیروں کی خدا نے لکھ کے دی ہے یہ تمہیں تحریر مولانا (صفحہ ۱۸۵)

اسی ظلم کا ایک پہلو عورت پر مذہب کے نام پر لگائی گئی "چادر اور چہار دیواری" کی قدغن ہے جس کی رو سے عورت گویا مرد کی ملکیت قرار پائی ہے۔

رہا وطن پرستی کا تصور چنانچہ استحصالی طبقوں نے وطن دوستی کا معیار حکومتوں سے حمایت و وفاداری کو قرار دے رکھا ہے اور یہ بھول گئے ہیں کہ حکومتیں آتی جاتی ہوتی ہیں اور وطن کی محبت ابدی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جسے وطن سے پیار ہوگا (اور ظاہر ہے کہ وطن سے پیار کا مطلب وطن سے پیار نہیں بلکہ وطن کے لوگوں سے پیار ہے اور اُن کے لئے آرام و سکون فراہم کرنا اور ان کی مدد کرنا ہی اس کا معیار ہے) وہ لازمی طور پر وطن کے لوگوں کو معمولی معمولی سی سہولتوں سے محروم کرنے والوں کے خلاف اسی طرح بے جگری سے لڑے گا۔

اسی لئے ایک طرف حبیب جالب کے یہاں وطن سے بے پناہ محبت کا جذبہ ابلا پڑتا ہے۔

وطن سے الفت ہے جرم اپنا یہ جرم تا زندگی کریں گے
ہے کس کی گردن پہ خونِ ناحق یہ فیصلہ لوگ ہی کریں گے

میاں والی میرا لاہور میرا
مجھے لگتے ہیں سب منظر سہانے (صفحہ ۳۲۹)

ہر ایک شاخ پہ برق تپاں ہے رقص کناں
فضائے صحنِ چمن تجھ پہ رحم آتا ہے
قدم قدم پہ یہاں پر ضمیر بکتے ہیں
مرے عظیم وطن تجھ پہ رحم آتا ہے (صفحہ ۱۷۵)

اور وطن کی اسی محبت سے جاہ پرستوں اور غیر منصفانہ حکومتوں، غاصبوں اور آمروں کے خلاف وہ نبرد آزما ہے کیونکہ آمروں اور جابروں کے دور میں عوام کو عزت و توقیر نہیں ملتی ـــ مختلف تہذیبی منطقوں کو ان کا تشخص اور احترام نہیں ملتا۔ عوام کو ان کا جمہوری حق نہیں' عورتیں "چادر اور چہار دیواری" کے نام پر ہر قسم کے مظالم اور ناانصافیوں کا شکار ہوتی ہیں طلبا اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے پر لاٹھی، گولی کھاتے ہیں۔ ادیب' شاعر' دانش ور اور صحافی آزادیٔ تقریر و تحریر سے محروم ہو گئے ہیں اور خوشامد پر مجبور ہیں اور رقاصائیں اور نغمہ گر اربابِ اختیار کا آلۂ تفریح بن گئے ہیں گویا پورا سماج چند افراد کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا ہے اُس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ مختلف گروہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرتے ہیں اور لاٹھی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔

بڑے بنے تھے جالبؔ صاحب پٹے سڑک کے بیچ
گولی کھائی لاٹھی کھائی گرے سڑک کے بیچ
کبھی گریباں چاک ہوا اور کبھی ہوا دل خوں
ہمیں تو یونہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ
جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کسے سڑک کے بیچ (صفحہ ۳۴۴)

اسی کا ایک نتیجہ ہوتا ہے مختلف لسانی گروہوں اور مختلف تہذیبی علاقوں کے درمیان منافرت' کشیدگی اور آخرکار تصادم۔ لسانی گروہوں کے تصادم کی انتہائی شکل پاکستان کا ٹوٹنا اور بنگلہ دیش کا قیام ہے اور تہذیبی علاقوں کے درمیان منافرت کی شکل پنجاب کی بالادستی کے خلاف سندھ' بلوچستان اور صوبہ سرحد کا احتجاج ہے ـــ یہ دونوں تصادمات جمہوریت کے کچلنے اور عوام کے حقوق پر غیر منصفانہ اہلِ اقتدار کی بالادستی اور خود غرضی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان دونوں پر حبیب جالب نے سخت احتجاج کیا ہے۔

بنگلہ دیش پر اُن کی کئی نظمیں ہیں "بنگیا لہو لہان" شاید ان سب سے زیادہ اہم ہے اور "جاگ میرے پنجاب کہ پاکستان چلا" دوسری قسم کی منافرت کا واضح اظہار ہے ۔

محنت کو ذات کا غم ہے کب وہ مانے ہیں　　بے بس لوگوں پر بندوقیں تانے ہیں
قاتل ہیں اسباب کہ پاکستان چلا　　جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
اِنہی چلن سے ہم سے جُدا بنگال ہوا　　پوچھ نہ اس دُکھ سے جو دل کا حال ہوا
روکو یہ سیلاب کہ پاکستان چلا　　جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا (صفحہ ۱۰۲)

ناانصافی، جبر اور لوٹ مار پر مبنی اس نظام کی پشت پر صرف کسی ملک کے دولت بٹورنے والے اور اس ملک کی فوجی ٹولی ہی نہیں ہوتی اس کی پشت پناہی کرتی ہیں عالمی طاقتیں اور خاص طور پر سامراجی حکومتیں ۔ یہ داستان پرانی ہے گو آج کل ان سامراجی طاقتوں کا اکلوتا علمبردار اور محافظ ہے امریکا ۔ لہٰذا کچھ تعجب کی بات نہیں کہ امریکہ اور اُس کے مختلف سربراہوں کا ذکر حبیب جالب نے کھل کر کیا ہے اور کہیں کہیں اس طرح کیا ہے کہ شاعری صحافت کی سطح پر اُتر آئی ہے مگر ان کا احتجاج بجا ہے اور استحصال کے ان رشتوں کو دیکھنے میں اُن کی نظر دھوکا نہیں کھاتی ۔

طوافِ کوئے ملامت کو پھر نہ جائے دل　　نہ اپنے ساتھ ہماری بھی خاک اُڑائے دل

امریکہ یاترا کے خلاف

دنیا بھر کے مظلوموں نے بھید یہ سارا جان لیا　　آج ہے ڈیرا زرداروں کے سایے تلے امریکا
(صفحہ ۱۹۴)

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا　　تو جینا کس قدر آسان ہوتا
مرے بچے بھی امریکا میں پڑھتے　　میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا (صفحہ ۱۸۳)

غرض استحصال کی اس کالی دیوار کے ہر سلسلے کو حبیب جالب نے اچھی طرح جانا پہچانا ہے ۔ یہ دراصل وہ دیوار ہے جو انسانی ارتقا کے راستے میں کھڑی ہے اور عام انسانوں کو روزی روٹی اور زندگی کی معمولی اور فطری مسرتوں سے محروم کرتی ہے اُس کے ایک کنارے پر ذاتی منافع اور خود غرضی کا بھوت ہے جو طاقت بن کر عام انسانوں کو جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے اور اُنہیں جہالت، بیماری اور مفلسی کے عذابوں میں مبتلا رکھتا ہے تو دوسری طرف اُنہیں متحد نہ ہونے کے سبھی جتن ہیں تاکہ وہ مل جل کر اپنے حقوق کے لئے آواز بلند نہ کر سکیں انہی تدبیروں میں ایک تدبیر ہے مذہب کے نام پر دقیانوسیت اور تقدیر پرستی، جہالت اور اندھی توہم پرستی کی ترویج جو کٹھ ملائیت کے ذریعے فروغ پاتی ہے اور عورتوں کو چادر اور چہار دیواری میں مقید کرتی ہے اور نوجوانوں کے لئے

ظالم حکمرانوں کی اطاعت کا فرمان نافذ کرتی ہے۔ دوسری تدبیر ہے علاقائیت کے نام پر نفرت بھڑکانا تاکہ ایک علاقے کے مظلومین دوسرے علاقے کے مظلومین سے مل جل کر اپنا حق طلب نہ کرسکیں اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کیا جاسکے۔ تیسری تدبیر ہے ضمیر کی خریداری جس کے ذریعہ اہلِ علم، شاعر، ادیب اور دانشوروں کی خرید وفروخت ہوتی ہے اس کے ذریعہ شعور پر اہلِ اقتدار اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں اور ہر طرح کی گمراہی کو قبولیت کی سند بخشتے ہیں اس کے علاوہ وطن پرستی کا حربہ ہے جس کو وہ وطن کی دہائی دے کر حکومت وقت کی حمایت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور جو اُن کی مخالفت کرے یا استحصال کے خلاف آواز اُٹھائے اُسے وطن کا غدار قرار دیتے ہیں اور پھر جو اُن سب حربوں سے بچ نکلے اس کے لئے لاٹھی۔ گولی۔ جیل خانے۔ اور پھانسی کے پھندے۔ اور جبر کے اس پورے ساز وسامان کی پشت پناہی کرنے والے محض پولیس کے سپاہی اور فوج کے جوان ہی نہیں ہیں عالمی سامراج کی پوری طاقت ہے جس کا علمبردار ہے امریکا اور اس کی دولت وثروت، اس کی فوجی طاقت اور نیوکلیائی قوت۔

اور ان سب کے مقابل ہیں صف آرا ہیں ننگے بھوکے عوام جن کے پیٹ پر روز لات ماری جارہی ہے جو لگاتار ظلم اور استحصال کا شکار ہیں اور اُن کے پاس کوئی طاقت ہے تو صرف یقین اور اعتماد کی طاقت ہے کہ انسانیت کبھی کبھی ٹوٹ تو گئی ہے مگر کبھی جھکی نہیں ہے اور فتح انہیں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ہوتی آئی ہے جو تمام ظلم وجبر کے باوجود تاریخ کے دھارے کو فیصلہ کن انداز میں موڑتے رہے ہیں اور آئندہ بھی موڑیں گے۔ اُس کا ذریعہ کیا ہوگا یہ بھی حبیب جالب کے ذہن میں واضح ہے ایک اتحاد اور وہ بھی محض علاقائی یا محض قومی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مظلوموں کا اتحاد۔

ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے
لیکن اِن دونوں ملکوں میں امریکا کا ڈیرا ہے (صفحہ ۱۹۵)

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی — اُٹھائے ہاتھوں میں اپنے حسینیت کا علم
ادیبو، شاعرو، دانش ورو، سخن دانو — کرو حکایت بیروت خونِ دل سے رقم (صفحہ ۲۴۶)

اور دوسری طاقت ہے جبر کے مقابلے جمہوریت اور عوام کی مقاومت۔ جس کے بارے میں حبیب جالب میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہے

نہ گفتگو سے نہ وہ شاعری سے جائے گا — عصا اُٹھاؤ کہ فرعون اُسی سے جائے گا
(صفحہ ۱۴۴)

یہ مختصر سی جھلک ہے حبیب جالب کے زاویۂ نظر کی جس نے اُن کی شاعری اور شخصیت میں اعتماد کی وہ شمعیں روشن کی ہیں جو ہر ظلم و جبر کے باوجود جگمگاتی رہی ہیں۔

بلاشبہ اس طویل رزم نامے میں ایسے موڑ بھی آئے ہیں جب اُن کی آواز شاعر سے کہیں زیادہ سیاسی کارکن کی آواز بن گئی ہے اور شاعری کی لطافت اور بلندی صحافت اور وقتی نعروں تک آگرائی ہے گو ان مواقع پر بھی ان کے ہاں روانی، برجستگی اور کاٹ قائم رہی ہے۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا (صفحہ ۱۳۳)

بیس گھرانے ہیں آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب زندہ باد (صفحہ ۱۴۲)

روشنیوں کی راہ میں جو دیوار بنے گا نہیں رہے گا
غاصب کو غاصب جو کھل کر نہ کہے گا نہیں رہے گا (صفحہ ۲۳۶)

لیکن اُس کے باوجود حبیب جالب کی شاعری کا جمالیاتی حسن نکھرتا ہے جب وہ ظلم اور جبر کی اس فولادی دیوار کے مقابلے میں اپنی معصومیت اور نرمی کے ساتھ صف آرا ہوتے ہیں یعنی ایسا شاعر جو صرف محبت اور حُسن کے نغمے گانا چاہتا ہے ایسا انسان جو اپنی ننھی بچی سے پیار کرنے کی آزادی چاہتا ہے جو اپنے گھر بار کی مسرتوں کے لئے تڑپتا ہے جبر و استحصال کے ہاتھوں لاٹھی گولی زندان اور دار و رسن کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے کے لئے مجبور ہوتا ہے اور اُس کے مقابلے میں اس کے پاس اپنے معصوم اعتماد اور انصاف کے سوا اور کچھ نہیں ہے ذرا ان اشعار کو دیکھئے ایک نظم ہے ہتھکڑی۔

اس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی — میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی
یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے — یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے
کس قدر زندگی کا سہارا ملا — ایک تابندہ کل کا اشارہ ملا (صفحہ ۳۱۰)

دوسری نظم ہے ننھی جا سو جا،

جب دیکھو تو پاس کھڑی ہے ننھی جا سو جا
تجھ بلاتی ہے سپنوں کی نگری جا سو جا
غصے سے کیوں گھور رہی ہے میں آجاؤں گا
کہہ جو دیا تیرے لئے اک گڑیا لاؤں گا
گئی نہ ضد کرنے کی عادت تیری، جا سو جا
ننھی جا سو جا (صفحہ ۲۷۸)

تیسری نظم ہے میری بچی

میری بچی میں آؤں نہ آؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا۔۔۔۔
تیری آشا کی بگیا کھلے گی
چاند کی تجھ کو گڑیا ملے گی
تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہوگا ستم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا (صفحہ ۲۷۱)

یہ رنگ حبیب جالب کا سچا رنگ ہے اُن کی شخصیت کا اصل روپ یہی ہے اور جو منظر اُن کی نظم "ایک یاد" میں کھینچا گیا ہے اس کی ٹھنڈک اور نرمی ہی سے اُن کی مجاہدانہ شخصیت کے جوش و لولے اور اعتماد نے قوت اور دوام پائے ہیں۔

کچے آنگن کا وہ گھر وہ بام و در
گاؤں کی پگڈنڈیاں وہ رہ گزر
وہ ندی کا سرمئی پانی شجر
جا نہیں سکتا، بجا، ان تک مگر
سامنے رہتے ہیں وہ شام و سحر

یہ ہیں وہ حبیب جالب جنھیں بقول شاعر حُسن سے بھی لگاؤ ہے جنھیں زندگی بھی عزیز ہے اور حُسن سے اسی گہرے لگاؤ اور زندگی سے اسی مجاہدانہ وابستگی نے عصرِ نو کی آگ میں وہ پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو مدتوں عالم کو مہکاتی رہے گی۔ یہ افتخار کم نہیں کہ اس جیالے شاعر اور اس کجکلاہ مجاہد کے نغمے اُردو کے حصے میں آئے ہیں۔

(دہلی ۱۴، اکتوبر ۱۹۸۹ء)

حبیب جالب سے میری پہلی ملاقات عجیب سے حالات میں ہوئی ۔ یہ غالباً ۱۹۶۲-۶۳ء کا واقعہ ہے ۔ میں اور مولانا صلاح الدین احمد دفتر "ادبی دنیا" کی سیڑھیاں اُتر کر شاہراہِ قائدِ اعظم کے فٹ پاتھ پر پہنچے ہی تھے کہ ہماری نظریں ایک ایسے پریشان حال شخص پر پڑیں جو بڑے کرب سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا :" وہ ہمارے بچوں پر لاٹھیاں برسا رہے ہیں ، لاٹھیاں برسا رہے ہیں بچوں پر لاٹھیاں برسا رہے ہیں" ! ساتھ ہی ساتھ خود اُس کی آنکھیں بھی آنسو بہا رہی تھیں اور وہ شخص اُن آنسوؤں کو پونچھنے کی ضرورت محسوس نہ کر رہا تھا جو اُس کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر اُس کی بڑھی ہوئی داڑھی کو بھگوتے ہوئے اُس کے ہونٹوں میں جذب ہو رہے تھے ۔ مولانا نے اُس شخص کو دیکھ کر فقط اتنا کہا :" یہ حبیب جالب ہے"۔ پھر کسی نے جیسے سرگوشی میں کہا ۔ " بڑے ڈاک خانے کے قریب پولیس اور طلباء میں تصادم ہو گیا ہے ۔"

اور اَب میں سوچتا ہوں کہ اُس روز میں نے حبیب جالب کا جو رُوپ دیکھا وہی شاید اُس کا اصل رُوپ تھا ۔ وجہ یہ کہ حبیب جالب فقط اُس ایک روز ہی نہیں رویا بلکہ بعد ازاں بھی مسلسل آنسو بہاتا رہا ہے ۔ خود اُس کی شاعری بھی ایک ایسے احساسِ زیاں سے عبارت ہے جو بیک وقت شخصی بھی ہے اور غیر شخصی بھی ۔ شخصی کیونکہ باہر کا نقصان بھی اُس کے لئے شخصی نقصان کا درجہ رکھتا ہے اور غیر شخصی کیونکہ ہر چند اُس نے کڑے وقت اور سخت ایام میں بھی جسم و روح کے رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے تاہم اُس نے اپنے دُکھوں

کی نمائش کبھی نہیں کی ۔ بلکہ قومی سطح کے دکھوں کو ہمیشہ شخصی معاملات پر فوقیت دی ہے آپ اس کے سیاسی نظریات سے اختلاف تو کر سکتے ہیں ۔ (اور اختلاف کرنا بھی چاہیے) مگر اس کے کرب اور درد سے انکار نہیں کر سکتے ۔ جو اس کی پلکوں پر آنسو بن کر جھلملاتا اور قلم کی نوک سے لفظوں کے انگارے بن کر ٹپکتا ہے ۔ اس درد پر آپ کسی خاص نظریے کی تختی آویزاں نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ یہ درد بے چہرہ اور بے لباس ہے ۔ نہ اس کا کوئی متعین مسلک ہے اور نہ مشتہر مذہب ! یہ ایک خالص انسانی جذبہ ہے جو جبلت پر تہذیب کی فتح کا اعلامیہ ہے اور قدرت کی طرف سے حبیب جالب کو یہ انسانی جذبہ اتنی بڑی مقدار میں ملا ہے کہ وہ خود مجسم جذبہ بن گیا ہے ۔ لہٰذا حبیب جالب کی شاعری جذبے کی ترسیل کا منظر نہیں دکھاتی بلکہ بجائے خود جذبے کا بے محابا اظہار ہے ۔ اسی میں حبیب جالب کی جیت ہے کہ وہ اندر اور باہر سے ایک ہے اور جس شدت سے وہ کسی بات کو محسوس کرتا ہے اسی شدت سے اس کا برملا اظہار کرنے پر قادر بھی ہے ۔

وحید قریشی

حبیب جالب کا شعری سفر

حبیب جالب نے اپنی شاعری کا آغاز ایک غزل گو کی حیثیت سے کیا تھا۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام برگِ آوارہ میں شعری تحریک کے حوالے سے تین ترکیبیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ برگِ آوارہ۔ ایک ایسی علامت ہے جسے شاعر کبھی اپنی ذات اور کبھی اپنے معاشرے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ محبت کی اُجڑتی ہوئی بستی میں برگِ آوارہ کے علاوہ سنسان گلیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ماضی کی یادیں اُسے بچھڑی ہوئی راہوں کی یاد دلاتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی ناصر کاظمی کی طرح NOSTALGIA کا شکار ہوتا ہے اور چھوڑی ہوئی بستیاں، گمشدہ محبت کی وادیاں اسے بار بار اپنے ماضی میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہیں۔ عشق و محبت کی اس دنیا میں جسے حبیب جالب نے بسایا تھا شوقِ آوارگی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلک، غیر ہے یہ زمیں، کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی

ہم آوارہ گاؤں گاؤں بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت بڑھا کر کوئی مفت میں کیوں غم کو اپنا لے

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے　　　ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

اُس دیس کا رنگ انوکھا تھا اُس دیس کی بات نرالی تھی
نغموں سے بھرے دریا تھے رواں گیتوں سے بھری ہریالی تھی
وہ روشن گلیاں یاد آئیں وہ پھول وہ کلیاں یاد آئیں
سندر من چلیاں یاد آئیں ہر آنکھ مدھر متوالی تھی

حبیب جالب کی یادوں کا یہ سلسلہ اسے بار بار تقسیم برصغیر سے پہلے کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ عشق و محبت کی یہ یادیں بعض اوقات اُسے گیتوں کی فضا میں لے جاتی ہیں۔ اس کا محبوب کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا۔ غزل کی نازک دنیا اس کا اتا پتا دینے سے قاصر ہے۔ شاعر کا لہجہ اور لفظوں کا انتخاب بار بار ایک خاص قسم کی ہندوانہ فضا کی طرف متوجہ کرتا ہے یہ محبوب اور اس کی محبت زمانے کی بھینٹ چڑھ گئے اسی لئے حبیب جالب بار بار زمانے کو بے درد قرار دیتا ہے اور سرمایہ داروں کو کوستا ہے۔ اس کا رقیب شاید اسی دولت مند طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لئے رنگ برنگ کاروں کو دیکھ کر حبیب جالب بھی اپنا دل تھامنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ امیر طبقے کے خلاف بغاوت کا یہ شخصی جواز حبیب جالب کے اولیں مجموعہ کلام برگِ آوارہ سے بخوبی برآمد ہوتا ہے وہ ایک ناکام عاشق ہے جس کی محبت اُسے دوراہے پر چھوڑ گئی ہے۔

گلشن کی فضا دھواں دھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے
بکھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
ٹوٹی ہوئی شاخِ آشیاں ہے

جس دل سے ابھر رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے
ہم ہی نہیں پائمال تنہا
لتے وحشت تباہ اک جہاں ہے

ذاتی عشق کی یہ توسیع غم جاناں سے غم روزگار کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعر ہجر کی تنہا راتوں میں پوری کائنات کو اپنے آس پاس ویران دیکھنے لگتا ہے۔

حسرت سی برستی ہے درو بام پہ ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں
وہ لوگ قدم جن کے لئے کہکشاں نے
وہ لوگ بھی لُٹے ہم نفسو ہم سے بسر ہیں

شہر ویران اُداس ہیں گلیاں
رہگزاروں سے اُٹھ رہا ہے دھواں
بستیوں پر غموں کی یورش ہے
قریہ قریہ ہے وقفِ آہ و فغاں
صبح بے نور شام بے مایہ
لٹ گئی دولتِ نگاہ کہاں

اپنے ذاتی غم کو پوری کائنات کا غم بتانے کی یہ کوشش صرف ان غزلوں میں نمایاں نہیں جو ہندی آمیز ہیں بلکہ ان غزلوں میں بھی ظاہر ہے جن میں فارسی کا اثر زیادہ نمایاں ہے سبب شاید یہ ہے کہ غالب کا عشق نہایت مختصر زمانے پر حاوی ہے اور محرومی کے دنوں میں انہوں نے اپنے تخیل کی مدد سے بعض خلاؤں کو پُر کیا ہے۔ یہ فلاطونی محبت اس بات کی

علم نہ ہے کہ شاعر اپنی آوارگی اور بدنامی کو بھی ایک مستقل جذباتی رویے کے طور پر قبول کر کے پھیلاتا چلا جاتا ہے حالانکہ وہ جس پھول کی باتیں کرتا ہے اس کے اپنے الفاظ میں وہ اس پھول کو چھونے میں بھی ناکام رہا ہے ۔

اُس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب
اس پھول کو چھونے میں بھی ناکام رہے ہم
صحن گلشن میں کہ انجم کی طرب گاہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں جانے کہاں دیکھا ہے

ہم ہنسے تو آنکھوں میں تیرنے لگی شبنم
تم ہنسے تو گلشن نے تم پہ پھول برسائے
اُس گلی میں کیا کھویا اُس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے تشنہ کام لوٹ آئے
پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج پھیلتے ہوئے سائے

شوق آوارگی میں کیا نہ ہوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہوا
اُس کے آنچل کو چھو رہی ہے صبا
وائے قسمت کہ میں صبا نہ ہوا

حبیب جالب کی عشقیہ شاعری گہری جذباتی وابستگی کے باوجود ایسی شاعری ہے جس

میں محبوب کے جسم کی علت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ عشق و محبت کی دنیا میں وہ ہر اچھے آئیڈیل کو محبوب کی ذات سے وابستہ کر کے دیکھتے ہیں اس لئے ان کی حیثیت جذباتی طور پہ ایک ایسے انسان کی ہے جو راستے میں بھٹک رہا ہے اور جسے اپنے جذباتی ہیجانات کی کسی معین سمت کا سراغ نہیں مل رہا۔ جالب کی ذات کا یہ روپ اس کی سیاسی زندگی میں بھی اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کی حیثیت اپنی داخلی دنیا پہ نظر ڈالتے ہوئے ایک ایسے شاعر کی بن جاتی ہے جس کا دل اس کے پہلو میں سہما ہوا ہے اور اندھیرے اسے چاروں طرف اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔

دل ہے اب پہلو میں یوں سہما ہوا
جیسے کٹیا میں دیا جلتا ہوا
پھر رہا ہوں یوں تری گلیوں سے دور
جیسے کوئی راستہ بھولا ہوا

محبوب کے متاعِ غیر بن جانے سے جالب جو منطقی نتیجہ نکال سکتا ہے وہ یہی ہے کہ امیر طبقہ غریبوں کا استحصال کر رہا ہے۔ اپنے داخلی خول سے نکلنے کے لئے تخلیقی سطح پہ وہ صرف دو راستے ہی اختیار کر سکتا تھا کہ فکری تفصیلات کیلئے وہ اپنے آپ کو کسی ایسے فلسفے سے وابستہ کر لے جو اس داخلی طبقاتی جنگ کو خارجی سطح پر لانے میں کامیاب ہو۔ دوسری طرف فنی لحاظ سے تلافی کی صورت یہ تھی کہ شاعر ایسی زبان، ایسا لہجہ پیدا کرے جو اسے اپنی ذات کے خوف سے نجات دلا کر للکار سے ہم کنار کر سکے۔ اس کے لئے حبیب جالب کو غزل کا راستہ ترک کر کے نظم کی طرف بھی آنا پڑا ہے اسے یہ احساس بار بار ستاتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت ایک بے یار و مددگار انسان کی ہے۔

میں بھی ہوں تری طرح سے آوارہ و بے کار
اڑتے ہوئے پتے مجھے ہمراہ لئے چل

یہ احساس اس کے لئے اکثر زنجیر پا ثابت رہا ہے اس لئے برگِ آوارہ کے بعد غزل اور اس کے وہ تلازمات جو اُسے ماضی کی طرف لے جاتے تھے ان سے وہ گھبرا اٹھا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ لیڈر کے خطابیہ ذرائع کا زیادہ مشتاق ہو گیا ہے کیونکہ داخلی خوف کو اپنی ہی "بڑھک" کی مدد سے دہلانے کے لئے اس سے زیادہ کامیاب اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ وہ شاعر جس کا دل داخلی طور پر کسی چڑیا کی موت بھی برداشت نہیں کر سکتا، جوشِ بیان میں نجوم سے ان کی تابش چھیننے کا پروگرام بھی رکھتا ہے۔ یہاں میں کی بجائے ہم کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ہم اُن نجوم کی تابش بھی چھین سکتے ہیں
بنا دیا ہے جنہیں فخرِ آسماں، ہم نے

یہ اجتماعی لہجہ سرِ مقتل، عہدِ ستم اور گوشے میں قفس کے میں بہت نمایاں ہے۔ میں سے ہم تک کا یہ سفر حبیب جالب کے ہاں اس کی جذباتی زندگی کے لئے ایک نیا امکان کو بھی ظاہر کرتا ہے اور اُسے سماجی زندگی میں گم ہونے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ طبیعت کے اعتبار سے جالب نہ فلسفیانہ اُفتادِ طبع رکھتا ہے نہ اس کا ذہن کاروباری ہے اس لئے مارکسی فلسفے کی تفصیلات سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ انقلاب اور اس کے اسباب وعلل سے حبیب جالب کی جذباتی زندگی کوئی واضح منطقی ربط نہیں رکھتی اس کے لئے تو پرچم لہرانے اور سٹیج پر اپنے گرد ٹھاٹھیں مارتے ہوئے عوام کے سامنے ایک پیغمبرانہ لہجہ اختیار کر کے جذباتی سکون حاصل کر لینا کافی ہے ایک فن کار کی حیثیت سے البتہ جالب کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ جوش یا فیض کی طرح مزدور کے ہل پر سونے چاندی کے ورق نہیں چپکاتا۔ اس نے اعلیٰ طبقے اور ادنیٰ طبقے کے درمیان منافقت کے پردے حائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی ذات سے باہر اُسے جو کائنات ملتی ہے اُسے بڑی دیانت داری سے پیش کرنے کا عزم کیا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہے۔ خطابیہ شاعری میں عموماً کمی یہ ہوتی ہے کہ اس میں شوکت

الفاظ کی طرف شاعر کا دل زیادہ لپکتا ہے، لیکن جالب نے اس سستے ذریعۂ ابلاغ کو بہت زیادہ نہیں برتا۔ خشک بیانیہ طریق مخاطب کو وہ عوامی سوچ سے ایک اور طریقے سے منسلک کرتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی سے چھوٹے نکات، لفظوں کی تکرار سے جذباتی اُتار چڑھاؤ کی نشاندہی اور دبی دبی گفتگو میں کوئی تیکھا طنزیہ روپ تلاش کرنا حبیب جالب سے خاص ہے۔ فلمی دنیا سے کچھ عرصہ لگاؤ کی بنا پر اسے گیت کے کلیدی مصرعے کی طرح نظموں میں ایک خاص کلیدی پیرایہ پیش کرنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ ایسے میں اس نے قوافی سے محض صوتی آہنگ کا کام نہیں لیا بلکہ قافیوں کو نظم کی جذباتی بافت میں ایک ناگزیر ضرورت بنا دیا ہے۔

ایسے دستور کو صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا (سرِ مقتل)

اے خموشی طوفانو
دس کروڑ انسانو

پاکستان کی غیرت کے رکھوالو
بھیک نہ مانگو
توڑ کے اس کشکول کو آدمی کہلاؤ
بھیک نہ مانگو

ایک ہی نعرہ ہے سب کا ایک ہی سب کی صدا
صدر امریکہ نہ جا اے صدر امریکہ نہ جا

اس کلیدی مصرعے کے استعمال کے علاوہ حبیب جالب کا دوسرا کامیاب حربہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کو نشانہ بنانے کا ہے۔ ادیبوں کے بک جانے کو حبیب جالب نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ صحافی، پیشہ ور، خوشامدی، انعام حاصل کرنے والے شعرا دسب اس کی طنز کا نشانہ بنتے ہیں اس لئے کہ حبیب جالب خود اس راستے میں لیکاڈ مال نہیں بنا اور اس نے ہر کڑے وقت میں اپنے دامن کو آسودہ ہونے سے بچایا ہے۔

اب شعر وہی ہے اے جالب جس پر کوئی افسر جھوم اٹھے
گر ایسی غزل ہے بسم اللہ دفتر کا دفتر جھوم اٹھے
جینا ہے اگر اس بستی میں اے دوست قصیدہ خواں ہو جا
اخبار میں لکھ ایسی باتیں صاحب کا سکتر جھوم اٹھے

ذہانت رو رہی ہے منہ چھپائے
جہالت قہقہے برسا رہی ہے
ادب پر افسروں کا ہے تسلط
حکومت شاعری فرما رہی ہے

لحد میں پاؤں ہیں اور مر رہے ہیں
مگر پھر بھی خوشامد کر رہے ہیں
خدایا بہ معمر اہل حاجت
تیرے بندوں سے کتنا ڈر رہے ہیں

بڑھاپے میں تو سر ہلتا ہے یوں ہی
سر اُن کا تو پرانا ہل رہا ہے

انہیں آتا ہے ہم کو پیچ دینا
اسی باعث وظیفہ مل رہا ہے

سرِ مقتل اُس دور سے تعلق رکھتا ہے جب ایوب خاں کے خلاف پبلک میں آوازیں اُٹھنی شروع ہو گئی تھیں۔ حبیب جالب انہیں آوازوں کا نقیب ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حبیب جالب مارکسی نظریات کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ ایوب خاں کے آخری زمانے میں ملک کو جو مسائل درپیش تھے خارجہ پالیسی میں ویت نام، فلسطین، چین، امریکہ کے بارے میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ پیپلز پارٹی اور بعض دوسری بائیں بازو کی جماعتوں کے خیالات پر منحصر ہے۔ اس زمانے میں ہر غیر انتہا پسند کو امریکی ایجنٹ قرار دینے کا بڑا رواج تھا۔ حبیب جالب کا جارحانہ رویہ بھی اپنے جلو میں اسی طرح کی تفصیلات رکھتا ہے جو اس زمانے کے اخبارات میں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ ان نظریات کے پیچھے کارفرما عوامل کا تجزیہ سرِ مقتل میں نہیں ملتا۔ حبیب جالب کی جذباتی تکمیل کے لئے ان تفصیلات کی ضرورت بھی نہیں۔ اُسے تو اپنے جذباتی ہیجان کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر قلبی تسکین فراہم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کے بدلتے ہوئے دھارے میں جالب خلوص کی تلاش میں اپنی سیاسی پارٹیاں بدلنے پر مجبور ہوتا رہا۔ سرِ مقتل میں ذوالفقار علی پر نظم لکھنے والا شاعر "گوشے میں قفس کے" میں آکر پیپلز پارٹی کے خلاف جارحانہ رویہ رکھتا ہے لیکن اس کی جذباتی زندگی اس تبدیلی کے باوجود سرِ مقتل، عہدِ ستم اور گوشے میں قفس کے تک ایک مربوط جذباتی اکائی رکھتی ہے اور ذوالفقار علی کے عنوان سے یہ اشعار کہنے والا

ہمارے ہاتھ میں جب تک ہے ذوالفقار علی
کوئی ہمارے سروں کو جھکا نہیں سکتا
دیارِ پاک ہے انعام ذاتِ باری کا
اسے جہاں سے کوئی مٹا نہیں سکتا

یہ بھی کہنے پر قادر ہے۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشین تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقین تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

اور پھر

چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

"عہد ستم" میں جالب کے پیش نظر زیادہ تر جمال عبدالناصر، لینن، حسن ناصر شہید رہے ہیں اور پاکستان کے بارے میں انہوں نے باتیں کم کی ہیں۔ یہاں بھی فلمی دنیا والی تکنیک بروئے کار ہے اور ٹیپ کے مصرعے اسی طرح ایک خاص فضا بناتے ہیں۔

پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

خطرے میں اسلام نہیں

قائدِ اعظم دیکھ رہے ہو اپنا پاکستان

قائدِ اعظم دیس میں تیرے بیس روپے من آٹا ہے
قائدِ اعظم دیس میں تیرے چاروں جانب سناٹا ہے

یہ بولتے ہوئے مصرعے حبیب جالب کی نئی بصیرت کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان

نہ اس کی ذات بہت پیچھے چلی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے شاعر ہنگامی باتیں کرتا زیادہ ضروری سمجھتا ہے اور اس کا مقصد اپنے داخلی رویے کو اجاگر کرنے سے زیادہ دوسروں کے احساسات کی ترجمانی ہے۔

"گوشے میں قفس کے" شاعری کی آخری تکمیلی صورت اس وقت تک ملتی ہے۔ یہاں جالب کے اندر چھپا ہوا انسان ایک بار پھر انگڑائی لیتا ہے۔ شاید اس لئے کہ قید و بند کے تجربات نے اسے اولاد کی محبت اور بیوی کی آزمائشوں کا احساس دلایا ہے۔ یہاں طنز بھی بھرپور وار والی کیفیت چھوڑ گیا ہے اس کی جگہ ایک نرم اور ہموار طنزیہ رویے نے لے لی ہے۔

یہ لہجہ شاعر کی طبعی ذاتی زندگی سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس لحاظ سے "گوشے میں قفس کے" میں وہ تھی جان جا سوجا" شاعر کے ذاتی دکھ کے علاوہ ایک ایسے طرز احساس کی نمائندگی کرتی ہے جہاں شاعر محض جم غفیر کو خطاب کرتا ہوا لیڈر نہیں بلکہ اس کی اپنی ذات کے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اس مرحلے پر آکر جالب کے کلام میں ایک خاص طرح کا توازن آگیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس مجموعے میں نظموں کی بجائے غزلوں میں شاعر کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اچھی شاعری کے لیے محض مخلص ہونا کافی نہیں حبیب جالب کو اس کا احساس ہو چکا ہے اس لیے اُسے اپنے سیاسی عقائد کو ذات کے حوالے سے دیکھنے کا ہنر ڈھنگ آگیا ہے۔

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے
خامشی پر ہیں لوگ زیرِ عتاب
اور ہم نے تو بات بھی کی ہے
مطمئن ہے ضمیر تو اپنا
بات ساری ضمیر ہی کی ہے

اپنی تو داستاں ہے بس اتنی
غم اُٹھاتے ہیں شاعری کی ہے

"برگِ آوارہ" سے "گوشے میں قفس کے" تک کے اس شعری سفر میں واقعی حبیب جالب نے غم بھی اٹھائے ہیں اور شاعری بھی کی ہے۔ اس میں ایسی منزلیں بھی آئیں جب شاعر مقبولیت کے نشے میں مخلص عوام کے جذبات کا ترجمان ہوا لیکن آخرکار اُسے یہ احساس ہوگیا کہ اپنے داخلی روّیے کی شرکت کے بغیر لیڈری تو چل سکتی ہے شاعری کا دھندا چلانا مشکل ہے۔ اب اگر وہ نعرہ زنی بھی کرتا ہے تو اُس میں پھیپھڑوں کے علاوہ خونِ جگر بھی شامل ہوتا ہے۔ آج کا حبیب جالب سیاست اور سماجی حالات کو شاعری بناتے ہوئے فکر و احساس کی باریکیوں کو منتقل کرنے میں بھی کامیاب ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں عطا تو رکھتا ہے لیکن یہ عطا محض لٹھ مارنے کے لیے نہیں اس میں شاعر کی قوتِ بازو کے علاوہ اس کا جذباتی روّیہ بھی شامل ہے

کلام جالب
غزلیں

★
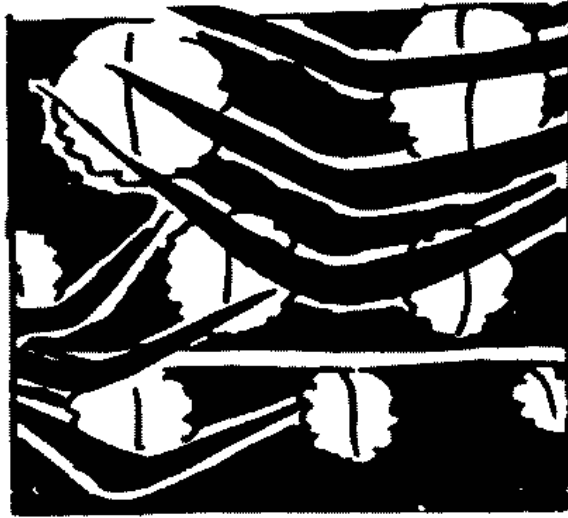
ب نہ وہ غزل اپنی اب نہ وہ بیاں اپنا
راکھ ہو گیا جل کر ہر حسیں گماں اپنا

وہ چمن جسے ہم نے خونِ دل سے سینچا تھا
اس پہ حق جتاتی ہیں آج بجلیاں اپنا

بجلیوں نے دنیا کو کچھ سکون تو بخشا
ہم بنانے لیتے ہیں اور آشیاں اپنا

کچھ دنوں رہی تو ہے داستانِ دل رنگیں
کچھ دنوں رہا تو ہے کوئی ہم زباں اپنا

س دیار کی راتیں نغمہ ریز برساتیں
ہر نظر شراب آلود ہر نفس جواں اپنا

نزلوں نہیں ملتا کوئی سایۂ دیوار
کس کے پاس جائیں ہم کون ہے یہاں اپنا

سرزمیں دوآبے کی ہم سے چھن گئی جالب
آج تک اسی غم میں دل ہے نوحہ خواں اپنا

★

اس نے جب ہنس کے نمسکار کیا
مجھ کو انسان سے اوتار کیا

دشتِ غربت میں دلِ ویراں نے
یاد جمنا کو کئی بار کیا

پیار کی بات نہ پوچھو یارو
ہم نے کس کس سے نہیں پیار کیا

کتنی خوابیدہ تمناؤں کو
اس کی آواز نے بیدار کیا

ہم پجاری ہیں بتوں کے جالب
ہم نے کعبے میں بھی اقرار کیا

اور سب بھول گئے حرفِ صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا

لاکھ کہتے رہیں ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا
ہم نے سیکھا نہیں پیارے بہ اجازت لکھنا

نہ صلے کی نہ ستائش کی تمنا ہم کو
حق میں لوگوں کے ہماری تو ہے عادت لکھنا

ہم نے جو بھول کے بھی شہ کا قصیدہ نہ لکھا
شاید آیا اسی خوبی کی بدولت لکھنا

اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کیا ہوگی
پڑھ کے ناخوش ہیں مرا صاحبِ ثروت لکھنا

دہر کے غم سے ہوا ربط تو ہم بھول گئے
سرو قامت کو جوانی کو قیامت لکھنا

کچھ بھی کہتے ہیں کہیں شہ کے مصاحب جالبؔ
رنگ رکھنا یہی اپنا اسی صورت لکھنا

پھول سے ہونٹ چاند سا ماتھا
ہم نے بھی ایک خواب دیکھا تھا

کوئی بات ان لبوں تک آئی تھی
کوئی غنچہ ضرور چٹکا تھا

رات صحنِ خیال میں جالبؔ
اک عجب شخص رقص فرما تھا

تباہیوں پہ بھی دل کو ذرا ملال نہ تھا
خوشا وہ دور کہ جب نیت کا خیال نہ تھا

کہاں کہاں مری نظروں کو اک تلاش نہ تھی
کہاں کہاں مرے ہونٹوں پہ اک سوال نہ تھا

تری نگاہ سے کوئی گلہ نہیں اے دوست
تری نگاہ کے قابل ہمارا حال نہ تھا

کہاں گیا وہ زمانہ کہ جب ہمیں جالب
خیالِ دہر نہ تھا فکرِ ماہ و سال نہ تھا

★

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنھیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

آج سوئے ہیں تہِ خاک نہ جانے یہاں کتنے
کوئی شعلہ، کوئی شبنم، کوئی مہتاب جبیں تھا

اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لیے دل کو
اک زمانے میں مزاج ان کا سرِ عرش بریں تھا

چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

★

جاناہے تمہیں دہر سے ایمان ہے اپنا
ہم آکے نہیں جائیں گے اعلان ہے اپنا

انساں سے جو نفرت کرے انسان نہیں ہے
ہر رنگ کا ہر نسل کا انسان ہے اپنا

تم امن کے دشمن ہو محبت کے ہو قاتل
دنیا سے مٹانا تمہیں ارمان ہے اپنا

کیوں اپنے رفیقوں کو پریشان کریں ہم
حالات سے دل لاکھ پریشان ہے اپنا

اِس شاہ کے بھی ہم نے قصیدے نہیں لکھے
پاس اپنے گواہی کو یہ دیوان ہے اپنا

★

چُور تھا زخموں سے دل، زخمی جگر بھی ہو گیا
اُس کو روتے تھے کہ سُونا یہ نگر بھی ہو گیا
لوگ اسی صورت پریشاں ہیں جدھر بھی دیکھیے
اور وہ کہتے ہیں کو وہ غم تو سر بھی ہو گیا
بام و در پر ہے مسلط آج بھی شامِ الم
یوں تو ان گلیوں سے خورشید سحر بھی ہو گیا
اُس ستمگر کی حقیقت ہم پہ ظاہر ہو گئی
ختم خوش فہمی کی منزل کا سفر بھی ہو گیا

دل پر جو زخم ہیں وہ دکھائیں کسی کو کیا
اپنا شریکِ درد بنائیں کسی کو کیا

ہر شخص اپنے اپنے غموں میں ہے مبتلا
زنداں میں اپنے ساتھ رلائیں کسی کو کیا

بچھڑے ہوئے وہ یار وہ چھوڑے ہوئے دیار
رہ رہ کے ہم کو یاد جو آئیں کسی کو کیا

رونے کو اپنے حال پہ تنہائی ہے بہت
اُس انجمن میں خود پہ ہنسائیں کسی کو کیا

وہ بات چھیڑ جس میں جھلکتا ہو سب کا غم
یادیں کسی کی تجھ کو ستائیں کسی کو کیا

سوئے ہوئے ہیں لوگ تو ہونگے سکون سے
ہم جاگنے کا روگ لگائیں کسی کو کیا

جالبؔ نہ آئے گا کوئی احوال پوچھنے
دیں شہرِ بے حساں میں صدائیں کسی کو کیا

★

دل پُر شوق کو پہلو میں دبائے رکھا
تجھ سے بھی ہم نے ترا پیار چھپائے رکھا

چھوڑ اس بات کو اے دوست کہ تجھ سے پہلے
ہم نے کس کس کو خیالوں میں بسائے رکھا

غیر ممکن تھی زمانے کے غموں سے فرصت
پھر بھی ہم نے ترا غم دل میں بسائے رکھا

پھول کو پھول نہ کہتے تو اسے کیا کہتے
کیا ہوا غیر نے کالر پہ سجائے رکھا

جانے کس حال میں ہیں کون سے شہروں میں ہیں وہ
زندگی اپنی جنھیں ہم نے بنائے رکھا

ہائے کیا لوگ تھے وہ لوگ پری چہرہ لوگ
ہم نے جن کے لیے دُنیا کو بھلائے رکھا

اب ملیں بھی تو نہ پہچان سکیں ہم اُن کو
جن کو اک عمر خیالوں میں بسائے رکھا

★

دل ہے اب پہلو میں یوں سہما ہُوا
جیسے کُٹیا میں دیا جلتا ہُوا

اب نہ تیرا غم نہ تیری جستجو
زندگی میں کون یوں تنہا ہُوا

پھر رہا ہوں یوں تری گلیوں سے دور
جیسے کوئی راستہ بھولا ہُوا

★

شوقِ آوارگی میں کیا نہ ہوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہوا

شرحِ مطلب نہ آسکا لب پر
مطمئن ہیں کوئی خفا نہ ہوا

اس کے آنچل کو چھو رہی ہے صبا
ہائے قسمت کہ میں صبا نہ ہوا

دل میں نوحہ کناں رہا اک غم
پھر کبھی اپنا بے صدا نہ ہوا

ناخدا تو ہمیں ڈبو دیتا
خیر گزری کہ وہ خدا نہ ہوا

ہم پہ اس عہدِ کم نگاہی میں
کون سا جورِ ناروا نہ ہوا

اب تو ہم خاک ہو چکے جالبؔ
اب ہمارا کوئی ہوا نہ ہوا

★

شہر کی بستی سے ویرانے سے دل گھبرا گیا
اے جنوں تیرے ہر افسانے سے دل گھبرا گیا

اک مکمل خامشی اک بیکراں گہرا سکوت
آج صحرا کا بھی دیوانے سے دل گھبرا گیا

پھر گئے جالبؔ نگاہوں میں کئی اُجڑے چمن
موسمِ گل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا

★

غالبؔ ویگانہ سے لوگ بھی تھے جب تنہا
ہم سے ملے نہ ہو گی کیا منزلِ ادب تنہا

فکرِ انجمن کس کو کیسی انجمن پیارے
اپنا اپنا غم سب کو سوچیے تو سب تنہا

سن رکھو زمانے کی کل زبان پر ہو گی
ہم جو بات کرتے ہیں آج زیرِ لب تنہا

اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے ہو گئے جو اب تنہا

مہر و ماہ کی صورت مسکرا کے گزرے ہیں
خاکدانِ تیرہ سے ہم بھی روز و شب تنہا

کتنے لوگ آ بیٹھے پاس مہرباں ہو کر
ہم نے خود کو پایا ہے تھوڑی دیر جب تنہا

یاد بھی ہے ساتھ انکی اور غم زمانہ بھی
زندگی میں اے جالبؔ ہم ہوئے ہیں کب تنہا

★

غزلیں تو کہی ہیں کچھ ہم نے ان سے نہ کہا احوال تو کیا
کل مشلِ ستارہ ابھریں گے ہیں آج اگر پامال تو کیا

جینے کی دعا دینے والے یہ راز تجھے معلوم نہیں
تخلیق کا اک لمحہ ہے بہت بیکار جیے سو سال تو کیا

سکوں کے عوض جو بک جائے وہ میری نظر میں حسن نہیں
اے شمع شبستانِ دولت! تو ہے جو پری تمثال تو کیا

ہر پھول کے لب پر نام مرا چرچا ہے چمن میں عام مرا
شہرت کی یہ دولت کیا کم ہے گر پاس نہیں ہے مال تو کیا

ہم نے جو کیا محسوس کہا جو درد ملا ہنس ہنس کے سہا
بھولے گا نہ مستقبل ہم کو نالاں ہے جو ہم سے حال تو کیا

ہم اہلِ محبت پا لیں گے اپنے ہی سہارے منزل کو
یارانِ سیاست نے ہر سو پھیلائے ہیں رنگیں جال تو کیا

دنیا کے ادب میں اے جالبؔ اپنی بھی کوئی پہچان تو ہو
اقبالؔ کا رنگ اڑانے سے تو بن بھی گیا اقبال تو کیا

★

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو جینا کس قدر آسان ہوتا

مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا

مری انگلش بلا کی چُست ہوتی
بلا سے جو نہ اردو دان ہوتا

جھکا کے سر کو ہو جاتا جو سر میں
تو لیڈر بھی عظیم الشان ہوتا

زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں
میں واللہ صدرِ پاکستان ہوتا

★

کوئی شعر نیا کوئی بات نئی کہنے کا جتن کرتے رہنا
انمول ہے پل پل جیون کا آہیں نہ یونہی بھرتے رہنا

کچھ کام نہیں آتی آہیں چلنے سے سمٹتی ہیں راہیں
تقدیر پہ کیا تہمت یارو بیٹھے بیٹھے دھرتے رہنا

سر ڈال کے چلتے رہنے سے کچھ اور بھی اونچی ہوتی ہیں
دیواریں تو ہیں دیواریں ہی دیواروں سے کیا ڈرتے رہنا

دنیا کو اگر سلجھا لیں گے ہر منزل کو ہم پا لیں گے
اک زلف کے غم میں کیا جالبؔ جیتے رہنا مرتے رہنا

★

لوگ گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا

جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گلِ تر یاد آیا

تیری بیگانہ نگاہی سرِ شام
یہ ستم تا بہ سحر یاد آیا

ہم زمانے کا ستم بھول گئے
جب ترا لطفِ نظر یاد آیا

تو بھی مسرور تھا اس شب سرِ بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا

پھر ہوا دردِ تمنا بیدار
پھر دلِ خاک بسر یاد آیا

ہم جسے بھول چکے تھے جالبؔ
پھر وہی راہ گزر یاد آیا

★

نہ گفتگو سے نہ وہ شاعری سے جائے گا
عصا اٹھاؤ کہ فرعون اسی سے جائے گا

اگر ہے فکرِ گریباں تو گھر میں جا بیٹھو
یہ وہ عذاب ہے دیوانگی سے جائے گا

بجھے چراغ، لٹیں عصمتیں، چمن اجڑا
یہ رنج جس نے دیئے کب خوشی سے جائے گا

جیو ہماری طرح سے مرو ہماری طرح
نظامِ زر تو اسی سادگی سے جائے گا

جگا نہ شہ کے مصاحب کو خواب سے جالبؔ
اگر وہ جاگ اٹھا، نوکری سے جائے گا

★

ہم جواب تک انھار ہے ہیں ستم
شاید اپنا جگر ہے آہن کا

ہر کلی کی ہے آنکھ میں آنسو
حال کیا ہو گیا ہے گلشن کا

جو سپہ عورتوں سے ڈرتی ہے
سامنا کیا کرے گی دشمن کا

حیف زنداں میں ڈال رکھا ہے
کم نگاہوں نے حسن آنگن کا

دھن کی دنیا کے دھن کے سب دھندے
کوئی ہوتا نہیں ہے نردھن کا

جس کی سجنی الگ ہو زنداں میں
کیا اٹھائے وہ لطف ساون کا

یاد آتا ہے ہم کو زنداں میں
گاؤں اپنا زمانہ بچپن کا

گیت گاتی ہے جو مرے من کے
شوق ہے مجھ کو اس کے درشن کا

دکھ کے سائے سمٹنے لگتے ہیں
کیا جواب اس لوائے روشن کا

★

ہوائے جور و ستم سے رخِ وفا نہ بجھا
بجھے تمام دیے ایک یہ دیا نہ بجھا

فراق و وصل کا لذت شناس ہو کیونکر
جو دل کہ سایۂ مہتاب میں جلا نہ بجھا

مرے غموں کا مداوا ہے کیا، بتا کھل کر
پہیلیاں ہی مرے دردِ آشنا نہ بجھا

ہر اہلِ جور کی خواہش رہی ہے میں نہ رہوں
مگر میں ہوں کہ مرا شعلۂ نوا نہ بجھا

مرے خیال میں اب تھک چکے ہیں ظالم بھی
ڈھلے گی ظلم کی شب دیپ آس کا نہ بجھا

طلوعِ صبح کا منظر نظر میں روشن تھا
شبِ سیاہ میں یہ آتشیں ہوا نہ بجھا

ہجوم یہ جو ترے سامنے ہے اے ساقی
کر اس پہ لطف مری تشنگی بجھا نہ بجھا

تجا کے چہرے پہ غم کو نہ باہر آ گھر سے
بجھی نظر سے مرے ہم نشیں فضا نہ بجھا

★

حسن کا ہم نے کیا چرچا بہت
حسن کے ہاتھوں ہوئے رسوا بہت

موجِ نکہت اپنی قسمت میں نہ تھی
دور سے اس پھول کو دیکھا بہت

وہ ملا تھا راہ میں اک شام کو
پھر اسے میں نے یہاں ڈھونڈا بہت

★

کیسے کہیں کہ یادِ یار جا رات جا چکی بہت
رات بھی اپنے ساتھ ساتھ آنسو بہا چکی بہت

چاند بھی ہے تھکا تھکا تارے بھی ہیں بجھے بجھے
تیرے ملن کی آس پھر دیپ جلا چکی بہت

آنے لگی ہے یہ صدا دور نہیں ہے شہرِ گل
دنیا ہماری راہ میں کانٹے بچھا چکی بہت

کھلنے کو ہے قفس کا در پانے کو ہے سکوں نظر
اے دلِ زار شامِ غم ہم کو رلا چکی بہت

اپنی قیادتوں میں اب ڈھونڈیں گے لوگ منزلیں
راہزنوں کی رہبری راہ دکھا چکی بہت

دل کی شکستگی کے ہیں آثار پھر بہت
اہلِ جفا ہیں درپئے آزار پھر بہت

جو لفظ کھا گئے تھے چمن کی شگفتگی
ہر صبح لکھ رہے ہیں وہ اخبار پھر بہت

جو بچ رہا اس کو گنوانے کے واسطے
کوشاں ہیں اہلِ جبہ و دستار پھر بہت

بڑے بنے تھے جالبؔ صاحب پٹے سڑک کے بیچ
گولی کھائی لاٹھی کھائی گرے سڑک کے بیچ

کبھی گریباں چاک ہُوا اور کبھی ہُوا دل خوں
ہمیں تو یونہی ملے سخن کے صِلے سڑک کے بیچ

جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کسے سڑک کے بیچ

(خواتین کے جلوس پر لاٹھی چارج پر لکھے گئے)

★

ہوتا ہے سرِ شام سلاخوں کا جو در بند
کر لیتے ہیں ہم بھی کئی مہتاب نظر بند

ترسیں گی اجالوں کو شبِ غم کی نگاہیں
ہو جائے گا جس روز مرا دیدۂ تر بند

رستہ کہاں سورج کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر بند

جینا ہمیں آتا ہے بہر طور مری جاں
کرتے رہیں وہ زیست کی ہر راہ گزر بند

ہے فرض تجھی پر کہ ہر اک عہد میں جالبؔ
آلام اٹھا کا جا زباں اپنی نہ کر بند

★

پھول کو دیکھنے سے ایک نظر
کتنے عالم گزر گئے دل پر

یوں بھی بے چینیاں نہیں جاتیں
ہم نے دیکھا خموش بھی رہ کر

شب کی تاریکیوں میں تیرا خیال
جیسے کھو جائے روشنی میں نظر

تیری بدلی ہوئی نظر توبہ
کتنا گہرا ہے زندگی پہ اثر

اس دیارِ ستم ظریفاں میں
فرصتِ ہاؤ ہو بہت ہے مگر

قہقہے بے شعور لوگوں کے
کس قدر بار ہیں سماعت پر

○

ناشناسوں کی محفل میں اے نغمہ گر!
فن کو رسوا نہ کر، فن کو رسوا نہ کر

★

کون اس انجمن میں ہے اہلِ نظر
دولتِ رائیگاں ہے متاعِ ہنر

کتنے بے نور ہیں آفتاب و قمر
گردشِ روز و شب آ گئے ہم کدھر

کتنی ویران ہیں پیار کی بستیاں
نوحہ گر ہے وفا رہگزر رہگزر

جہل مسند نشیں ہے بصد تمکنت
ہم نشیں کیوں نہ ہو علم کی آنکھ تر

شیخ کی آنکھ میں بھی مروت نہیں
برہمن بھی محبت سے ہے بےخبر

میں بھی منصور ہوں میں بھی منصور ہوں
کاٹ دو میرا سر، کاٹ دو میرا سر

دل میں روشن ہے اب تک تری آرزو
اے دیارِ سحر، اے دیارِ سحر

★

ویراں ہے میری شام، پریشاں مری نظر
اچھا ہوا کہ تم نہ ہوئے میرے ہم سفر

کوئی صدا نہیں کہ جسے زندگی کہوں
مدت سے ہے خموش مرے دل کی رہ گزر

لو اب تو شورِ نالہ و فریاد تھم گیا
میرے جنوں پہ ایک زمانے کی تھی نظر

اے میرے ماہتاب کہاں چھپ گیا ہے تو
تجھ بن بجھے بجھے ہیں محبت کے بام و در

تیرے بغیر کتنی فسردہ ہے بزمِ شعر
اے دوست اپنے حسنِ غزل کو دیکھ کر

میں تیری بے رُخی کو بھی سمجھوں گا التفات
پیارے مرے قریب سے اک بار پھر گزر

جالبؔ مجھے تو ان کے گریباں کی فکر ہے
جو ہنس رہے ہیں میرے گریباں کے چاک پر

★

کتنا سکوت ہے رسن و دار کی طرف
آتا ہے کون جرأتِ اظہار کی طرف

دشتِ وفا میں آبلہ پا کوئی اب نہیں
سب جا رہے ہیں سایۂ دیوار کی طرف

قصرِ شہی سے کہتے ہیں نکلے گا مہرِ نو
اہلِ خرد ہیں اس لئے سرکار کی طرف

دشنام دکو رہا ہے عدد کو نکال لیں
آئیں گے لوٹ کر لب و رخسار کی طرف

باقی جہاں میں رہ گیا غالبؔ کا نام ہی
ہرچند اک ہجوم تھا اغیار کی طرف

★

تیری بھیگی ہوئی آنکھیں ہیں مجھے یاد اب تک
تو اسی طرح خیالوں میں ہے آباد اب تک

تو مرے ساتھ ہمیشہ رہی دھڑکن دھڑکن
تجھ کو بھولا نہیں اے جاں دلِ ناشاد اب تک

آنسوؤں پہ وہی پہرے ہیں ستم گاروں کے
وہی ہونٹوں پہ ہے سہمی ہوئی فریاد اب تک

اپنا افسانۂ غم کس کو سناتے جالبؔ
ہم تو سنتے رہے اوروں ہی کی روداد اب تک

★

تو رنگ ہے غبار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پھول ہے شرار ہیں تیری گلی کے لوگ

تو رونقِ حیات ہے تو حسنِ کائنات
اجڑا ہوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ

تو پیکرِ وفا ہے مجسم خلوص ہے
بدنامِ روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ

روشن ترے جمال سے ہیں مہر و ماہ بھی
لیکن نظر پہ بار ہیں تیری گلی کے لوگ

دیکھو جو غور سے تو زمیں سے بھی پست ہیں
یوں آسماں شکار ہیں تیری گلی کے لوگ

پھر جا رہا ہوں تیرے تبسم کو لوٹ کر
ہرچند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

کھو جائیں گے سحر کے اجالوں میں آخرش
شمعِ سرِ مزار ہیں تیری گلی کے لوگ

★

پھر دل سے آ رہی ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتا اس گلی میں چل

کب سے نہیں ہوا ہے کوئی شعر کام کا
یہ شعر کی نہیں ہے فضا اس گلی میں چل

وہ بام و در وہ لوگ وہ رسوائیوں کے زخم
ہیں سب کے سب عزیز جدا اس گلی میں چل

اس پھول کے بغیر بہت جی اداس ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کے صبا اس گلی میں چل

دنیا تو چاہتی ہے یونہی فاصلے رہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جا اس گلی میں چل

بے نور و بے اثر ہے یہاں کی صدائے ساز
تھا اس سکوت میں بھی مزا اس گلی میں چل

جالبؔ پکارتی ہیں وہ شعلہ نوائیاں
یہ سرد رُت یہ سرد ہوا اس گلی میں چل

★

جدھر جائیں وہی قاتل مقابل
یہ صورت کب تلک اے دل مقابل

فسوں ٹوٹا نہ بڑھتے فاصلوں کا
وہی ہے دوریٔ منزل مقابل

عذابِ عہدِ رفتہ سہہ چکے ہیں
اور اب ہے خوفِ مستقبل مقابل

عجب صحرائے حیرت چار سُو ہے
نہ طوفاں ہے نہ ہے ساحل مقابل

زمیں کو آسماں کہنا نہ آیا
ہمیشہ یہ رہی مشکل مقابل

بچا کر ذہن و دِل نکلیں کدھر سے
کہ ہیں ہر گام پر جاہل مقابل

یہ کہہ کر دل کو سمجھاتے ہیں کب سے
ہے گا کب تلک باطل مقابل

★

اس کوئے ملامت پہ ہی موقوف نہیں ہے
ہر شہر میں آوارہ و بدنام رہے ہم

کس شوق سے بڑھتے رہے ہر شخص کی جانب
ہر شخص سے محروم بہر گام رہے ہم

اک عمر رہے منتظرِ عہدِ بہاراں
اک عمر اسیرِ خلشِ خام رہے ہم

ہم کہہ نہ سکے کھل کے کوئی بات کسی سے
ہر گام پہ لذت کشِ ابہام رہے ہم

کیوں اپنا مقدر نہ ہوئے عارض و گیسو
اس فکر میں سوزاں سحر و شام رہے ہم

اس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالبؔ
اس پھول کو چھونے میں بھی ناکام رہے ہم

★

ذرّے ہی سہی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم
دل لے کے سرِ عرصۂ غم آ تو گئے ہم

اب نام رہے یا نہ رہے عشق میں اپنا
رودادِ وفا دار پہ دہرا تو گئے ہم

کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انھیں جھٹلا تو گئے ہم

جاں اپنی گنوا کر کبھی گھر اپنا جلا کر
دل ان کا ہر اک طور سے بہلا تو گئے ہم

کچھ اور ہی عالم تھا پسِ چہرۂ یاراں
رہتا جو یونہی راز اسے پا تو گئے ہم

اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ہم

اٹھیں کہ نہ اٹھیں یہ رضا ان کی ہے جالبؔ
لوگوں کو سرِ دار نظر آ تو گئے ہم

کٹی اب کٹی منزلِ شامِ غم
بڑھائے چلو پا فگارو قدم
ہمیں سے فروزاں ہے شمعِ وفا
ہمیں نے بھرا ہے محبت کا دم
کہیں یاس کے حوصلے بڑھ نہ جائیں
کہیں آس کے رک نہ جائیں قدم
پڑھے گا زمانہ بڑے شوق سے
کیے جاؤں دل کی کہانی رقم
بدل جائے گا دیکھتے دیکھتے
یہ عہدِ خرابی، یہ عہدِ ستم
نکلنے کو ہے آفتابِ سحر
شبِ تار ہے بس کوئی اور دم
مٹا کر اندھیروں کا نام و نشاں
اجالوں کی بستی بسائیں گے ہم

★

نہ کوئی شب ہو شبِ غم یہ سوچتے ہیں ہم
کسی کی آنکھ نہ ہو نم، یہ سوچتے ہیں ہم
گلہ گزار نہ ہو کوئی چشمِ ساقی کا
کسی پہ لطف نہ ہو کم، یہ سوچتے ہیں ہم
کسی کے لب پہ نہ ہو داستانِ تشنہ لبی
زمیں پہ کوئی نہ ہو جم، یہ سوچتے ہیں ہم
زمیں پہ آگ نہ برسے فضا سدا مہکے
بپا نہ ہو کہیں ماتم، یہ سوچتے ہیں ہم
کرے نہ کوئی زمانے میں جنگ کی باتیں
جھکے نہ امن کا پرچم، یہ سوچتے ہیں ہم
کسی کا حق ہے سمندر پہ اور کوئی پیاسا
یہ کیا ہے، کیوں ہے یہ عالم، یہ سوچتے ہیں ہم
سفر ہے شب کا دلِ ہمرہاں بجھے نہ کہیں
لگن کی لو نہ ہو مدھم، یہ سوچتے ہیں ہم

ہجوم دیکھ کے رستہ نہیں بدلتے ہم
کِسی کے ڈر سے تقاضا نہیں بدلتے ہم

ہزار زیرِ قدم راستہ ہو خاروں کا
جو چل پڑیں تو اِرادہ نہیں بدلتے ہم

اِسی لئے تو نہیں معتبر زمانے میں
کہ رنگِ صُورتِ دُنیا نہیں بدلتے ہم

ہَوا کو دیکھ کے جالبؔ مثالِ ہم عصراں
بجا یہ زعم ہمارا نہیں بدلتے ہم

★

یہ اور بات تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر تِرا چھوڑ جائیں ہم

مدّت ہوئی ہے کوئے بتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

شاید بقیدِ زیست یہ ساعت نہ آسکے
تم داستانِ شوق سنو اور سُنائیں ہم

بے نور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم

اُس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جالبؔ چلو کہیں سے اُسے ڈھونڈ لائیں ہم

٭

اب تیری ضرورت بھی بہت کم ہے مری جاں
اب شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے مری جاں

اب تذکرۂ خندۂ گل بار ہے جی پر
جاں وقفِ غم گریۂ شبنم ہے مری جاں

رُخ پر ترے بکھری ہوئی یہ زلفِ سیہ تاب
تصویر پریشانیٔ عالم ہے مری جاں

یہ کیا کہ تجھے بھی ہے زمانے سے شکایت
یہ کیا کہ تری آنکھ بھی پُر نم ہے مری جاں

ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا تسلط
مایوس نہ ہو اور کوئی دم ہے مری جاں

یہ تیری توجہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مری جاں

اے نزہتِ مہتاب ترا غم ہے مری زیست
اے نازشِ خورشید ترا غم ہے مری جاں

★

اپنوں نے وہ رنج دیئے ہیں بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ کے اس بستی کی حالت ویرانے یاد آتے ہیں

اس نگری میں قدم قدم پہ سر کو جھکانا پڑتا ہے
اس نگری میں قدم قدم پر بت خانے یاد آتے ہیں

آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں غربت کے صحراؤں میں
جب اُس رِم جھم کی وادی کے افسانے یاد آتے ہیں

ایسے ایسے درد ملے ہیں نئے دیاروں میں ہم کو
بچھڑے ہوئے کچھ لوگ پرانے یارانے یاد آتے ہیں

جن کے کارن آج ہمارے حال پہ دنیا ہنستی ہے
کتنے ظالم چہرے جانے پہچانے یاد آتے ہیں

یوں نہ لٹی تھی گلیوں گلیوں دولت اپنے اشکوں کی
روتے ہیں تو ہم کو اپنے غم خانے یاد آتے ہیں

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالبؔ
چاروں جانب سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

★

اُٹھ گیا ہے دلوں سے پیار یہاں
کتنے بے نور ہیں دیار یہاں

روشنی، روشنی، حیات، حیات،
ہر طرف ہے یہی پکار یہاں

راستہ کیا سجھائی دے اے دوست
جل بجھی شمعِ رہگزار یہاں

★

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں

تیرے بام و در سے دور تیری رہگزر سے دور
رات کی سیاہی ہے تیرگی کے سائے ہیں

اُس نگاہ سے جالبؔ رسم و راہ کی خاطر
ہم نے کم نگاہوں کے ناز بھی اٹھائے ہیں

★

اس رعونت سے وہ جیتے ہیں کہ مرنا ہی نہیں
تخت پر بیٹھے ہیں یوں جیسے اترنا ہی نہیں

یوں مہ و انجم کی وادی میں اُڑے پھرتے ہیں وہ
خاک کے ذروں پہ جیسے پاؤں دھرنا ہی نہیں

اُن کا دعویٰ ہے کہ سورج بھی انہی کا ہے غلام
شب جو ہم پر آئی ہے اس کو گزرنا ہی نہیں

کیا علاج اس کا اگر ہو مدعا ان کا یہی
اہتمامِ رنگ و بو گلشن میں کرنا ہی نہیں

ظلم سے ہیں برسرِ پیکار آزادی پسند
ان پہاڑوں میں جہاں پر کوئی جھرنا ہی نہیں

دل بھی اُن کے ہیں سیہ خوراکِ زنداں کی طرح
ان سے اپنا غم بیاں اب ہم کو کرنا ہی نہیں

انتہا کر لیں ستم کی لوگ ابھی ہیں خواب میں
جاگ اُٹھے جب لوگ تو اُن کو ٹھہرنا ہی نہیں

★

اگر دامن نہیں ان کا میسر
کسی دیوار ہی سے لگ کے رو لیں

ملے رونے سے فرصت تو کسی شب
ستاروں کی حسیں چھاؤں میں سو لیں

نگاہوں کی زباں کوئی جو سمجھے
سرِ محفل کبھی ہم لب نہ کھولیں

بہت آسان ہو جائے گی منزل
چلو ہم بھی کسی کے ساتھ ہو لیں

کوئی جو آبسے دل میں تو جالبؔ
کبھی اس گھر کے دروازے نہ کھولیں

★

اور کیا اس کے سوا چاہتے ہیں
نوعِ انساں کا بھلا چاہتے ہیں

ان کی دانست پہ آتی ہے ہنسی
جو ہماری بھی دعا چاہتے ہیں

کتنے ناداں ہیں کہ ہر قاتل سے
اپنے ہم دکھ کی دوا چاہتے ہیں

ہم بھی غالبؔ کی طرح اے جالبؔ
نہ ستائش نہ صلا چاہتے ہیں

★

اے دل وہ تمھارے لیے بےتاب کہاں ہیں
دُھندلائے ہوئے خواب ہیں احباب کہاں ہیں

ان پر بھی شبِ غم اسی صورت سے مسلط
اپنی ہی طرح وہ بھی سکوں یاب کہاں ہیں

آتے ہیں نظر بے سروساماں ہی قفس میں
حاکم جنھیں بننا ہے وہ نواب کہاں ہیں

اب نالہ و شیون کی صدائیں نہیں آتیں
اے درد کی شب وہ ترے بے تاب کہاں ہیں

دن ہی کوئی روشن نہ کوئی رات منور
خورشید کہاں ہیں مرے مہتاب کہاں ہیں

تو شکوہ سرا ہے تو کبھی آہ بہ لب ہے
زنداں کے مری جان یہ آداب کہاں ہیں

وہ جام بکف شام نہ وہ صحبتِ یاراں
جینے کے ترے شہر میں اسباب کہاں ہیں

★

باتیں تو کچھ ایسی ہیں کہ خود سے بھی نہ کی جائیں
سوچا ہے خموشی سے ہر اک زہر کو پی جائیں

اپنا تو نہیں کوئی وہاں پوچھنے والا
اُس بزم میں جانا ہے جنھیں آپ وہی جائیں

اب تجھ سے ہمیں کوئی تعلق نہیں رکھنا
اچھا ہو کہ دل سے تری یادیں بھی چلی جائیں

اک عمر اُٹھائے ہیں ستم غیر کے ہم نے
اپنوں کی تو اک پل بھی جفائیں نہ سہی جائیں

جالبؔ غمِ دوراں ہو کہ یادِ رُخِ جاناں
تنہا مجھے رہنے دیں مرے دل سے سبھی جائیں

★

جدھر نگاہ اٹھائیں کھلے کنول دیکھیں
غزل کہیں کہ مری جان ہم غزل دیکھیں

وہی جمال وہی تمکنت وہی اعجاز
ہزار بَل اسے دیکھیں کہ ایک پَل دیکھیں

خیالِ مرگِ وفا نے بچا لیا ہم کو
کہا جو دل نے کبھی راستہ بدل دیکھیں

جہاں ہماری جواں حسرتوں کا خون ہوا
چلو کہ چل کے وہی کوچۂ اجل دیکھیں

کئے ہوئے ہیں دل و جاں نثار ہم جن پر
ہمارے ساتھ کریں کیا سلوک کل دیکھیں

قدم قدم پہ لٹے ہیں جو لوگ اے جالبؔ
رہِ طلب میں ہمارے بھی ساتھ چل دیکھیں

★

جنھیں ہم چاہتے ہیں والہانہ
وہ اپنے قاتلوں کو چاہتے ہیں

ہمیں آسانیاں کیوں ہوں میسّر
کہ ہم خود مشکلوں کو چاہتے ہیں

ہمیں ہے عشق بڑھتے فاصلوں سے
گریزاں منزلوں کو چاہتے ہیں

جیون مجھ سے میں جیون سے شرماتا ہوں
مجھ سے آگے جانے والو میں آتا ہوں

جن کی یادوں سے روشن ہیں میری آنکھیں
دل کہتا ہے ان کو بھی میں یاد آتا ہوں

سُر سے سانسوں کا ناتا ہے توڑوں کیسے
تم جلتے ہو کیوں جیتا ہوں کیوں گاتا ہوں

تم اپنے دامن میں ستارے بیٹھ کے ٹانکو
اور میں نئے برن لفظوں کو پہناتا ہوں

جن خوابوں کو دیکھ کے میں نے جینا سیکھا
اُن کے آگے ہر دولت کو ٹھکراتا ہوں

زہر اگلتے ہیں جب مل کر دنیا والے
میٹھے بولوں کی وادی میں کھو جاتا ہوں

جبلت میرے شعر سمجھ میں آجاتے ہیں
اس لیے کم تر شاعر کہلاتا ہوں

★

درد کی دھوپ ہے خوف کے سائے ہیں
اپنی منزل تھی کیا اور کہاں آئے ہیں

دل تھا پہلے ہی چھلنی غمِ دہر سے
زخم تیری جدائی کے بھی کھائے ہیں

سب کو فکرِ گریباں ہے اس عہد میں
ایک اہلِ جنوں ہم ہی کہلائے ہیں

★

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کے لیے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں

وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالبؔ جالبؔ کہتے ہیں

★

زندہ ہیں ایک عمر سے دہشت کے سائے میں
دم گھٹ رہا ہے اہلِ عبادت کے سائے میں

ہم کو کہاں تصورِ جاناں ہوا نصیب
بیٹھے ہیں ہم کہاں کبھی فرصت کے سائے میں

چھوڑا نہ ہم نے نقش کوئی راہِ عشق میں
گزری تمام عمر ندامت کے سائے میں

بچھڑے ہوئے دیارِ دل و جاں کے دوستو
پوچھو نہ دکھ سہے ہیں جو غربت کے سائے میں

اے رہروانِ راہِ سحر ہم کو داد دو
لیتے ہیں سانس ظلم کی ظلمت کے سائے میں

ہم آئیں گے تو آئے گا وہ عہدِ خوش گوار
گزرے گی جب حیات محبت کے سائے میں

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں ان مکینوں میں

دیکھ کر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ
سانپ ہوتے ہیں آستینوں میں

قہر کی آنکھ سے نہ دیکھ ان کو
دل دھڑکتے ہیں آبگینوں میں

آسمانوں کی خیر ہو یارب
اک نیا عزم ہے زمینوں میں

وہ محبت نہیں رہی جالبؔ
ہم صفیروں میں ہم نشینوں میں

شعر سے شاعری سے ڈرتے ہیں
کم نظر روشنی سے ڈرتے ہیں

لوگ ڈرتے ہیں دشمنی سے تری
ہم تری دوستی سے ڈرتے ہیں

دہر میں آہِ بے کساں کے سوا
اور ہم کب کسی سے ڈرتے ہیں

ہم کو غیروں سے ڈر نہیں لگتا
اپنے احباب ہی سے ڈرتے ہیں

داورِ حشر بخش دے شاید
ہاں مگر مولوی سے ڈرتے ہیں

روٹھتا ہے تو روٹھ جائے جہاں
ان کی ہم بے رُخی سے ڈرتے ہیں

ہر قدم پر ہے محتسب جالبؔ
اب تو ہم چاندنی سے ڈرتے ہیں

شہر ویراں اداس ہیں گلیاں
رہگزاروں سے اُٹھ رہا ہے دھواں

آتشِ غم میں جل رہے ہیں دیار
گرد آلود ہے رخِ دوراں

بستیوں پر غموں کی یورش ہے
قریہ قریہ ہے وقفِ آہ و فغاں

صبح بے نور، شام بے مایہ
لُٹ گئی دولتِ نگاہ کہاں

پھر رہے ہیں طیور آوارہ
برق ہر شاخ پر شعلہ فشاں

میری تنہائیوں پہ صورتِ شمع
رو رہا ہے الم نصیب سماں

میرے شانوں سے تیری زلفوں تک
فاصلہ عمر کا ہے میری جاں

★

فرضی مقدمات ہیں جھوٹی شہادتیں
ہم پھر بھی لکھ رہے ہیں جنوں کی حکایتیں

مجرم کی اب نشان دہی کون کر سکے
اب تک ہیں بند اہلِ قلم کی عدالتیں

زنجیرِ پا جو توڑ رہے ہیں قفس نصیب
ہیں اہلِ آشیاں کی نظر میں بغاوتیں

پہنچے ہیں اہلِ جور صلیبیں لیے ہوئے
آئی ہیں جب بھی سامنے کھل کر صداقتیں

جو لوگ جھونپڑوں میں پڑے تھے پڑے رہے
کچھ اہلِ زر نے اور بنا لیں عمارتیں

آیا ہی چاہتا ہے اب اہلِ خرد کا دور
مسند نشیں رہیں گی کہاں تک جہالتیں

جالبؔ بزرگ کیوں ہیں خفا بات بات پر
کرتا رہا ہے یوں ہی لڑکپن شرارتیں

★

کبھی تو مہرباں ہو کر بلا لیں
یہ مہوش ہم فقیروں کی دعا لیں

نہ جانے پھر یہ رت آئے نہ آئے
جواں پھولوں کی کچھ خوشبو چرا لیں

بہت روئے زمانے کے لیے ہم
ذرا اپنے لیے آنسو بہا لیں

ہم ان کو بھولنے والے نہیں ہیں
سمجھتے ہیں غمِ دوراں کی چالیں

ہماری بھی سنبھل جائے گی حالت
وہ پہلے اپنی زلفیں تو سنبھالیں

نکلنے کو ہے وہ مہتاب گھر سے
ستاروں سے کہو نظریں جھکا لیں

ہم اپنے راستے پر چل رہے ہیں
جنابِ شیخ اپنا راستہ لیں

زمانہ تو یونہی روٹھا رہے گا
چلو جالب انھیں چل کر منالیں

★

کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں
بیتے ہوئے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں

چہرے جو کبھی ہم کو دکھائی نہیں دیں گے
آ آ کے تصور میں نہ تڑپائیں تو سوئیں

برسات کی رت کے وہ طرب ریز مناظر
سینے میں نہ اک آگ سی بھڑکائیں تو سوئیں

صبحوں کے مقدر کو جگاتے ہوئے مکھڑے
آنچل جو نگاہوں میں نہ لہرائیں تو سوئیں

محسوس یہ ہوتا ہے ابھی جاگ رہے ہیں
لاہور کے سب یار بھی سو جائیں تو سوئیں

★

کراہتے ہوئے انسان کی صدا ہم ہیں
میں سوچتا ہوں مری جان اور کیا ہم ہیں

جو آج تک نہیں پہنچی خدا کے کانوں تک
سرِ دیارِ ستم آہِ نارسا ہم ہیں!

تباہیوں کو مقدّر سمجھ کے ہیں خاموش
ہمارا غم نہ کرو دردِ لا دوا ہم ہیں

کہاں نگہ سے گذرتے ہیں دکھ بھرے دیہات
حسین شہروں کے ہی غم میں مبتلا ہم ہیں

بیان تک ہے تگ و دو بیان چھن جائے
کہ آمرانہ قوانین سے خفا ہم ہیں

ازل سے سلب ہیں جالبؔ حقوق انسانی
نظر جھکائے ہوئے مائلِ دعا ہم ہیں

★

کسی سے حالِ دلِ زار مت کہو سائیں
یہ وقت جیسے بھی گزرے گزار لو سائیں

وہ اس طرح سے ہیں بچھڑے کہ مل نہیں سکتے
وہ اب نہ آئیں گے ان کو صدا نہ دو سائیں

تمھیں پیام دیئے ہیں صبا کے ہاتھ بہت
تمھارے شہر میں ہیں تم جو آسکو سائیں

نہ مال و زر کی تمنا نہ جاہ و حشمت کی
ملیں گے پیار سے ہم ایسے لوگ تو سائیں

کہیں تو کس سے کہیں اور سنے تو کون سنے
گزر گئی ہے محبت میں ہم پہ جو سائیں

اکیلے جاگتے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا
تمام خواب میں ہیں تم بھی سو رہو سائیں

★

مشکلیں دنیا میں اوروں کی تو آساں ہو گئیں
بند کمروں میں سلگتے ہم کو صدیاں ہو گئیں

اپنے پہلو میں لیے پھرتے ہیں دل کی لاش کو
زندگی کی حسرتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

اب بھی شرمندہ نہیں ہیں لوگ اپنی سوچ پر
شہر اجڑے، بستیاں کتنی ہی ویراں ہو گئیں

★

ملا کرتی نہیں عظمت یونہی تو
یہ ہاتھ آتی نہیں دولت یونہی تو

وفا کی ہے سدا اہلِ جنوں سے
نہیں حاصل ہوئی شہرت یونہی تو

بنایا آپ اسے جاتا ہے پیارے
بنا کرتی نہیں قسمت یونہی تو

رہا نا آشنا تو بھی ہے ہمدم
قفس میں ہے مری صورت یونہی تو

نہیں حق چھینتے ہم غاصبوں سے
مقدر میں ہے ہر ذلت یونہی تو

بھکاری ہیں زمانے کی نظر میں
کوئی کرتا نہیں عزت یونہی تو

ہیں قصر اُن کے ہماری ہڈیوں پر
مجھے شاہوں سے ہے نفرت یونہی تو

علاج اس میں نہیں سب کے دکھوں کا
نظامِ زر سے ہے نفرت یونہی تو

★

مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محوِ تماشائے سرِ راہ گزر ہیں

حسرت سی برستی ہے در و بام پہ ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

آئے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے
وہ چاند وہ سورج وہ شب و روز کدھر ہیں

سوئے ہو گھنی زلف کے سائے میں ابھی تک
اے راہ رواں کیا یہی اندازِ سفر ہیں

وہ لوگ قدم جن کے لیے کاہکشاں نے
وہ لوگ بھی اے ہمنفسو ہم سے بشر ہیں

بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں

ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہتِ مہتاب ہیں ہم نورِ سحر ہیں

★

میں تو مایوس نہیں اہلِ وطن سے یارو
کوئی ڈرتا نہیں اب دار و رسن سے یارو

پھول دامن پہ سجائے ہوئے پھرتے ہیں وہ لوگ
جن کو نسبت ہی نہ تھی کوئی چمن سے یارو

سینۂ قوم کے ناسور ہیں یہ پھول نہیں
خوف سا آنے لگا سرو و سمن سے یارو

ظلم کے سر پہ کبھی تاج نہیں رہ سکتا
یہ صدا آنے لگی کوہ و دمن سے یارو

منزلِ کیف و طرب اپنے قدم چومے گی
ہم گزر آئے ہیں ہر رنج و محن سے یارو

کتنے خاموش تھے چپ چاپ تھے رستے گلیاں
یہ زمیں بول اٹھی میرے سخن سے یارو

ملک میں عام کریں اپنے قلم کی دولت
یہ گزارش ہے مری اہلِ سخن سے یارو

میں چُپ ہوں مدّاحِ نیتے خورشید سے پوچھو
کس کرب سے کس حال میں کس طور کٹا دن

لو آج بھی کم ہو نہ سکی یاس کی ظلمت
لو آج بھی بیکار گیا اُس سے بھرا دن

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن

یہ کون سی بستی ہے جہاں چاند نہ سورج
کس درجہ بری رات ہے کس درجہ بُرا دن

ظلمت کدۂ زیست میں پھر دیکھیے کب آئے
تیرے لب و رخسار سے شرمایا ہُوا دن

اُس شہر سے دور آکے جو دن دیکھ رہے ہیں
دشمن کو بھی ایسے تو دکھائے نہ خدا دن

میں غزل کہوں تو کیسے کہ جدا ہیں میری راہیں
مرے ارد گرد آنسو مرے آس پاس آہیں

نہ وہ عارضوں کی صبحیں نہ وہ گیسوؤں کی شامیں
کہیں دور رہ گئی ہیں مرے شوق کی پناہیں

نہ فریب دے سکے گی ہمیں اب کسی کی چاہت
کہ رلا چکی ہیں ہم کو تری کم سخن نگاہیں

کہیں گیس کا دھواں ہے کہیں گولیوں کی بارش
شبِ عہدِ کم نگاہی تجھے کس طرح سراہیں

کوئی دم کی رات ہے یہ کوئی پل کی بات ہے یہ
نہ رہے گا کوئی قاتل نہ رہیں گی قتل گاہیں

میں زمیں کا آدمی ہوں مجھے کام ہے زمیں سے
یہ فلک پہ رہنے والے مجھے چاہیں یا نہ چاہیں

نہ مذاق اڑا سکیں گے مری مفلسی کا جالب
یہ بلند بام ایواں یہ عظیم بارگاہیں

★

نگاہوں کے قفس میں اور ہوں چہروں کے زنداں میں
اگر ہو میرے بس میں تو نکل جاؤں بیاباں میں

جسے ملنے ہمیں اس شہر میں دیوانہ کہتا ہے
نہ جانے کیا خرابی ہے مری جاں عشقِ انساں میں

ترحم کی نگاہوں سے نہ مجھ کو دیکھ اے دنیا
رہا ہے ہاتھ میرا ابھی ہر اک شے کے گریباں میں

وہی ہیں صاحبِ توفیق بھی یارو کدھر جائیں
سنا کر شعر دکھ ہوتا ہے بزمِ ناشناساں میں

کہیں سے بھی صدائے نالہ و شیون نہیں آتی
عجب اک ہو کا عالم ہے دیارِ دردمنداں میں

★

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

کسے لگائے گلے اور کہاں کہاں ٹھہرے
ہزار غنچہ و گل ہیں صبا کے رستے میں

خدا کا نام کوئی لے تو چونک اٹھتے ہیں
ملے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

کہیں سلاسلِ تسبیح اور کہیں زنار
بچھے ہیں دام بہت مدعا کے رستے میں

ابھی وہ منزلِ فکر و نظر نہیں آئی
ہے آدمی ابھی جرم و سزا کے رستے میں

ہیں آج بھی وہی دار و رسن وہی زنداں
ہر اک نگاہ رموزِ آشنا کے رستے میں

یہ نفرتوں کی فصیلیں جہالتوں کے حصار
نہ رہ سکیں گے ہماری صدا کے رستے میں

مٹا سکے نہ کوئی سیلِ انقلاب جنہیں
وہ نقش چھوڑے ہیں ہم نے وفا کے رستے میں

زمانہ ایک سا جالب سدا نہیں رہتا
چلیں گے ہم بھی کبھی سر اٹھا کے رستے میں

وہ جن کی رفعتوں کے سامنے ہے گردِ آسماں
ترے دیار میں ہیں صورتِ متاعِ رائیگاں

یہیں ٹھہر یہیں ٹھہر میں آ رہا ہوں میری جاں
بُلا رہا ہے اک ذرا سی دیر کو غمِ جہاں

فریبِ رنگ و بو نہ کھا ابھی چمن، چمن کہاں
ابھی تو شاخ شاخ پر چمک رہی ہیں بجلیاں

چلو دیارِ نغمہ و شباب میں پناہ لیں
سمٹ کے آ گئی ہیں دل میں سب جہاں کی تلخیاں

چلو غزل کے شہر میں چلو طرب کے دیس میں
چلو نگاہ کو نگاہ کی سنائیں داستاں

ہر گام پر تھے شمس و قمر اس دیار میں
کتنے حسیں تھے شام و سحر اس دیار میں

وہ باغ وہ بہار وہ دریا وہ سبزہ زار
نشوں سے کھیلتی تھی نظر اس دیار میں

آسان تھا سفر کہ ہر اک رہگزار پر
ملتے تھے سایہ دار شجر اس دیار میں

ہر چند تھی وہاں بھی خزاں کی اداس دھوپ
دل پر نہیں تھا غم کا اثر اس دیار میں

محسوس ہو رہا تھا ستارے ہیں گردِ راہ
ہم تھے ہزار خاک بسر اس دیار میں

جالبؔ یہاں تو بات گریباں تک آ گئی
رکھتے تھے صرف چاکِ جگر اس دیار میں

★

ہم لڑیں امریکیوں کی جنگ کیوں
اور کریں اپنی زمیں خوں رنگ کیوں

روشنی کے ہم تو خود ہیں منتظر
روشنی پر ہم اُٹھائیں سنگ کیوں

اے ستم گر تُو نے سوچا ہے کبھی
تجھ سے ہے ساری خدائی تنگ کیوں

امن و آزادی کے ہم تو ہیں نقیب
ہوں کسی غاصب سے ہم آہنگ کیوں

★

ہم نے سنا تھا صحنِ چمن میں کیف کے بادل چھائے ہیں
ہم بھی گئے تھے جی بہلانے اشک بہا کر آئے ہیں

پھول کھلے تو دل مرجھائے شمع جلے تو جان جلے
ایک تمہارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے ہیں

ایک سلگتی یاد، چمکتا درد، فروزاں تنہائی
پوچھ نہ اس کے شہر سے ہم کیا کیا سوغاتیں لائے ہیں

سوئے ہوئے جو درد تھے دل میں آنسو بن کر بہہ نکلے
رات ستاروں کی چھاؤں میں یاد وہ کیا کیا آئے ہیں

آج بھی سورج ڈوب گیا بے نور افق کے ساگر میں
آج بھی پھول چمن میں تجھ کو بن دیکھے مرجھائے ہیں

ایک قیامت کا سناٹا ایک بلا کی تاریکی
اُن گلیوں سے دور نہ ہنستا چاند نہ روشن سائے ہیں

پیار کی بولی بول نہ جالبؔ اس بستی کے لوگوں سے
ہم نے سکھ کی کلیاں کھو کر دکھ کے کانٹے پائے ہیں

ہم ہی جب آئیں گے تو بنے گی بات میاں
ورنہ رہیں گے دکھ کے یہی حالات میاں

اب نہ بہیں گے آنسو پیاسی آنکھوں سے
رو رو کر کافی ہے بہت برسات میاں

صبح کی کرنیں ہر آنگن میں ناچیں گی
اور کوئی دم کی ہے یہ غم کی رات میاں

پھر نہ کرے گا کوئی بھی شکوہ قسمت کا
باگ ڈور آئے گی جب اپنے ہات میاں

دکھیاروں کا راج اب آنے والا ہے
ہر ظالم کی ہوگی بازی مات میاں

یہ زندگی، گزار رہے ہیں جو ہم یہاں
یہ زندگی نصیب ہے لوگوں کو کم یہاں

کوشش کے باوجود بھلائے نہ جائیں گے
ہم پر جو دوستوں نے کیے ہیں کرم یہاں

کہنے کو ہم سفر ہیں بہت اس دیار میں
چلتا نہیں ہے ساتھ کوئی دو قدم یہاں

دیوارِ یار ہو کہ شبستانِ شہریار
دو پل کو بھی کسی کے نہ سائے میں تھم یہاں

ان بستیوں میں رسمِ وفا ختم ہو چکی
اے چشمِ نم کسی سے نہ کر عرضِ غم یہاں

صد حیف جن کے دم سے پریشاں ہے آدمی
سب کی نگاہ میں ہے وہی محترم یہاں

نظمیں اُداس اُداس فسانے بجھے بجھے
مدت سے اشکبار ہیں لوح و قلم یہاں

اے ہم نفس یہی تو ہمارا قصور ہے
کرتے ہیں دھڑکنوں کے فسانے رقم یہاں

★

گھر کے زنداں سے اسے فرصت ملے تو آئے بھی
جاں فزا باتوں سے آ کے میرا دل بہلائے بھی

لگ کے زنداں کی سلاخوں سے مجھے وہ دیکھ لے
کوئی یہ پیغام میرا اس تلک پہنچائے بھی

ایک چہرے کو ترستی ہیں نگاہیں صبح و شام
ضوفشاں خورشید بھی ہے چاندنی کے سائے بھی

سسکیاں لیتی ہوائیں پھر رہی ہیں دیر سے
آنسوؤں کی رت مرے اب گلستاں سے جائے بھی

روز ہنستا ہے صلیبوں سے ادھر ماہِ منیر
اس کے پیچھے کون ہے وہ چھپ مجھے دکھلائے بھی

★

آج ہمارے حال پہ ہنس لو شہر کے عزت دارو
کل کو تمھارے حال پہ ہم کو اشک بہانے ہوں گے

ابھی کہاں تکمیل ہوئی ہے اپنے جنوں کی پیارے
اور ابھی لڑکوں کے ہاتھوں پتھر کھانے ہوں گے

اور ابھی توہینِ محبت قدم قدم پر ہو گی
اور ابھی بے درد جہاں کے ناز اٹھانے ہوں گے

تم تو کسی کو بھولے سے بھی یاد نہیں آؤ گے
آنے والے عہد کے لب پر اپنے افسانے ہوں گے

تم نے بھی تو محفل میں سب راز کی باتیں کہہ دیں
شہر میں جالبؔ تم سے بھی کم ہی دیوانے ہوں گے

اُٹھتا ہوا چمن سے دھواں دیکھتے چلو
شاخوں پہ رقصِ برقِ تپاں دیکھتے چلو

لٹتی ہوئی متاعِ بیاں دیکھتے چلو
کٹتی ہوئی وفا کی زباں دیکھتے چلو

ہر سُو فروغِ وہم و گماں دیکھتے چلو
مٹتا ہوا یقیں کا نشاں دیکھتے چلو

اپنے سے کچھ کہو نہ پرائے سے کچھ کہو
دل سوز و دل گداز سماں دیکھتے چلو

جلتا ہوا کسی کا نشیمن سرِ چمن
خاطر پہ ہو ہزار گراں دیکھتے چلو

توہینِ اہلِ حُسن کہ تضحیکِ اہلِ شوق
سب کچھ بجُرمِ زیست یہاں دیکھتے رہو

ہر چند ناپسند ہو تحسینِ ناشناس
چپ چاپ شعریت کا زیاں دیکھتے چلو

اِس شہرِ تیرگی میں نگاہِ خموش سے
شب دوستوں کو رقص کناں دیکھتے چلو

★

جاگنے والو تا بہ سحر خاموش رہو
کل کیا ہوگا کس کو خبر خاموش رہو

کس نے سحر کے پاؤں میں زنجیریں ڈالیں
ہو جائے گی رات بسر خاموش رہو

کس نے سنی ہے اس بستی میں دل کی بات
کس پہ ہوا آہوں کا اثر خاموش رہو

شاید چُپ رہنے میں عزت رہ جائے
چپ ہی بھلی اے اہلِ نظر خاموش رہو

قدم قدم پر پہرے ہیں ان راہوں میں
دار و رسن کا ہے یہ نگر خاموش رہو

یوں بھی کہاں بے تابیٔ دل کم ہوتی ہے
یوں بھی کہاں آرام، مگر خاموش رہو

شعر کی باتیں ختم ہوئیں اس عالم میں
کیسا جوشؔ اور کس کا جگرؔ خاموش رہو

★

جہاں خطرے میں ہے اسلام اس میدان میں جاؤ
ہماری جان کے درپے ہو کیوں لبنان میں جاؤ
دھواں ہے خون ہے چیخیں ہیں اور لاشیں ہی لاشیں ہیں
ستم کی آندھیوں میں ظلم کے طوفان میں جاؤ
کنارے سے کہاں ہوتا ہے اندازہ تلاطم کا
ذرا موجوں سے ٹکراؤ ذرا طغیان میں جاؤ
فقط تشویش ہی سے ظلم کا سر جھک نہیں سکتا
یہاں جولانیاں کیا خطّۂ جولان میں جاؤ
کیے ہیں غاصبوں نے ظلم وہ اہلِ فلسطیں پر
قیامت کا سماں ہے خانۂ جبران میں جاؤ
اجازت مانگتے ہیں ہم بھی جب بیروت جانے کی
تو اصل الحکم فرماتے ہیں تم زندان میں جاؤ

★

دل والو کیوں دل سی دولت یوں بیکار لٹاتے ہو
کیوں اس اندھیاری بستی میں پیار کی جوت جگاتے ہو

تم ایسا نادان جہاں میں کوئی نہیں ہے کوئی نہیں
پھر ان گلیوں میں جاتے ہو پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

سندر کلیو کومل پھولو یہ تو بتاؤ یہ تو کہو
آخر تم میں کیا جادو ہے کیوں من میں بس جاتے ہو

یہ موسم رم جھم کا موسم یہ برکھا یہ مست فضا
ایسے میں آؤ تو جانیں ایسے میں کب آتے ہو

ہم سے روٹھ کے جانے والو اتنا بھید بتا جاؤ
کیوں نت راتوں کو سپنوں میں آتے ہو من جاتے ہو

چاند ستاروں کے جھرمٹ میں پھولوں کی مسکاہٹ میں
تم چھپ چھپ کر ہنستے ہو تم روپ کا مان بڑھاتے ہو

چلتے پھرتے روشن رستے تاریکی میں ڈوب گئے
سو جاؤ اب جالب تم بھی کیوں آنکھیں سلگاتے ہو

★

شب کو چاند اور دن کو سورج بن کر روپ دکھاتی ہو
پل چھن آنکھوں کی گلیوں میں تم آنچل لہراتی ہو

تم سے جگ اجیارا سارا روشن بستی بستی ہے
سانجھ سویرے دیپ دیئے جیون جوت جگاتی ہو

کتنی روشن ہے تنہائی جب سے یہ معلوم ہوا
میرے لیے اپنی پلکوں پر تم بھی دیپ جلاتی ہو

اے میری انمول غزل یہ بات بھی مجھ تک پہنچی ہے
یاران لاہور میں اب تک تم میری کہلاتی ہو

میر ہو غالب ہو یا جالب گیت تمہارے گاتے ہیں
سب کے شعروں میں تم اپنی سندر چھب دکھلاتی ہو

★

لوگوں ہی کا خوں بہہ جاتا ہے ہوتا نہیں کچھ سلطانوں کو
طوفاں بھی نہیں زحمت دیتے ان کے سنگیں ایوانوں کو

ہر روز قیامت ڈھاتے ہیں تیرے بے بس انسانوں پر
اے خالقِ انساں تو سمجھا اپنے خونی انسانوں کو

دیواروں میں سہمے بیٹھے ہیں کیا خوب ملی ہے آزادی
اپنوں نے بہایا خوں اتنا، ہم بھول گئے بیگانوں کو

اک اک پل ہم پر بھاری ہے دہشت تقدیر ہماری ہے
گھر میں بھی نہیں محفوظ کوئی باہر بھی ہے خطرہ جانوں کو

غم اپنا بھلائیں جا کے کہاں ہم ہیں اور شہرِ آہ و فغاں
ہیں شام سے پہلے لوگ رواں اپنے اپنے غم خانوں کو

نکلیں کہ نہ نکلیں ان کی رضا بندوق ہے ان کے ہاتھوں میں
سادہ تھے بزرگ اپنے جالب گھر سونپ گئے دربانوں کو

★

آگ ہے پھیلی ہوئی کالی گھٹاؤں کی جگہ
بد دعائیں ہیں لبوں پر اب دعاؤں کی جگہ

انتخابِ اہلِ گلشن پر بہت روتا ہے دل
دیکھ کر زاغ و زغن کو خوش نواؤں کی جگہ

کچھ بھی ہوتا پر نہ ہوتے پارہ پارہ جسم و جاں
راہزن ہوتے اگر ان رہنماؤں کی جگہ

لٹ گئی اس دور میں اہلِ قلم کی آبرو
بک رہے ہیں اب صحافی بیسواؤں کی جگہ

کچھ تو آتا ہم کو بھی جاں سے گذرنے کا مزہ
غیر ہوتے کاش جالبؔ آشناؤں کی جگہ

★

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتّوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی پیغام گل تک نہ پہنچا مگر پھر بھی شام و سحر
نازِ بادِ چمن کے اٹھاتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی ہنس کے ملے غنچۂ دل کھلے چاک دل کا سلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلک غیر ہے یہ زمیں کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

★

اس دیس کا رنگ انوکھا تھا اس دیس کی بات نرالی تھی
نغموں سے بھرے دریا تھے، واں گیتوں سے بھری ہریالی تھی

اس شہر سے ہم آجائیں گے اشکوں کے دیپ جلائیں گے
یہ دور بھی آنے والا تھا یہ بات بھی ہونے والی تھی

وہ روشن گلیاں یاد آئیں وہ پھول وہ کلیاں یاد آئیں
سندر من چلیاں یاد آئیں، ہر آنکھ جدھر متوالی تھی

کس بستی میں آپہنچے ہم ہر گام پہ ملتے ہیں سو غم
پھر چل اس نگری میں ہمدم ہر شام جہاں اُجیالی تھی

وہ بام و در وہ راہگزر دل خاک بسر جاں خاک بسر
جالب وہ پریشاں حالی بھی کیا خوب پریشاں حالی تھی

★

اگر ہے تو بس حسن کی ذات برحق
اگر ہے تو بس عشق کی بات اچھی

درِ میکدہ پر ملے شیخ صاحب
رہی آج ان سے ملاقات اچھی

سبھی بادہ خوار اُٹھ گئے ہیں وہ جالب
کہ جن سے تھی شام خرابات اچھی

بہت روشن ہے شامِ غم ہماری
کسی کی یاد ہے ہمدم ہماری

غلط ہے لاتعلق ہیں چمن سے
تمھارے پھول اور شبنم ہماری

یہ پلکوں پر نئے آنسو نہیں ہیں
ازل سے آنکھ ہے پُرنم ہماری

ہراک لب پر تبسم دیکھنے کی
تمنا کب ہوئی ہے کم ہماری

کہی ہے ہم نے خود سے بھی بہت کم
نہ پوچھو داستانِ غم ہماری

★

کیسی ہوا گلشن میں چلی
مُرجھائی ایک ایک کلی

دل کی کہانی کیا کہیے
اپنی ہی آگ شمع جلی

اُس لَٹ کا الجھاؤ کیا
ایک بلا تو سر سے ٹلی

دنیا نے وہ درد دیے
بھول گئے ہم ان کی گلی

بول کے جالب قدر نہ کھو
اس ماحول میں چپ ہی بھلی

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند یہ پُر نور ستارے
تابندہ و پایندہ ہیں ذرّوں کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

★

اُس گلی کے لوگوں کو منہ لگا کے پچھتائے
ایک درد کی خاطر کتنے درد اپنائے

تھک کے سو گیا سورج شام کے دھندلکوں میں
آج بھی کئی غنچے پھول بن کے مرجھائے

ہم ہنسے تو آنکھوں میں تیرنے لگی شبنم
تم ہنسے تو گلشن نے تم پہ پھول برسائے

اُس گلی میں کیا کھویا اس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے تشنہ کام لوٹ آئے

پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج پھیلتے ہوئے سائے

جالبؔ ایک آوارہ الجھنوں کا گہوارہ
کون اس کو سمجھائے کون اس سلجھائے

★

اے دوست رہِ زیست میں زنداں نہ رہیں گے
آئے گی سحر، لوگ پریشاں نہ رہیں گے

صیّاد کے ہم پنجۂ بیداد سے ڈر کر
تزئینِ گلستاں سے گریزاں نہ رہیں گے

ہم دہر میں انسان کی عظمت کا نشاں ہیں
ہم ہوں گے مگر دشمنِ انساں نہ رہیں گے

صدیوں کی یہ رات ہے اب ڈھلنے پہ مجبور
اشکوں کے ستارے سرِ مژگاں نہ رہیں گے

ان قصر نشینوں سے ہے بیزار زمانہ
یہ میر و وزیر اور یہ سلطاں نہ رہیں گے

اک راہ پہ مل کر ہمیں چلنے کی ہے بس دیر
کچھ لوگ نمایاں ہیں نمایاں نہ رہیں گے

اس دور کے ممتاز ادیبوں کو بتا دو،
تاریخ میں شاہوں کے ثنا خواں نہ رہیں گے

★

بجلیوں کی یورش سے شاخ شاخ لرزاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے کیا یہی گلستاں ہے

آج بھی نگاہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں
آج بھی نگاہوں میں کائنات ویراں ہے

تیرے گیسوؤں ہی پر میری جاں نہیں موقوف
ذرہ ذرہ ہستی کا آج کل پریشاں ہے

مل ہی جائے گی منزل کٹ ہی جائے گی مشکل
اے مرے نئے ساتھی کس لیے ہراساں ہے

★

بڑھائیں گے نہ کبھی ربط ہم بہاروں سے
ٹپک رہے لہو اب بھی شاخساروں سے

کہیں تو اپنی محبت چھلک کے آتا ہے
کچھ ایسے داغ بھی ہم کو ملے ہیں یاروں سے

نگاہِ دہر میں ذرے سہی مگر ہم لوگ
ضیا کی بھیک نہیں مانگتے ستاروں سے

وہ داستاں ہیں کہ دہرائے گی جسے دنیا
وہ بات ہیں جو سنی جائے گی نگاروں سے

ہمارے نام سے ہے آشنا چمن سارا
سخن کی داد ملی ہے ہمیں ہزاروں سے

فضا نہیں ہے ابھی کھل کے بات کرنے کی
بدل رہے ہیں زمانے کو ہم اشاروں سے

نہ چھوڑنا کبھی طوفاں میں اس کی پتوار
یہ آ رہی ہے صدا دم بہ دم کناروں سے

جہاں میں آج بھی محفوظ ہیں وہی نغمے
محبتوں میں جو ابھرے ہیں دل کے تاروں سے

بزرگ بیٹھ کے لکھتے تھے عرش پر جالبؔ
اٹھائی بات مگر ہم نے رہگزاروں سے

★

بکھیری زلف جب کالی گھٹا نے
نظر میں پھر گئے بیتے زمانے

جنوں کچھ اور بھی نکھرا ہمارا
بگاڑا کچھ نہ صحرا کی ہوا نے

میانوالی میں کر کے قید مجھ کو
بہت احساں کیا اہلِ جفا نے

ہوا اس شہر میں محروم پیدا
لکھے اس نے یہاں دل کے فسانے

بنایا شہرِ جاں ریگِ رواں کو
محبت سے محبت آشنا نے

مجھے ملتے دکھائی دے رہے ہیں
یہ زنداں اور یہ مقتل پرانے

گریں گی نفرتوں کی سب فصیلیں
یہاں گونجیں گے الفت کے ترانے

میانوالی مرا لاہور میرا
مجھے لگتے ہیں سب منظر سہانے

قفس میں مر چلے تھے ہم تو جالبؔ
بچایا ہم کو آوازِ لتا نے

★

بھلا بھی دے اُسے جو بات ہو گئی پیارے
نئے چراغ جلا رات ہو گئی پیارے

تری نگاہِ پشیماں کو کیسے دیکھوں گا
کبھی جو تجھ سے ملاقات ہو گئی پیارے

نہ تیری یاد، نہ دُنیا کا غم نہ اپنا خیال
عجیب صورتِ حالات ہو گئی پیارے

اداس اداس ہیں شمعیں بجھے بجھے ساغر
یہ کیسی شامِ خرابات ہو گئی پیارے

کبھی کبھی تیری یادوں کی سانولی رُت میں
بہے جو اشک تو برسات ہو گئی پیارے

وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں
ہم اہلِ دل کو اگر مات ہو گئی پیارے

تمھیں تو ناز بہت دوستوں پہ تھا جالب
الگ تھلگ سے ہو کیا بات ہو گئی پیارے

★

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے

دُور افتادہ بستیوں میں کہیں
تیری یادوں سے لو لگائیں گے

شمعِ ماہ و نجوم گُل کر کے
آنسوؤں کے دیئے جلائیں گے

آخری بار اک غزل سن لو
آخری بار ہم سنائیں گے

صورتِ موجۂ ہوا جالب
ساری دُنیا کی خاک اڑائیں گے

★

ترے ماتھے پہ جب تک بل رہا ہے
اجالا آنکھ سے اوجھل رہا ہے

سمٹتے کیا نظر میں چاند تارے
تصور میں ترا آنچل رہا ہے

تری شانِ تغافل کو خبر کیا
کوئی تیرے لیے بے کل رہا ہے

شکایت ہے غمِ دوراں کو مجھ سے
کہ دل میں کیوں ترا غم پل رہا ہے

تعجب ہے ستم کی آندھیوں میں
چراغِ دل ابھی تک جل رہا ہے

لہو روئیں گی مغرب کی فضائیں
بڑی تیزی سے سورج ڈھل رہا ہے

زمانہ تھک گیا، جالبؔ ہی تنہا
وفا کے راستے پر چل رہا ہے

★

تم سادہ و معصوم ہو اور ہم ہیں گنہگار
دنیا کی نگاہوں سے کہیں بات چھپی ہے

ہنسنے پہ نہ مجبور کرو، لوگ ہنسیں گے
حالات کی تفسیر تو چہرے پہ لکھی ہے

دیکھا ہے زمانے کو گلے ہم نے لگا کر
سینہ تری دنیا کا محبت سے تہی ہے

وہ بھول گئے ہم کو، انھیں بھول گئے ہم
اے دوست مگر دل میں خلش اب بھی وہی ہے

مل جائیں کہیں وہ بھی تو ان کو بھی سنائیں
جالبؔ یہ غزل جن کے لیے ہم نے کہی ہے

★

جاگ اُٹھے سوئے ہوئے درد تمناؤں کے
راستے ذہن میں لہرا گئے اس گاؤں کے

اک تری یاد سے اک تیرے تصور سے ہمیں
آ گئے یاد کئی نام حسیناؤں کے

صبح سے شام تلک گرم ہوا چلتی ہے
دن بہت سخت ہیں تپتے ہوئے صحراؤں کے

اس کڑی دھوپ میں یاد آتے ہیں تڑپاتے ہیں
ہم کو احسان درختوں کی گھنی چھاؤں کے

وہ حسیں پھول وہ سبزہ وہ فسوں ساز دیار
وہ مدھر گیت محبت بھرے دریاؤں کے

جانے کس حال میں ہیں کون بتائے جالبؔ
ارضِ پنجاب میں پودے مری آشاؤں کے

★

جس کی آنکھیں غزل ہر ادا شعر ہے
وہ مری شاعری ہے مرا شعر ہے

وہ جبیں زلف شب کا فسانہ لیے
وہ بدن نغمگی وہ قبا شعر ہے

وہ تکلم لہکتی ہوئی چاندنی
وہ تبسم مہکتا ہوا شعر ہے

پھول بھی ہیں بہاریں بھی ہیں گیت بھی
ہم نشیں اس گلی کی فضا شعر ہے

جس سے روشن تھا دل وہ کرن چھن گئی
اپنے جینے کا اب آسرا شعر ہے

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میرؔ کا شعر تو میرؔ کا شعر ہے

میں جہانِ ادب میں اکیلا نہیں
ہر قدم پر مرا ہم نوا شعر ہے

عرش پر خود کو محسوس ہم نے کیا
جب کسی نے کہا واہ کیا شعر ہے

اک قیامت ہے جالبؔ یہ تنقیدِ نو
جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعر ہے

★

جب کوئی کلی صحنِ گلستاں میں کھلی ہے
شبنم مری آنکھوں میں وہیں تیر گئی ہے

جس کی سرِ افلاک بڑی دھوم مچی ہے
آشفتہ سری ہے، مری آشفتہ سری ہے

اپنی تو اجالوں کو ترستی ھیں نگاہیں
سورج کہاں نکلا ہے، کہاں صبح ہوئی ہے

ہم کشمکشِ دیر و حرم سے ہیں بہت دُور
انسان کی عظمت پہ نظر اپنی رہی ہے

بچھڑی ہوئی راہوں سے جو گزرے ہیں کبھی ہم
ہر گام پہ کھوئی ہوئی اک یاد ملی ہے

اک عمر سنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

★

جھوٹی خبریں گھڑنے والے جھوٹے شعر سنانے والے
لوگو صبر کرو اپنے کیے کی جلد سزائیں پانے والے

درد تو آنکھوں سے بہتا ہے اور چہرہ سب کچھ کہتا ہے
یہ مت لکھو وہ مت لکھو آئے بڑے سمجھانے والے

خود کاٹیں گے اپنی مشکل خود پائیں گے اپنی منزل
راہزنوں سے بھی بدتر ہیں راہنما کہلانے والے

ان سے پیار کیا ہے ہم نے انکی راہ میں ہم بیٹھے ہیں
ناممکن ہے جن کا ملنا اور نہیں جو آنے والے

ان پر بھی ہنستی تھی دنیا آوازے کستی تھی دُنیا
جالبؔ اپنی ہی صورت تھے عشق میں جاں سے جانے والے

★

جی دیکھا ہے مر دیکھا ہے
ہم نے سب کچھ کر دیکھا ہے

برگِ آوارہ کی صورت
رنگِ خشک و تر دیکھا ہے

ٹھنڈی آہیں بھرنے والو
ٹھنڈی آہیں بھر دیکھا ہے

تیری زلفوں کا افشا
رات کے ہونٹوں پر دیکھا ہے

اپنے دیوانوں کا عالم
تم نے کب آ کر دیکھا ہے

انجم کی خاموش فضا میں
میں نے تمھیں اکثر دیکھا ہے

ہم نے اس بستی میں جالبؔ
جھوٹ کا اونچا سر دیکھا ہے

★

حسرت رہی کوئی تو یہاں دیدہ ور ملے
لیکن تری گلی میں سبھی کم نظر ملے

ایسے بھی آشنا ہیں نہ دیکھا جنھیں کبھی
نا آشنا تھے وہ بھی جو شام و سحر ملے

شاید اسی لیے ہمیں منزل نہ مل سکی
جتنے بھی ہم کو لوگ ملے راہبر ملے

لکھی تھیں جن پہ اپنے جنوں کی حکایتیں
آوارگی میں ایسے بھی کچھ بام و در ملے

کیا کیا نظر نظر میں ہوئی گفتگو نہ پوچھ
مدت کے بعد جب وہ سرِ رہ گزر ملے

ہم کو تو داغِ دل کے سوا کچھ نہ مل سکا
ان بستیوں میں پیار کسی کو مگر ملے

جالبؔ ہوائے لعل و گہر تھی نہ آج ہے
وہ سنگِ در عزیز ہے وہ سنگِ در ملے

★

درخت سوکھ گئے رک گئے ندی نالے
یہ کس نگر کو روانہ ہوئے گھروں والے

کہانیاں جو سناتے تھے عہد رفتہ کی
نشاں وہ گردشِ ایام نے مٹا ڈالے

میں شہر شہر پھرا ہوں اسی تمنا میں
کسی کو اپنا کہوں کوئی مجھ کو اپنا لے

صدا نہ دے کسی مہتاب کو اندھیروں میں
لگا نہ دے یہ زمانہ زبان پر تالے

کوئی کرن ہے یہاں تو کوئی کرن ہے وہاں
دل و نگاہ نے کس درجہ روگ ہیں پالے

ہمیں پہ اُن کی نظر ہے ہمیں پہ ان کا کرم
یہ اور بات یہاں اور بھی ہیں دل والے

کچھ اور تجھ پہ کھلیں گی حقیقتیں جالبؔ
جو ہو سکے تو کسی کا فریب بھی کھا لے

★

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

خامشی پر ہیں لوگ زیرِ عتاب
اور ہم نے تو بات بھی کی ہے

مطمئن ہے ضمیر تو اپنا
بات ساری ضمیر ہی کی ہے

اپنی تو داستاں ہے بس اتنی
غم اٹھائے ہیں شاعری کی ہے

اب نظر میں نہیں ہے ایک ہی پھول
فکر ہم کو کلی کلی کی ہے

پا سکیں گے نہ عمر بھر جس کو
جستجو آج بھی اسی کی ہے

جب مہ و مہر بجھ گئے جالبؔ
ہم نے اشکوں سے روشنی کی ہے

★

دنیا ہے کتنی ظالم ہنستی ہے دل دکھا کے
پھر بھی نہیں بجھے ہیں ہم نے دیئے وفا کے

ہم نے سلوکِ یاراں دیکھا جو دشمنوں سا
بھر آیا دل ہمارا روتے ہیں منہ چھپا کے

کیوں کر نہ ہم بٹھائیں پلکوں پہ ان غموں کو
شام و سحر یہی تو ملتے ہیں مسکرا کے

تا عمر اس ہنر سے اپنی نہ جان چھوٹی
کھاتے رہے ہیں پتھر ہم آئینہ دکھا کے

اس زلفِ خم بہ خم کا سر سے گیا نہ سودا
دنیا نے ہم کو دیکھا سو بار آزما کے

جب لب ہوا قفس میں یہ راز آشکارا
اہلِ جنوں کے بھی تھے کیا حوصلے بلا کے

★

زندگی بھر ذہن و دل پر خوف کے سائے رہے
ہائے سچائی کے کتنے پھول مرجھائے رہے

عمر اپنی لٹ گئی محرومیوں کی دھوپ میں
چند لوگوں کا مقدر زلف کے سائے رہے

روشنی کے دشمنوں نے روشنی ہونے نہ دی
ایک مدت تک خیال و فکر دھندلائے رہے

دوسروں کو روشنی دیتے رہے دن رات ہم
اپنے ارمانوں کے سورج چاند گہنائے رہے

آ رہی ہے آنے والی ہے محبت کی سحر
ہم یہی کہہ کہہ کے اپنے دل کو بہلاتے رہے

سونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے
ایک خموشی ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے

کتنی دور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے

پھر سورج کے ساتھ ترے ملنے کا امکاں ڈوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے

پھر ان پیار بھری ندیوں کی یاد میں آنکھیں پُرنم ہیں
پھر اس بچھڑے دیس کے غم میں شہر دل و جاں ویراں ہے

جالبؔ آپ اس جانِ غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پر سوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے

★

شامِ غم کو سحر کہوں کیسے
دوستوں کو فریب دوں کیسے

دار تک سب پہنچ گئے ہیں یار
دوش پر سر لیے پھروں کیسے

عمر بھر ساتھ چلنے والوں کو
یوں سرِ راہ چھوڑ دوں کیسے

اب کہاں خوں اسے پلانے کو
اُس ستمگر سے اب ملوں کیسے

دو قدم پر ہے منزلِ جاناں
اب رہِ عشق میں رُکوں کیسے

مجھ میں جب تک ہے زندگی باقی
ظلم سے ہار مان لوں کیسے

قاتلِ مہر و ماہ کو جالبؔ
امن کی روشنی کہوں کیسے

ظلمت کو جو فروغ ہے دیدہ وروں سے ہے
یہ کاروبارِ شب انہی سوداگروں سے ہے

اٹھیں تو ہر غرورِ شہی خاک میں ملے
قصرِ بلند بام، خمیدہ سروں سے ہے

یہ اور بات اس پہ مسلط ہیں بد نہاد
یہ خوش نما دیار ہمیں بے گھروں سے ہے

کیا عقل کیا شعور کی باتیں کریں یہاں
سر کو معاملہ تو یہاں پتھروں سے ہے

اب سے نہیں ہیں تشنہ لبوں کو شکایتیں
یہ میکدہ تو کب سے تہی ساغروں سے ہے

★

عشق میں نام کر گئے ہوں گے
جو ترے غم میں مر گئے ہوں گے

اب وہ نظریں ادھر نہیں اٹھتیں
ہم نظر سے اتر گئے ہوں گے

کچھ فضاؤں میں انتشار سا ہے
ان کے گیسو بکھر گئے ہوں گے

نور بکھرا ہے رہگزاروں میں
وہ ادھر سے گزر گئے ہوں گے

میکدے میں کہ بزمِ جاناں تک
اور جالب کدھر گئے ہوں گے

غم وطن جو نہ ہوتا تو مقتدر ہوتے
ہم آسماں کے برابر زمین پر ہوتے

ہمیں خیال نہ ہوتا جو بے نواؤں کا
قفس میں یوں نہ سلگتے ہم اپنے گھر ہوتے

نشاط و عیش سے کرتے بسر حیات اپنی
نہ بے کسی پہ کسی کی جو چشم تر ہوتے

جھکا کے سر کو جو چلتے تو رفعتیں پاتے
صعوبتیں نہ اٹھاتے جو بے ضرر ہوتے

بزرگ راہنما کون پھر انھیں کہتا
اگر یہ راہ نما راہ راست پر ہوتے

★

قسمت پہ ناز ہے تو اسی اعتبار سے
دل کو رہی ہے راہ سدا کوئے یار سے

ایسی غزل کہی نہ کہیں گے تمام عمر
انعام و داد جس پہ ملے شہر یار سے

جس پر تھا اک ہجوم کبھی اہلِ شوق کا
تنہا گزر رہے ہیں اب اس رہ گزار سے

ترکِ وفا کا دل میں نہ آنے دیا خیال
اس آئینے کو ہم نے بچایا غبار سے

کچھ اور ہو گیا ہے۔ وہ شاعر نہیں رہا
وابستہ ہو گیا جو کسی تاجدار سے

★

کیا یہ کس نے تقاضا ہمیں سزا ملے
ہر اک فراق گوارا مگر کتاب ملے

یہ سوچ کر نہ کبھی ہم نے عرضِ حال کیا
کہ اُس طرف سے ہمیں جانے کیا جواب ملے

نہ کوہ پر اُنھیں دیکھا نہ دشت میں پایا
عدالتوں ہی میں عشاقِ انقلاب ملے

ہمارے سامنے اُبھرے اُبھر کے ڈوب گئے
اُفق پہ ایسے بھی کچھ ہم کو آفتاب ملے

بہار آئی مگر ہم کو یہ رہی حسرت
کسی روش پہ مہکتا کوئی گلاب ملے

مئے بہ راہِ وطن میں پڑے ہیں زنداں میں
وہ حکمراں ہیں سروں کے جنھیں خطاب ملے

اسیرِ رنج و محن اک ہمیں نہ تھے جالب
قفس میں اور بہت خانماں خراب ملے

★

کون بتائے کون سجھائے کون سے دیس سدھار گئے
ان کا رستہ تکتے تکتے نین ہمارے ہار گئے

کانٹوں کے دکھ سہنے میں تسکین بھی تھی آرام بھی تھا
ہنسنے والے بھولے بھالے پھول چمن کے مار گئے

ایک لگن کی بات ہے جیون ایک لگن ہی جیون ہے
پوچھ نہ کیا کھویا کیا پایا کیا جیتے کیا ہار گئے

آنے والی برکھا دیکھیں کیا دکھلائے آنکھوں کو
یہ برکھا برساتے دن تو بن پریتم بیکار گئے

جب بھی لوٹے پیار سے لوٹے پھول نہ پا کر گلشن میں
بھنورے امرت رس کی دھن میں پل پل سو سو بار گئے

ہم سے پوچھو ساحل والو کیا بیتی دکھیاروں پر
کھیون ہارے بیچ بھنور میں چھوڑ کے جب اُس پار گئے

★

کہیں آہ بن کے لب پر ترا نام آنہ جائے
تجھے بے وفا کہوں میں وہ مقام آنہ جائے

ذرا زلف کو سنبھالو مرا دل دھڑک رہا ہے
کوئی اور طائر دل تہہ دام آ نہ جائے

جسے سن کے ٹوٹ جائے مرا آرزو بھرا دل
تری انجمن سے مجھ کو وہ پیام آنہ جائے

وہ جو منزلوں پہ لاکر کبھی ہم سفر کو لوٹیں
انھیں رہزنوں میں تیرا کہیں نام آنہ جائے

اسی فکر میں ہیں غلطاں یہ نظام زر کے بندے
جو تمام زندگی ہے وہ نظام آنہ جائے

یہ مہ و نجوم ہنس لیں مرے آنسوؤں پہ جب تک
مرا ماہتاب جب تک لب بام آنہ جائے

★

گلشن کی فضا دھواں دھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے

بکھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
ٹوٹی ہوئی شاخ آشیاں ہے

جس دل سے ابھر رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے

ہم ہی نہیں پائمال تنہا
اے دوست! تباہ اک جہاں ہے

جالب وہ کہاں ہے عشق تیرا
پیارے وہ غزل تری کہاں ہے

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ، وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رُت وہ سماں چھوڑ آئے

بہت دُور ہم آ گئے اُس گلی سے
بہت دور وہ آستاں چھوڑ آئے

★

بہت مہرباں تھیں وہ گلپوش راہیں
مگر ہم انھیں مہرباں چھوڑ آئے

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے

یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے اُن رہگزاروں سے جالب
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

منصف ہوئے بیدار اسیروں کی فغاں سے
الجھے ہیں کچھ انوار اندھیروں کے جہاں سے

اِک زلف کی خاطر نہیں، انصاف کی خاطر
ٹکراتے ہیں ہر دور میں ہم کوہِ گراں سے

نظروں میں وہی زلف کے خم عارض و لب ہیں
نکلے ہیں کہاں آج بھی ہم کوئے بتاں سے

ابھرے نہیں ہم سطح سے دو گز بھی مری جاں
ہو آتے ہیں اغیار مہ و کاہکشاں سے

نقاد تو بن جائیں گے حاسد مرے جالب
لائیں گے مرا حُسنِ ردیف وہ کہاں سے

★

میر و غالب بنے یگانہ بنے
آدمی اے خدا خدا نہ بنے

موت کی دسترس میں کب سے ہیں
زندگی کا کوئی بہانہ بنے

اپنا شاید یہی تھا جرم اے دوست
با وفا بن کے بے وفا نہ بنے

ہم پہ اک اعتراض یہ بھی ہے
بے نوا ہو کے بے نوا نہ بنے

یہ بھی اپنا قصور کیا کم ہے
کسی قاتل کے ہم نوا نہ بنے

کیا گلہ سنگدل زمانے کا
آشنا ہی جب آشنا نہ بنے

چھوڑ کر اُس گلی کو اے جالب
اک حقیقت سے ہم فسانہ بنے

میری بانہوں میں رہے میری نگاہوں میں رہے
اس سے پہلے اس قدر کب وہ خیالوں میں رہے

رفتگاں کو یاد کرنے کی بہت فرصت ملی
میری آنکھوں میں رہے وہ میرے اشکوں میں رہے

آشیاں سے بھی قفس کی زندگی اچھی لگی
رات دن بچھڑے ہوئے احباب یادوں میں رہے

موت بھی ان کو جدا مجھ سے نہ جالبؔ کر سکی
میرے گیتوں میں رہے وہ میری غزلوں میں رہے

نظر نظر میں لیے تیرا پیار پھرتے ہیں
مثالِ موجِ نسیمِ بہار پھرتے ہیں

ترے دیار سے ذروں نے روشنی پائی
ترے دیار میں ہم سوگوار پھرتے ہیں

یہ حادثہ بھی عجب ہے کہ تیرے دیوانے
لگائے دل سے غمِ روزگار پھرتے ہیں

لیے ہوئے ہیں دو عالم کا درد سینے میں
تری گلی میں جو دیوانہ وار پھرتے ہیں

بہار آکے چلی بھی گئی مگر جالبؔ
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں

★

نہ وہ ادائے تکلم نہ احتیاطِ زباں
مگر یہ ضد کہ ہمیں اہلِ لکھنؤ کہیے

نہ دل میں رقصِ غزل ہے نہ دھڑکنوں کے گیت
اجڑ گیا ہے جسے شہرِ آرزو کہیے

کہاں اب انکو پکاریں کہاں گئے وہ لوگ
جنھیں فسونِ طرب موجِ رنگ و بو کہیے

غزل کی بات جو کرتا ہے کم نظر نقاد
اسے بھی شیخ کا اندازِ گفتگو کہیے

ادب کا آپ ہی تنہا نہ ساتھ دیں جالبؔ
کہے جو آپ کو تم آپ اس کو تو کہیے

★

وطن سے الفت ہے جرم اپنا یہ جرم تا زندگی کریں گے
ہے کس کی گردن پہ خونِ ناحق یہ فیصلہ لوگ ہی کرینگے

وطن پرستوں کو کہہ رہے ہو وطن کا دشمن ڈرو خدا سے
جو آج ہم سے خطا ہوئی ہے یہی خطا کل سبھی کرینگے

وظیفہ خواروں سے کیا شکایت ہزار دیں شاہ کو دعائیں
مدار جن کا ہے نوکری پر وہ لوگ تو نوکری کرینگے

لئے جو پھرتے ہیں تمغۂ فن رہے ہیں جو ہم خیالِ رہزن
ہماری آزادیوں کے دشمن ہماری کیا رہبری کرینگے

نہ خوفِ زنداں نہ دار کا غم یہ بات دہرا رہے ہیں پھر ہم
کہ آخری فیصلہ وہ ہوگا جو دس کروڑ آدمی کرینگے

ستم گروں کے ستم کے آگے نہ سر جھکا ہے نہ جھک سکے گا
شعارِ صادق پہ ہم ہیں نازاں جو کہہ رہے ہیں وہی کریں گے

یہ لوگ کچھ کم نگاہ جن کو سمجھ رہے ہیں کہ نا سمجھ ہیں
یہی زمانے میں عام جالبؔ شعور کی روشنی کریں گے

★

ہم آوارہ گاؤں گاؤں بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت بڑھا کر کوئی مفت میں کیوں غم کو اپنا لے

یہ بھیگی بھیگی برساتیں یہ مہتاب یہ روشن راتیں
دل ہی نہ ہو تو جھوٹی باتیں کیا اندھیارے کیا اُجیالے

غنچے روئیں کلیاں روئیں رو رو اپنی آنکھیں کھوئیں
چین سے لمبی تان کے سوئیں اس پھلواری کے رکھوالے

درد بھرے گیتوں کی مالا جپتے جپتے جیون گزرا
کس نے سنی ہیں کون سنے گا دل کی باتیں دکھنے والے

★

ہم کو نظروں سے گرانے والے
ڈھونڈ اب ناز اٹھانے والے
چھوڑ جائیں گے کچھ ایسی یادیں
روئیں گے ہم کو زمانے والے
رہ گئے نقش ہمارے باقی
مٹ گئے ہم کو مٹانے والے
منزلِ گُل کا پتا دیتے ہیں
راہ میں خار بچھانے والے
ان زمینوں پہ گہر برسیں گے
ایسے کچھ ابر ہیں چھانے والے
دیکھ وہ صبح کا سورج نکلا
مسکرا اشک بہانے والے

آس میں بیٹھے ہیں جن کی جالبؔ
وہ زمانے بھی ہیں آنے والے

★

یونہی پیار سے کوئی منصور بنا کرتا ہے
حُسن یہ عشقِ صداقت سے ملا کرتا ہے

لاکھ کہتے رہیں وہ چاک گریباں نہ کروں
کبھی دیوانہ بھی پابند ہوا کرتا ہے

اذن سے لکھنے کا فن ہم کو نہ اَب تک آیا
وہی لکھتے ہیں جو دل ہم سے کہا کرتا ہے

اُس کے ممنون ہی ہو جاتے ہیں درپئے اُسکے
کیا بُرا کرتا ہے جو شخص بھلا کرتا ہے

اُس کی آواز سنو شہر کے دانشمندو
دُور پربت پہ کوئی آہ و بکا کرتا ہے

روز کر جاتا ہے کچھ اور پریشاں مجھ کو
خوب اخبار مرے دُکھ کی دوا کرتا ہے

آج یہ عیب ہے جالبؔ تجھے معلوم نہیں
جان کر حُسن تو ہر اک سے وفا کرتا ہے

★

یہ اُجڑے باغ ویرانے پُرانے
سناتے ہیں کچھ افسانے پُرانے

اک آہِ سرد بن کر رہ گئے ہیں
وہ بیتے دن وہ یارانے پُرانے

جنوں کا ایک ہی عالم ہو کیونکر
نئی ہے شمع پروانے پُرانے

نئی منزل کی دشواری مُسلّم
مگر ہم بھی ہیں دیوانے پُرانے

ملے گا پیار غیروں ہی میں جالبؔ
کہ اپنے تو ہیں بیگانے پُرانے

سید جعفر احمد

حبیب جالب کا ایک یادگار انٹرویو

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوق آوارگی
اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا شوق آوارگی

حبیب جالب کا شوق آوارگی کوئی پچیس تیس برس سے جاری ہے۔ ہر آنے والا دن اس شوق کی لو کو اور بڑھا دیتا ہے۔ اڑتے پتے ان کے خیالوں' خوابوں اور آدرشوں کا استعارہ ہیں... ان آدرشوں کے تعاقب میں وہ شہروں شہروں' قریوں قریوں' پھرے ہیں۔ جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکے ہیں وہاں ان کی آواز پہنچی ہے شوق آوارگی ایک پا بجولاں شاعر کا نعرہ مستانہ ہی نہیں ایک نسل کی مسلک حیات بھی ہے۔

ہم اردو شاعری کے عہد جالب میں رہ رہے ہیں۔ حبیب جالب نے کہا تھا عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں۔ فاصلوں اور جالب کے درمیان ایک مستقل کش مکش جاری ہے ایک دوسرے کو شکست دینے کی کش مکش اس سفر میں حبیب جالب کا پڑاؤ ہر اس جگہ پڑتا ہے جہاں سے انہیں کچھ رفیقان سفر ملنے کی توقع ہو کراچی میں ان کا پڑاؤ کئی بار ہوا۔ اس شہر میں ہزاروں دل ان کے لئے فرش راہ رہتے ہیں۔ یہاں ان کی لابی میں شہر کا روشن خیال ہر ترقی پسند ہر انسان دوست شخص شامل ہے۔

"معیار کے لئے حبیب جالب کا انٹرویو ہونا چاہئے"

حبیب جالب کے ہر دورہ کراچی پر یہ تجویز سامنے آتی مگر وہ کل پر ٹال دیتے۔ وہ کل برسوں سے ٹل رہی تھی۔

اس مرتبہ حبیب جالب کراچی آئے تو فیصلہ ہوا کہ انہیں کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ہی

بٹھا کر سوالات شروع کردیئے جائیں گے۔ ہم سب بس اب اس کے منتظر تھے کہ کس روز وہ معیار میں وارد ہوتے ہیں۔

ایک صبح مجاہد بریلوی گھیر گھار کر حبیب جالب کو لے آتے ہیں۔ نزہت شیریں اور میں پہلے سے تیار ہیں۔ حسب توقع حبیب جالب معذرت کرتے ہیں۔ "بھئی کل کرلیں گے۔ ابھی شاید پوری بات نہ ہوسکے" ہمیں بھی پتہ ہے کہ ابھی پوری بات نہ ہوسکے گی پچیس برس کی باتیں ایک نشست میں ممکن بھی نہیں ہیں۔ اور پھر پوری بات کے لئے شاید ابھی وقت بھی نہیں آیا۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ آج کی نشست میں ہم آپکے حوالے سے ایسے سوالات کرنا چاہتے ہیں اور ایسے موضوعات پر بات کرنا چاہتے ہیں جو عموماً لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ لوگ آپ کی جدوجہد اور نظریات سے تو واقف ہیں مگر آپ کی ذات، زندگی کے تجربات جواں سالی کے خوابوں اور ادبی سفر کے بارے میں شاید اتنا کچھ نہیں جانتے۔ وہ تھوڑی دیر مزاحمت جاری رکھنے کے بعد آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ آن کردیا جاتا ہے۔

بات چیت کا آغاز نزہت شیریں کے سوال سے ہوتا ہے۔ وہ ابتدا ہی بالکل غیر متوقع سوال سے کرتی ہیں جالب صاحب آپ کو لڑکیاں کس قسم کی پسند آتی ہیں؟ حبیب جالب پہلے مسکراتے ہیں۔ کچھ دیر سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ پھر سوچ کے پاتال سے ایک ایک لفظ نکلنا شروع ہوتا ہے۔

"بنگال کی لڑکیاں میرے ذہن میں آتی ہیں۔ ان کا کلچر مشرقیت، لمبے بال بڑی بڑی آنکھیں۔ گاتی بھی اچھا تھیں۔ ان دنوں میں بنگالی کوارٹرز میں رہتا تھا۔" حبیب جالب تھوڑی دیر کے لئے پھر رک جاتے ہیں۔ اب کے وقفہ زیادہ طویل ہوجاتا ہے۔ سگریٹ کے تین چار کش لگانے کے بعد وہ پھر بولنا شروع کرتے ہیں۔

"لڑکیاں، لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ چاہے جس ملک میں بھی رہتی ہوں ..... ویسے بھی معاشقوں کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتا۔ لوگ اظہار کرکے خوش ہوتے ہیں اپنے عشق کی داستانیں سناتے ہیں اٹھارہ عشق اور پندرہ عشق ..... میں نے جس طرح کی زندگی گزاری اس میں دیکھنے کا تو گنہگار ہوا مگر اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اپنی تو مفلوک الحالی کی زندگی تھی ..... " "کیا آپ بزدل عاشق تھے؟" یاسمین چشتی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھتی ہیں۔

"ویسے سلگتے رہے۔ اچھا نہیں لگا کہ کسی سے کہتے پھریں۔ کسی سے کہا بھی ہوگا تو

بہت آہستگی سے اشاروں میں ۔"

"کیا آپ اپنے آپ کو ناکام عاشق کہیں گے ؟"

" یہ ضروری تو نہیں کہ کامیاب عشق وہی ہو جس میں کہ شادی ہو ۔ یعنی حصول کا نام ہی تو عشق نہیں ۔ بات یہ ہے کہ میں تو چیک بک کے ہندسوں کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں ۔

" آپ اپنی جوانی میں کس قسم کے نوجوان تھے ۔ " نزہت پوچھتی ہیں ۔

" نوجوان جیسے ہوتے ہیں ' جلدی عاشق ہوجانا ' روٹھ جانا ' پھر کسی اور پر عاشق ہوجانا بس ہم بھی ایسے ہی نوجوان تھے ۔ "

ہم حبیب جالب سے ان کی زندگی کے سب ہی ادوار کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ۔ مگر گفتگو کا آغاز ہی نوجوانی سے ہوجاتا ہے ۔ ترتیب کو متاثر ہوتا دیکھ کر میں ان کے بچپن کا ذکر شروع کردیتا ہوں تاکہ بات شروع ہی سے سامنے آئے ۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان کی بالکل ابتدائی یادیں کون سی ہیں ؟ برگ آوارہ کی بہت سی نظمیں ہجرت کے بعد کے کرب کی آئینہ دار ہیں ۔ یہ سوال کرتے وقت میرے ذہن میں حبیب جالب کا یہی کرب ہے ۔

حبیب جالب کہنا شروع کرتے ہیں ۔ " گاؤں کی یادیں ہیں ' وہی ابتدائی یادیں ہیں ' ہوشیار پور ضلع کا ایک گاؤں تھا میانی افغاناں وہاں رہتے تھے ۔ چھوٹا سا قصبہ تھا ۔ دریائے بیاس کے کنارے ۔ بڑی سرسبز و شاداب جگہ تھی ۔ وہاں دل لگا ہوا تھا ۔ پھر وہ گاؤں چھوڑا ' ایک ذرا بڑے قصبے میں آئے ۔ عام سی صورت حال تھی ۔ "

" کوئی غیر معمولی واقعہ بچپن کا " : میں اصرار جاری رکھتا ہوں ۔

" بھئی ہم بہت غریب مفلوک الحال لوگوں میں سے تھے ۔ باہر سے ہر چیز خود لاتے تھے عید کے دن ہم کو دو پیسے ملتے تھے ۔ سارا سال اسی طرح سے گزارتے تھے ۔ ایک بار میرے ایک دوست نے پکوڑوں کی دکان لگائی تھی ۔ عید کے دوسرے دن کی بات ہے دوپہر کے دو تین بج گئے ۔ میں صبح سے بھوکا تھا ۔ پکوڑے بھی تھوڑے سے رہ گئے تو انہوں نے کہا کہ اب میلہ تو ختم ہوگیا ۔ پکوڑے کھا لینے چاہئیں ۔ تو میں نے فوراً کہا کہ ہاں بالکل کھا لینے چاہئیں ۔ تو میں نے پکوڑے کھا لئے ۔

" اس وقت جاگیرداروں کا دور تھا گاؤں میں جاگیرداروں کے دیوان خانے ہوتے تھے ۔ ان کو سلام نہ کیا جاتا تو ناراض ہوجاتے تھے ۔ تھانے تو ہوتے نہیں تھے ۔ وہ خود ہی فیصلے کرتے تھے ۔ ان کے جبر کا نقش ذہن پر اب تک قائم ہے ۔ وہ نفرت چلی آرہی ہے اس قسم کی باتیں میرے ذہن میں تھیں یہ ساری باتیں مل ملا کر شعر میں ڈھل گئیں ۔ میں اگر

شاعری نہ کرتا تو کچھ اور کام کرتا لیکن کرتا اسی قسم کا کام جاگیرداری کے خلاف ......

" ہمارے بھائی اور ہمارے والدین دوسری جنگ عظیم میں مجھے گاؤں چھوڑ کر دلی چلے گئے اور میں وہاں اپنی نانی کے ساتھ رہنے لگا میری نانی نے انگریزوں کا عروج دیکھا تھا۔ وہ ہمیں کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ وہ اندھی تھی مگر اندھے پن کے باوجود جرابیں بن لیتی تھی۔ ازاربند بن لیتی تھی۔ اس کو اس کی بڑی پریکٹس تھی۔ پھر ہم ان چیزوں کو بیچنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ دو دو تین تین میل دور۔ وہ اندھی تھی لہٰذا لوگ خرید بھی لیتے تھے۔ جب دو ایک آنے لیکر ہم گھر آتے تھے تو وہ رات کو کہتی کہ صبح مچھلی پکائی جائے میں کہتا بہت اچھا خیال ہے۔ پھر وہ کہتی نہیں صبح پائے پکائے جائیں۔ میں کہتا یہ بھی اچھا ہے صبح جب اٹھتے تو میں کہتا۔ نانی کیا پکانا ہے۔ تو کہتی تھی اپنے دادا کی طرف جا۔ یہاں کیوں رہتا ہے۔ پھر کہتی چلو چڑی میوہ ہی کرلیتے ہیں۔ چڑی میوہ اس کو کہتے ہیں کہ سوکھی مرچ اور نمک کو ملا کر پانی میں گھول لیتے ہیں۔ اس کو روٹی سے کھاتے ہیں۔ تو رات کو تو بڑے خواب دکھاتی تھی۔ جب دن ہوتا تھا تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ایک شعر بہت پڑھا کرتی تھی اور یہ ہے ۱۹۳۷ء کی بات۔

ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسے کو کیا
دنا نہ دنا پھر کسے کو کیا

" میں بھی اس کو سنتا رہا۔ پھر میں کراچی آیا۔ نانی بھی میرے ساتھ تھی۔ سو سال عمر ہوگئی تھی ایک دن میں کلیات نظیر پڑھ رہا تھا۔ تو اس میں سے یہ شعر نکل آیا۔ وہ یوں تھا

ہم نے تو دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا
اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا

" میں نے سوچا کہ دیکھو یہ شعر سو سال پہلے پیدل چل کر ہمارے گاؤں پہنچ گیا۔ وہ عوامی شاعر تھا میں نے نانی سے کہا۔ اب یہ شعر غلط نہ پڑھنا۔ یہ کچھ واقعات ہیں بچپن کے جو یاد آتے ہیں۔ "

" پڑھائی کا کیا سلسلہ رہا؟ " حبیب جالب کے رکتے ہی میں اگلا سوال پوچھتا ہوں۔

" یہ سلسلہ رہا کہ گاؤں میں آدھا قرآن شریف پڑھا وہ غلام رسول تھے ایک جنہوں نے یوسف زلیخا کا پنجابی میں ترجمہ کیا۔ وہ سنایا کرتے تھے پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر گا کر سناتے تھے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں دلی چلا گیا۔ اینگلو عربک ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ وہاں زبان درست ہو گئی۔ دلی میں جو لڑکے ملے وہ بڑے رنگین مزاج تھے میں چھوٹا تھا،

اس لئے مجھے بہت چھیڑتے تھے پہلے ایک سال تو وہ مجھے چھیڑتے رہے پھر میں انہیں چھیڑنے لگا پھر پاکستان بن گیا وہ سارے دلی سے پاکستان منتقل ہو گئے ۔ کوئی کچھ ہو گیا ' کوئی کچھ ہو گیا ۔ کراچی میں میں نے جیکب لائن اسکول میں داخلہ لیا پڑھنے کے بجائے میں ماسٹروں کو شعر سناتا تھا ۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر نے بلوایا کہا کہ : ۔ ۔ ۔ تم کلاس میں آتے نہیں ہو اپنے والد کو لے کر آؤ ..... مصباح الحق ان کا نام تھا ۔ میں نے کہا کہ جب میں ہی نہیں آؤں گا تو والد کیا آئیں گے میں چلا گیا پھر ایسا ہوا کہ کراچی ہی میں ایک ٹیچرز کنویشن ہوا ' سندھ مدرسہ میں دوسرے دن مشاعرہ تھا مشاعرہ میں مجھے بھی بلایا گیا میں نے غزل پڑھی تو مجھے بڑی داد ملی ۔ میرے ہیڈ ماسٹر بھی وہاں بیٹھے تھے ۔ مشاعرہ کے بعد بڑھ کر انہوں نے مجھے بلایا ۔ ارے میاں یہاں آؤ بیٹا اور پھر ایک ایک سے تعارف کرانا شروع کر دیا ۔ یہ میرا شاگرد ہے ' پھر مجھ سے کہنے لگے والد کو مت لانا مگر اسکول ضرور آنا ۔ پھر میں لاہور چلا گیا اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا ۔ آفاق اخبار میں پروف ریڈنگ کی نوکری کی تنخواہ بڑی کم تھی صرف ۷۵ روپے ملتے تھے بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا پھر میں نے لاہور بھی چھوڑ دیا اور دوبارہ کراچی آگیا ۔ "

گفتگو کا ایک سماں بندھ چکا ہے حبیب جالب کے ساتھ محفل آراء ہونے والوں کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ ان کے ساتھ بیٹھنا کتنا پر لطف اور پر کیف ہوتا ہے ۔ اس کیف کو برقرار رکھنے کی خاطر میں فوراً ہی اگلا سوال پوچھتا ہوں کہ شاعری کے آغاز پر انہوں نے کسی استاد سے مدد بھی لی یا نہیں حبیب جالب کہتے ہیں ۔

" مشاعرں میں میں نے جگر ۔ بیخود ' سائل کو سنا جنہوں نے داغ اور غالب کو سنا تھا سو سو سال کے تھے ..... "

" کوئی استاد وغیرہ نہیں تھا آپ کا ..... ؟ "

" بس یہی کوئی ایک ایک سال ' ڈیڑھ ڈیڑھ سال ' کسی کے قریب رہے اور پھر چھوڑ دیا..... طبیعت نہیں لگتی تھی کہیں کراچی میں ایسا ہوتا تھا کہ اساتذہ وغیرہ لوگوں کو غزلیں لکھ کر دے دیتے تھے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہئے ۔ نہ ان کے قریب زیادہ رہنا چاہئے ۔ "

" ابتدائی دور میں آپ نے پڑھا کیا ۔ کن کن شاعروں سے متاثر ہوئے ؟ " میرا سوال ختم ہونے سے پہلے ہی حبیب جالب نام گنوانے شروع کر دیتے ہیں ۔ "

" میر ' غالب ' فراق ' جگر ' جوش ' حسرت' اصغر اور پھر مخدوم ' مجاز ' جذبی ..... ان سے

تو ملاقاتیں بھی رہیں ۔"

"کراچی آئے تو ۔۔۔"

"یہاں کراچی میں ہر ضلع ، ہر جگہ کے استاد موجود تھے ۔ ان کے شاگرد تھے ۔ بڑے بڑے نام تھے ۔۔۔ سیماب اکبر آبادی ، رسا چغتائی ، زیبا ردولوی ، رئیس امروہوی ، راغب مراد آبادی ، نہال سیوہاروی ، فرید جاوید ۔ فرید جاوید بہت اچھا شاعر تھا ، دیوان بھی اسکا چھپا ، سلسلہ تکلم کا ، اپنی طبیعت میں شروع ہی سے جدت پسندی تھی ۔ کلاسیکی شاعر کو مانتے تھے مگر بالکل ہی روایتی شاعری جس کا زندگی سے تعلق نہ ہو ، وہ ہمیں پسند نہیں تھی ۔ کچھ بزرگوں نے حوصلہ افزائی بھی کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کراچی میں بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ، عزت ملی ۔"

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کو جگہیں چھوڑنے کا بڑا افسوس رہا ہے ۔ گاؤں چھوڑنے کا بھی آپ کو دکھ رہا ۔ یہ کراچی کیوں چھوڑا آپ نے ۔۔۔ ؟" میں نے ان سے دریافت کرتا ہوں ۔

"عجیب بات ہے ۔ کراچی چھوڑنے کا مجھے غم نہیں ہوا ۔ یہ شہر ایسا شہر ہے جو چھٹنے کے بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ جب میں کراچی میں تھا تو میں نے یہ شعر کہے تھے ۔

جاگ اٹھے سوئے ہوئے درد تمناؤں کے
راستے ذہن میں لہرا گئے اس گاؤں کے
جانے کس حال میں ہیں کون بتائے جالب
ارض پنجاب میں پودے میری آشاؤں کے

"سیف الدین سیف جب یہاں آیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ غزل کیسے ہوئی مگر پھر جب لاہور واپس آیا تو اس نے کہا کہ وہ غزل سناؤ ۔"

"اب کراچی یاد آتا ہے ؟"

"یہ جگہ ایسی ہے کہ یہ اپنے دوستوں کی وجہ سے یاد آتی ہے ۔ خود شہر یاد نہیں آتا یہ سارے دوست لاہور میں ہوں تو مزا آئے ۔ بس یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے ۔ لاہور کا یہ ہے کہ وہ جیسے مجاز نے کہا تھا ناکہ لاہور شہر تو خوبصورت ہے مگر پنجابی بہت ہیں ۔ "

چائے آجاتی ہے ۔ گفتگو کا لطف بھی دوبالا ہوجاتا ہے ۔ حبیب جالب کی شاعری پر کچھ لوگوں کا یہ پرانا اعتراض ہے کہ ان کی شاعری پروپیگنڈے کی شاعری ہے ۔ میں اس موضوع کو چھیڑتا ہوں ۔

" آپ کی شاعری میں جو LOUDNESS کا عنصر ہے جسے کچھ لوگ نعرے بازی کا نام دیتے ہیں تو یہ ہماری روایتی شاعری میں تو نہیں ہوتا تھا۔ اب جو آپ نے یہ ــــ " میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی حبیب جالب جواب دینا شروع کرتے ہیں :

" میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی یہ کروں میں لوٹوں گا غزل کی طرف ' غزل آتی ہے مصرعے آتے ہیں مگر اس میں ویسا انداز ہوتا ہے ' اس میں کاٹ نہیں ۔ لوگ کہیں گے تھک گیا ' ہار گیا ' بیٹھ گیا ' اس لئے جب تک یہ عہد چل رہا ہے میرا یہ لہجہ بھی چلتا رہے گا ۔ یہ نہیں کہ مجھے غزل پسند نہیں یا یہ کہ اس قسم کی شاعری میں نہیں کر سکتا "

" مگر برگ آوارہ میں رومانٹک شاعری کی خوبصورت موجود ہیں ــــ "

" بات یہ ہے کہ تجربات آدمی کو REPEAT کرنے لگے تو وہ ٹھیک نہیں عشق وعاشقی کی معاملہ بندی اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر اس کو مختلف انداز میں ڈھالنا چاہئے "

" آپ کو دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے ؟ " یہ سوال کون پوچھ سکتا ہے ۔ ظاہر ہے یہ سوال نزہت شیریں کا ہے ۔

جس پہر دوست میسر ہوں ' یکجا ہوں وہی پہر اچھا لگتا ہے " ۔ یہ جواب کس کا ہو سکتا ہے ۔ ظاہر ہے یہ جواب حبیب جالب کا ہے ۔

مجاہد بریلوی جو ابھی تک خاموش تھے ۔ بات چیت میں شریک ہوتے ہوئے پوچھتے ہیں ۔

" آپ نے اتنے ادوار دیکھے ایک مخصوص انداز کی زندگی گزاری اتنا وقت گزارنے کے بعد اب کہیں افسوس تو نہیں ہوتا ۔ ملامت کا احساس ــــ "

" مجھ سے زیادہ میرے بچوں کو ہوتا ہے ہمارے ساتھی دنیاوی طور پر کیا کیا ہو گئے مگر میں بچوں سے کہتا ہوں کہ عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے ۔ اور وہ بہت بڑی چیز ہوتی ہے ۔ میری ان باتوں کے بعد وہ اس وقت بہل جاتے ہیں اور میرا کام ہو جاتا ہے ۔ "

خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ در آتا ہے سکوت یوں بھی اچھی چیز نہیں ۔ حبیب جالب بہم آراء ہوں تو سکوت اور بھی کھلنے لگتا ہے ۔ حبیب جالب چائے کا آخری جرعہ لیتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں ۔

" آپ کی شاعری ' عوامی شاعری کہلاتی ہے ۔ اردو شاعری میں شاید کسی شاعر کو اتنے آڈینس نہیں ملے ہوں گے جتنے آپ کو ملے ہیں اس مقبولیت کا آپ کو کوئی مالی فائدہ بھی پہنچا کچھ مالی منفعت بھی حاصل ہوئی ؟ "

" مالی منفعت مجھے کم ہوئی ۔ پبلشر کو زیادہ ہوئی سر مقتل کے ایک مہینے میں چار ایڈیشن

چھپے ' اب دو کتابیں اور چھپ رہی ہیں ۔ یہ بھی نکل جائیں گی ۔ مگر یہ ہے کہ میں شاعری کو کاروبار نہیں بناتا ۔ مشاعرے میں پڑھنے کے میں پیسے نہیں لیتا ۔ مشاعرے میں جاتا ہوں اپنی مرضی سے نظمیں پڑھتا ہوں ۔ ایوب خان کے دور میں مری کے ایک مشاعرے میں دستور کے نام سے ایک نظم پڑھی ۔ تو مری بدر کردیا گیا ۔ دس سال کے بعد یحیٰی کی تصویر تھی میں نے غزل سنائی ۔ پھر اس کے بعد سے اب تک مجھے مری کے مشاعرے میں نہیں بلایا گیا ۔ "

" جالب صاحب : آپ نے فلمی شاعری بھی تو کی ۔ کچھ اس بارے میں بھی تو بتائیں اور یہ بھی کہ اب کیوں فلمی شاعری نہیں کرتے آپ ؟ "

" ہاں فلموں میں بھی کی وہاں بھی مشن جاری رہا جب فلموں میں گئے تو اس وقت ماحول تھا ۔ اچھے لوگ تھے ۔ علاؤ الدین اور طالش میرے ساتھی تھے ۔ بھوکے ننگے ہوتے تھے ۔ ہم اکٹھے رہتے تھے ۔ نیکریں پہنتے تھے پھر یہ بڑے ہو گئے ۔ گلبرگوں میں منتقل ہو گئے ۔ ہم وہیں کھڑے رہے ۔ شعرو شاعری کا معاوضہ اتنا نہیں ملتا ۔ ہم پھر بھی شاعری کرتے رہے ۔ ہمارا مقصد اس سے پورا ہوتا ۔ ہمارے خیال کی پبلسٹی ہوتی لاکھوں کروڑوں تک ہماری بات پہنچ جاتی ہم اینٹی امپیریل بات کرلیتے تھے جاگیردار کے خلاف شعر شامل کرلیتے تھے کبھی کبھی بات پروڈیوسروں کے سر کے اوپر سے گذر جاتی تھی بعض بڑے اچھے پروڈیوسر ملے جیسے ہمارے دوست ریاض شاہد تھے .... ریاض شاہد مجھ سے کہتا تھا کہ تم جتنی بڑی گالی اس معاشرے کو دے سکتے ہو دو میں اسے پکچرائز کروں گا وہ مجھے چار پانچ دن کے لئے ایک کمرے میں بند کردیتا تھا میں میوزک ڈائریکٹر اور ریاض شاہد بیٹھ جاتے تھے ہم میں بڑی بے تکلفی تھی ۔ میں شعر لکھتا ' وہ کہتا یہ کیا ہے ' میں کہتا تمہیں پتہ نہیں ہے شعر کیا ہوتا ہے پھر سمجھوتہ ہوجاتا پھر مہدی حسن کو بلوالیا کرتے تھے چاروں مل کر بیٹھ جاتے اور گانا ہوجاتا اب ایسے لوگ ہیں جو نہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی انہیں سمجھایا جاسکتا ہے اب خلیل قیصر بھی مر گیا ریاض شاہد بھی مر گیا ۔

فلم انڈسٹری کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہے پاکستانی فلموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

" بات یہ ہے کہ اب تو انڈیا کی فلمیں چھائی ہوئی ہیں ' وی سی آر چل رہے ہیں ۔ اس وقت پاکستانی فلم تو پنپ نہیں رہی ۔ ہماری فلموں کو چاروں صوبوں کا نمائندہ ہونا چاہئے ' وہ جو آپ لکھنؤ اور یوپی وغیرہ پر کہانی بنا کر پیش کردیتے ہیں ۔ وہ بھی ٹھیک ہے مگر اب مزید

ان موضوعات پر فلم چلے گی نہیں ' بہت کچھ بن گیا ہے اردو میں اضافہ ہوا ہے ....
علاقائی زبانوں کی وجہ سے ' مسائل کی وجہ سے "
" فلم کو ٹی وی نے بھی نقصان پہنچایا ہے زیادہ تر پڑھا لکھا ٹیلنٹ بھی اس طرف چلا گیا ہے جو رہ گئے ہیں وہ پنجابی فلمیں بناتے ہیں ۔ اردو والے بھی پنجابی فلموں کی طرح کی فلمیں بنانے لگے ہیں ۔ یہاں کے مسائل پر فلم بناتے ہوئے ڈرتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ تخلیق پر جب خوف طاری ہو تو وہ تخلیق نہیں رہتی ۔ ریاض شاہد میں یہ بات تھی کہ وہ اصل مسائل پر فلم بناتا تھا ۔ انڈین فلمیں دیکھتا ہوں تو ان میں بھی یہ ہے کہ سب تو اچھی نہیں ہوتیں مگر اچھی بھی ہوتی ہیں ۔ ان میں کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہوتا ہے ' پھر زبان بھی کیریکٹر کی استعمال کرتے ہیں ۔ فلم کو اگر صحیح لوگ بنائیں تو یہ ایجوکیشن کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے "
" نئی شاعری جو ہو رہی ہے یا جو نئے اور نوجوان لکھنے والے سامنے آئے ہیں ۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ " فلم سے ایک مرتبہ پھر شاعری پر آتے ہوئے میں جالب صاحب سے پوچھتا ہوں ۔
وہ کہتے ہیں ...
" شاعری میں نئے نئے تجربے تو ہو رہے ہیں ... تازگی تو اچھی ہے لیکن جب تک خیال کی پختگی اور خیال کی RICHNESS نہ ہو اس وقت تک بڑی شاعری نہیں بنتی ۔ فی الحال یہ پختگی نظر نہیں آرہی ہے ۔ شاید آگے چل کر ان میں کوئی بات بن جائے ..... "
" آپ کی شاعری کا آغاز کیونکر ہوا ۔ پہلی نظم یا غزل کب کہی ' کہاں چھپی ؟ "
" پہلی قابل ذکر چیز تو امروز میں چھپی ' چراغ حسن حسرت کی ادارت میں وہاں غزل کا چھپ جانا بہت بڑی چیز تھی ۔ وہ بہت سخت آدمی تھے ' بڑے عالم تھے ' بہت اچھے انسان تھے ' کالم نگار بھی بہت معرکے کے تھے ۔ آج کل تو کالم نگار ایک بات پر پورا کالم لکھتے ہیں ان کے یہاں یہ نہیں تھا ۔ وہاں تو ایک بات آئی اور چار لائنوں میں ختم ہو گئی ' پھر دوسری بات آگئی ' دس باتوں کا ایک کالم ہوتا تھا ۔ "
" جالب صاحب ! موسیقی کا بھی کچھ شوق ہے آپ کو ؟ "
" ریاض شاہد کی فلم کے لئے میں نے وہ مشہور گیت لکھا تھا ' رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے ... نظم ہی پر اصل میں اس نے یہ فلم بنائی تھی (زرقا) پھر نظم کو گیت بنانے کا بڑا مرحلہ تھا ۔ رشید عطرے جو میوزک ڈائریکٹر تھا ' وہ قطعہ بند نظم کو گنگناتے جا رہا ہے '

گائے جارہا ہے۔ اس سے بن نہیں رہی ' میں اس کی مصیبت کو سمجھ گیا میں نے کہا کہ جب تک لنکنگ لائن نیچے نہیں آئے گی اس وقت تک یہ مصرعہ ابھرے گا نہیں۔ تو پھر میں نے اس میں لنکنگ لائن بھی رکھی۔ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے تو پھر گیت ہوگیا۔

آج قاتل کی یہ مرضی ہے کہ سرکش لڑکی
سر مقتل تجھے کوڑوں سے نچایا جائے
موت کا رقص زمانے کو دکھایا جائے
اس طرح ظلم کو نذرانہ دیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

" تو اس طرح یہ مصرع اٹھا ' لرک ازم سے گیت بنتا ہے۔ اس میں ایک لنکنگ لائن ضروری ہے۔ وہ کیا ہو ۔۔۔ یہ ہم کو پتہ ہے۔ پھر ہم نے اپنی سیاسی نظموں میں بھی یہ بات کی ' ہماری نظمیں چلتی کیوں ہیں ' پاپولر کیوں ہوتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس لرک ازم سے کام لیتے ہیں۔ یہ سارا کام ہم نے سیاست میں دکھایا ' پہلے ہوتا تھا نا ۔۔۔ اسلام کی کشتی کو ہم پار لگادیں گے ' ادھر موچی گیٹ پر ہوتا تھا۔ اب ہم نے یہ کہا جو موضوع زیر بحث ہے ' جو مسائل ہیں ان پر نظم لکھی جائے چنانچہ تقریریں کم ہوگئیں نظمیں چل پڑیں ۔۔۔ "

تقریروں کے مقابلے میں نظموں کو مقبولیت کا ذکر نکلتا ہے تو بات پھر اس کی طرف نکل جاتی ہے ۔۔۔ حبیب جالب کہتے ہیں۔ " سہروردی نے ایک بار کہا کہ ہم تو وہ بات نہیں کہہ سکا جو تم کہہ گیا ' موچی دروازے میں جلسہ تھا۔ سہروردی اپوزیشن کے بڑے قد آور رہنما تھے۔ کالا باغ کے آدمی جلسہ خراب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسٹیج کشتی کی طرح ڈول رہا تھا۔ میں مائیک پر آگیا اور میں نے کہا کہ حضرات یہ لوگ جو شور مچارہے ہیں۔ یہ لوگ لاہور کے لوگ نہیں ہیں یہ کالا باغ کے بھیجے ہوئے لوگ ہیں لاہور کے لوگ مہذب اور متمدن لوگ ہیں وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ پھر میں نے کہا کہ آج ایک نظم سناؤں گا دیکھتا ہوں کہ تم مجھے سنتے ہو یا نہیں۔ نظم شروع ہوئی ' سناٹا چھاگیا۔ دستور نظم سنائی ' جلسہ جم گیا۔ اس کے بعد سہروردی آئے اور لوگوں نے انہیں سنا۔ اگلے دن پاکستان ٹائمز نے لکھا کہ حبیب جالب نے میٹنگ بحال کی۔ "

" آج کل عورتوں کے حقوق کی بحث زوروں پر جاری ہے ' آپ کا نقطہ نظر کیا ہے ؟ "

میں نے ایک اہم مسئلہ پر حبیب جالب کی رائے پوچھتا ہوں ......

" ریاض شاہد کی فلم کا جو گیت تھا وہ بھی ایک ایسے واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا تھا ۔ قصہ یوں تھا کہ نیلو کو ایک بڑے فنکشن میں رقص پر مجبور کیا گیا ۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی زبردستی کی گئی ۔ اس نے گولیاں کھالیں ' ہسپتال میں وہ داخل ہو گئی ۔ میں اور ریاض شاہد اسے دیکھنے جا رہے تھے ۔ راستے میں نظم ہو گئی ۔ نیلو سزاوار نظم ہو گئی ۔ آٹھ دس سال کے بعد ایک اور اداکارہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ۔ طارق عزیز نے کہا کہ کوئی ہوتا حبیب جالب تو نظم کہتا ۔ میں " چٹان " کے دفتر میں بیٹھا تھا ۔ کسی نے یہ بات مجھے بتائی تو میں نے کہا کہ اچھا تو لکھ دیتے ہیں نظم ۔ خواتین کی جو آزادی ہے ۔ وہ ہمیشہ بڑی عزیز رہی ہے وہ چاہے ایک رقاصہ ہو یا کوئی بڑی خاتون ' مغنیہ ہو یا دفتر کی خاتون ان کی ایک عزت ہے ۔ ان کے حقوق کی میں بات کرتا ہوں ۔ نیلو ہو یا ممتاز ہو ہر ایک کی عزت ہے ۔ نیلو سے میں ملا ہوں ممتاز سے نہیں ملا ' نہ ملنے کا شوق ہے ۔ خواتین الیکشن فورم والیوں نے کہا کہ عورتوں کا ترانہ لکھ دیں ۔ میں نے لکھ کر دے دیا ۔ خواتین کے جلسوں میں بھی مجھے بھی بلوایا جاتا ہے ۔ میں تو خواتین کی ٹریڈ یونین کا سربراہ ہوں ۔ "

" مشاعروں میں لوگ آپ کو بڑے شوق سے سنتے ہیں ۔ ہزاروں لوگ تو صرف آپ ہی کو سننے کے لئے دور دراز سے آتے ہیں ۔ آپ شاعری کی مقبولیت کا راز کیا ہے ؟ "

" مشاعروں میں لوگ ہمیں اتنی تعداد میں جو سننے آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم وہ بات کہتے ہیں جو لوگ سننا چاہتے ہیں ۔ " حبیب جالب مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ مگر اس مختصر سے جواب میں معنویت کے جہاں پنہاں ہیں ۔ "

ایک مرتبہ پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے ۔ اب کہ اس خاموشی کو مجاہد بریلوی توڑتے ہیں ۔

" کسی خاص مشاعرے کی کوئی بات یاد ہو تو ... "

" بڑے مشاعرے پڑھے ۔ دلی میں ' لکھنؤ میں ۔ جگر صاحب کے ساتھ بہت پڑھے ' جوش ' حفیظ ' فراق سب کے ساتھ پڑھے ۔ گورکھ پور میں ایک مشاعرہ تھا ۔ وہ علاقہ بڑا ہی سرسبز و شاداب علاقہ تھا ۔ گنگا جمنا کا علاقہ رم جھم سی ہو رہی تھی ۔ شام کا وقت تھا ۔ میرا تانگا جا رہا تھا ۔ پیچھے فراق صاحب کا تانگا آیا ۔ میں فراق صاحب کے ساتھ بیٹھ گیا ۔ فراق صاحب گھر لے گئے ' ایک صحن میں تخت پوش پر بٹھا دیا ۔ کہنے لگے میں ذرا اندر اپنے گھر والوں سے " بھین وین " کرلوں ۔ وہاں سے آئے تو کہنے لگے کہ میں نے اپنے گھر

والوں سے کہا ہے کہ میں دلی سے تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں - حبیب جالب اور پھر مجھ سے کہنے لگے کہ جالب! تمہارے لئے یہ تحفہ لایا ہوں' امرودوں کا خالص عرق' فراق اور امرودوں کا عرق ... تو گفتگو تو سہ آتشہ ہوگئی نا ... "

فراق ہی کا ذکر کرتے ہوئے حبیب جالب کہتے ہیں - " ان کا بڑا علم تھا' ذرے سے لے کر آفتاب تک باتیں کرتے تھے - ایک بار ان سے بڑی ناراضگی بھی ہوگئی تھی - دلی میں مشاعرہ تھا - میں نے فراق صاحب کو مخاطب کرکے ایک شعر پڑھ دیا - " -

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

" اب سردار جعفری' خواجہ احمد عباس داد دے رہے ہیں - واہ واہ ... بھئی جالب دوبارہ پڑھو - میں دوبارہ پڑھ رہا ہوں - اپنے انداز میں بات اپنی کہو ... فراق صاحب کہہ رہے ہیں ... جی ہاں' جی ہاں ... میں شعر دوبارہ' سہ بارہ پڑھ رہا ہوں - میں تو داد طلب انداز میں شعر پڑھ رہا تھا - اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ فراق کیوں اتنی سرد مہری سے مجھے جی ہاں' جی ہاں کہہ رہے ہیں - جب میں کلکتہ گیا تو وہاں جس ہوٹل میں وہاں مجھے ٹھرایا گیا اسی میں فراق صاحب بھی ٹھہرے ہوئے تھے - میں فراق صاحب کے کمرے میں گیا اور کہا فراق صاحب آداب! کہنے لگے' میاں آداب و ادب بعد میں - میں نے ادھر میر کی زمین میں پانچ چھ غزلیں کیا کہہ دیں کہ تم نے ہمیں شعر سنا دیا - میں نے کہا حضور کون سا شعر - صاحب میں تو آپ کو صاحب طرز شاعر کہتا ہوں اور بھی بہت کچھ کہا میں نے - ایک شاگرد بھی فراق صاحب کے بیٹھے تھے - کہنے لگے' فراق صاحب یہ تو آپ کو بہت بڑا شاعر مانتے ہیں - اس پر فراق صاحب کہنے لگے' اچھا تو یہ بات تھی - ہم نے تو جب ریڈیو پر نوجوان شاعروں کے بارے میں مضمون پڑھا تو اس میں ان کا بطور خاص ذکر کیا' میں نے کہا کہ جناب یہ شعر جو میں نے پڑھا' یہ تو اپنے ملک کے ناصر کاظمی اور آپ کے خلیل الرحمان عظمی وغیرہ کے بارے میں تھا - اس کے بعد ہم مشاعرے میں پہنچے - فراق صاحب نے ہمارے بارے میں مائک پر آن کر تعارف کراتے ہوئے کہا ... میرا بائی کا سوز اور سور داس کا نغمہ یکجا ہوجاتے ہیں تو اسے حبیب جالب کہتے ہیں - یہ مشاعرہ ہندوستان کا تھا۔

ہاں ایک اور مشاعرہ یاد آرہا ہے - لائل پور کے مشاعرے میں جگر صاحب نے کہا کہ جب تم پڑھتے ہو تو ہم سوچتے ہیں کہ ہمارا دور سے کشی ہوتا تو ہم بر سر مشاعرہ رقص کرنے لگتے۔ "یہ تو بہت بڑا خراج تحسین ہے!"

"فیض صاحب نے تو ہم کہ ٹھہرے اجبی ' میں مہربانی فرما کر یہ لکھا ہے کہ پنجابی میں سلطان باہو ' بلھے شاہ اور وارث شاہ عوامی شاعر ہیں اور اردو میں حبیب جالب ہے اور یہ بھی کہ ولی دکنی سے لے کر آج تک کسی شاعر کو اتنا آڈینس نہیں ملا ۔ "

" آپ نے ماضی میں بھی مشاعرے پڑھے ہیں ۔ اب بھی آپ پڑھتے ہیں ۔ اس زمانے کے اور آج کے زمانے کے مشاعروں میں کچھ فرق محسوس کرتے ہیں آپ۔ "

حبیب جالب ' یاسمین چشتی کا سوال سنتے ہیں ۔ اور پھر گویا ہوتے ہیں ۔ " اب دلی اور لکھنؤ میں جو سنتے تھے وہ تو مطالعہ کرتے تھے ۔ بڑے ذوق شوق سے سنتے تھے ۔ اب یہاں وہ ذوق و شوق کہاں ۔ کراچی میں سامعین بہتر لگے ۔ "

" آپ کبھی ہوٹ بھی ہوئے " یاسمین چشتی ہی پوچھتی ہیں ۔

" ہاں ایک بار کا مجھے یاد آیا ۔ میں پھنس گیا تھا ' لاہور میں ایک مشاعرہ تھا ۔ میں لائل پور سے آیا تھا ۔ زہرہ نگار بھی آئی تھی ۔ وہ زہرہ نگار کا بڑے عروج کا دور تھا ۔ اپنے مخصوص مترنم انداز سے وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتی تھی ۔ اور پھر زہرہ کے بعد مشاعرے میں پڑھنا ناممکن ہو جاتا تھا ۔ مجھے بس سے لاہور جانا تھا ۔ بس نہیں ملی تو میں ٹرک میں بیٹھ کر آگیا ۔ سر پر بال وال بھی تھے اور وہ جو شاعروں کا ایک خاص حلیہ ہوتا تھا ۔ وہ میرا بھی تھا ' اس وقت مشاعرہ قتل گاہ بنا ہوا تھا ۔ کئی شاعروں کی لاشیں تڑپ رہی تھیں ۔ زہرہ نگار پڑھ کر جاچکی تھی ۔ جو شاعر آتا وہ ڈھیر ہوجاتا تھا ۔ میں ٹرک کے اڈے سے سیدھا مشاعرے میں داخل ہوا اور گردن نکال کر مجمع میں سے اسٹیج کی طرف بڑھا ۔ شوکت تھانوی اسٹیج سیکریٹری تھا ۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سوچا چلو اسے کاٹیں ۔ مجھے کاٹنے کے لئے اس نے آواز لگائی ۔ حضرات اب حبیب جالب اپنا کلام سنائیں گے ۔ میں مائیک پر آیا تو لوگوں نے کہا کہ نکالو اس کو کہاں سے آگیا یہ فقیر ' عجیب و غریب فضاء بن گئی ۔ میں کانپنے لگا اور سوچا کہ چلو بھئی چلے جاتے ہیں ۔ مگر کہیں سے ذہن میں ایک لہر آگئی کہ کہیں یہ حسرت نہ رہ جائے کہ بغیر پڑھے چلے گئے ۔ تو یہ سوچ کر میں نے ایک تازہ غزل کا شعر پڑھا ۔ " وہ جو غزل تھی ۔

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

" یہ جو میں نے ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کی تو لوگ خاموش ہونے لگے ۔ پھر دوسرا شعر پڑھا ' پھر تیسرا شعر پڑھا کہ "

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

"اس پر بے تحاشا داد ملی ' بے پناہ داد ملی ..... جگر صاحب صدارت کر رہے تھے۔ میں مائیک چھوڑ کر جگر صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے جب کراچی میں جگر صاحب آئے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ بھئی جگر صاحب آئے ہوئے ہیں ' چلو ان سے مل لو۔ تو میں نے کہا کہ بھئی تم مل آؤ ' ہماری کہیں ہوجائے گی ان سے ملاقات۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ دیکھو اس لڑکے کو۔ جگر صاحب آئے ہوئے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ ہوجائے گی کہیں ملاقات ..... تو اس مشاعرے میں ملاقات ہوگئی ' جگر صاحب کے کہنے پر میں نے مقطع پڑھا اور آکر بیٹھ گیا۔" مقطع تھا۔۔

وہ جو ابھی اس راہ گذر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں

"میں آن کر بیٹھ گیا تو لوگوں نے آوازیں لگانی شروع کردیں۔ اب ایک ڈرامہ ہوتا ہے نا کہ شاعر بیٹھا رہتا ہے کہ اور چیخنے دو ' اور اصرار کرنے دو۔ اس پر مشاعرے کے منتظمین کو تو یہی کہنا ہوتا ہے نا کہ ابھی اور شاعر بھی آنے والے ہیں۔ اور وقت ہوا تو بعد میں ان کو پڑھوا دیں گے۔ شوکت تھانوی کو تو یہی کہ دینا تھا ' مگر لوگ کہاں ماننے والے تھے۔ مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے کہا کہ اسے تو آج میں قتل کروں گا۔ میں مائیک پر آگیا اور کہا ..... حضرات ! کیا آپ مجھے سننا چاہتے ہیں ' لوگوں نے کہا کہ ہاں سننا چاہتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ حضرات اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو میں سنانا چاہتا ہوں ' پھر یہ ہمارے درمیان میں کون ہے۔ پھر میں نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد تو ایک ہی رات میں مقبولیت مل گئی کالجوں میں لڑکے لڑکیوں نے مجھے بلوانا شروع کردیا۔ مشاعروں میں اور مباحثوں کے وقفوں میں۔ ایک مرتبہ شورش کاشمیری نے اپنے رسالے میں لکھا کہ ایک دن کسی کالج کی دہلیز ہی پر اس کا دم نکلے گا۔"

"نوجوانوں کو آپ نے ہمیشہ متاثر کیا ہے !" میں کچھ کہنا ہی چاہتا ہوں کہ حبیب جالب خود بول اٹھتے ہیں

"میں جب کراچی میں تھا اس وقت بھی نوجوانوں میں اٹھتا ' بیٹھتا اسکول میں تھا۔ جس وقت تو زیادہ وقت ایس ایم کالج میں گذرتا تھا۔ خود بھی نوعمر تھا۔ لڑکیاں پکنک پر لے جاتی تھیں"

"پکنک پر ظاہر ہے نظمیں بھی سناتے ہوں گے ؟"

"وہ اب یاد نہیں ہیں۔ بس ایسی ہی ہوتی تھیں 'تباہ ہو گئے' برباد ہو گئے۔ وغیرہ ..."

نزہت خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد اب دوبارہ اپنے سوالات شروع کرتی ہیں۔

"یہ جو آپ ترنم سے پڑھتے ہیں تو اس میں کس سے متاثر ......"

"میں نے کہا نا کہ بنگالی کوارٹرز میں جب رہتے تھے تو وہاں رات کو گانے بجانے کی آواز آتی تھی۔ صبح ہوتی تو پھر گانے بجانے کی آواز آتی' بھائی طبلہ بجارہا ہے' باپ ہارمونیم لئے بیٹھا ہے۔ بہن رقص کر رہی ہے۔ میری آواز اچھی تھی۔ تو وہ مجھے بھی شامل کر لیا کرتے تھے۔ فنکشن میں ساتھ لے جاتے تھے۔"

"جالب صاحب لڑکیاں کس لباس میں بھلی معلوم ہوتی ہیں ؟"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جالب کہتے ہیں ... بھئی کرتا پسند ہے' کرتا جس میں چاندی کے بٹن لگے ہوں اور چوڑی دار پاجامہ۔ تو ہو گا ہی .....!

"کھانا کیا پسند ہے ؟"

"شلجم اور لوکی تو میرے مزاج سے موافقت نہیں رکھتے کریلے گوشت میری بیگم بناتی ہے۔ وہ بہت پسند ہے۔ ویسے آج کل تو پرہیزی کھانا کھاتا ہوں۔ بس ابلا ہوا قیمہ کھاتا ہوں۔"

"بھئی ختم ہوا یا کچھ رہ گیا ہے ..." حبیب جالب پوچھتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت سے سوال باقی ہیں۔ لیکن جالب تین گھنٹے کی مسلسل نشست کے بعد اب کچھ تھک گئے ہیں۔ وہ کل کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کل ایک سال بھی ہو سکتی ہے' دو سال بھی اور شاید اس سے بھی زیادہ لیکن ہم اصرار نہیں کرتے۔ ہمیں کل کا انتظار کئے بغیر پھر کسی دن حبیب جالب کو اسی طرح حبس بے جا میں رکھ کر ہی بات کرنی ہوگی۔ ان کے ہر انٹرویو کی طرح شاید یہ انٹرویو بھی تشنہ تکمیل ہے۔ مگر ان کا تو ہر انٹرویو تشنہ تکمیل ہی رہے گا اس لئے کہ ان کا سفر ابھی جاری ہے' شوق آوارگی اب بھی جہاں کی گرد اڑا رہا ہے۔

(یہ انٹرویو ہفت روزہ معیار کراچی میں ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔)

سعید پرویز

میرا بھائی میرا باپ

میں بہت چھوٹا تھا ' چھ یا سات برس کا کہ جب میں نے پہلی بار گھر میں ایک شخص کو دیکھا کشادہ پیشانی ' بڑی بڑی روشن آنکھیں اور گھنے سیاہ بال ' پتہ چلا کہ یہ بھی ہمارے بڑے بھائی ہیں ۔(بھائی بہنوں میں ' میں سب سے چھوٹا ہوں) حبیب نام ہے ۔ حبیب بھائی اور دوسرے بھائیوں میں یہ فرق نمایاں تھا کہ دوسرے بھائی تو مجھے گھر پر ہی نظر آتے ' جبکہ حبیب بھائی گھر سے غائب ہوتے تو مہینوں شکل نظر نہیں آتی تھی ۔ والدہ اور والد حبیب بھائی کے لئے پریشان رہتے تھے جبکہ بھائی شروع ہی سے اپنے مشن کی تکمیل میں عملاً مصروف ہوگئے تھے ' لیکن ہمارے سادہ لوح والدین اس بات کو نہیں سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے بھائی کی آزاد روی اور اپنی پریشانی کا حل یہ سوچا کہ بھائی کی شادی کردی جائے ۔ اس طرح ہماری چچا زاد بہن ممتاز ہماری بھاوج بن کر ہمارے گھر چلی آئیں ۔ مگر صحیح معنی میں بھائی کو پابند ہماری اکلوتی بہن کی شادی کے فرض نے کیا ۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں وہ ایک ایک پیسہ اماں کے ہاتھ میں لاکر دیتے تھے اور صرف دو آنے اماں سے لیتے تاکہ کافی ہاؤس تک پہنچ سکیں اور یوں ۱۹۵۹ء میں تنہا بہن کی شادی کا بوجھ اٹھایا (اس وقت پاسپورٹ بحال تھا لہٰذا ہندوستان مشاعروں میں بھی گئے ' نیز فلمی گیت بھی بھائی نے اسی زمانے میں لکھنا شروع کئے اور رائج معاوضہ سے تین گنا معاوضہ وصول کیا) .... بھائی لاہور شفٹ ہوئے تو میں بھی کراچی سے لاہور پہنچا دیا گیا ۔ ایک کمرے کا چھوٹا سا کرائے کا مکان ' بھائی اناالحق کا نعرہ بلند کرچکے تھے ۔ یعنی نظم دستور میں نہیں مانتا ' میں نہیں جانتا ہوچکی تھی ۔ اندر باہر حالات ایک سے تھے ۔ ان حالات میں کہ جہاں پیٹ کا جہنم بھرنا مشکل تھا ' بھائی اور بھابی نے مجھے تعلیم دلوائی ' یہ ان کا حوصلہ تھا ورنہ ایسے ماحول کے بچے تو ہبازی لگایا کرتے ہیں ۔ میں نے ۱۹۶۴ء میں میٹرک پاس کیا ۔ ہمارے بہنوئی بہت لائق آدمی ہیں ۔ انہوں نے میٹرک میں پورے بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی تھی ۔ وہ میرے بارے میں

پختہ تھے کہ میں میٹرک میں فیل ہوجاؤں گا ۔ اخبارات کے دفاتر میں تو نتیجہ دو روز پہلے ہی پہنچادیا جاتا ہے ۔ اسی لئے میں نے بھائی سے کہا کہ کسی اخبار کے دفتر سے میرا رزلٹ معلوم کریں مگر بھائی صاحب اس پر راضی نہ ہوئے دراصل وہ بھی مختار بھائی کی پیشین گوئی پر یقین رکھتے تھے ۔ اور اپنے کسی صحافی دوست کے سامنے شرمندہ ہونے کو تیار نہ تھے ۔ مگر جب میں نے بہت ضد کی تو وہ مجھے امروز میں ظہیر بابر صاحب کے پاس لے گئے ۔ یہ طے پاچکا تھا کہ فیل ہونے کی صورت میں اخبار کے دفتر ہی میں میری پٹائی ہوگی ۔ میں نے ظہیر بابر صاحب کو اپنا رول نمبر بتایا ۔ انہوں نے نتیجہ دیکھا تو میں دوسرے درجے میں پاس تھا ۔ انہوں نے جالب بھائی سے کہا کہ مبارک ہو ۔ آپ کا بھائی پاس ہوگیا مگر بھائی صاحب ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے ۔ اور انہوں نے قدرے جھنجھلا کر ظہیر بابر صاحب سے کہا بھائی ذرا غور سے دیکھو یہ نالائق لڑکا پاس ہونے والا نہیں ہے ۔ میں نے ایڈمٹ کارڈ ظہیر بابر صاحب کے سامنے رکھ دیا ۔ انہوں نے غور سے رول نمبر دیکھا اور پھر رول نمبر گزٹ میں تلاش کرکے بولے ۔ بھئی جالب تمہارا بھائی دوسرے درجے میں میٹرک پاس کرگیا ہے ۔ تب بھائی صاحب نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چپل پاؤں میں پہنی اور مجھے سینے سے لگالیا اور مٹھائی بھی ہوئی ۔ میٹرک کے بعد مجھے محکمہ انکم ٹیکس کراچی میں ملازمت مل گئی ۔ اس زمانے میں تجمل حسین صاحب (الطاف گوہر صاحب کے بھائی) انکم ٹیکس کمشنر تھے ۔ وہ جالب بھائی کے بہت اچھے دوست تھے اور ہیں ۔ انہی نے مجھے ملازم رکھا تھا ۔

جالب بھائی سے مجھے والہانہ عشق ہے ۔ میں اگر ان کا بھائی نہ بھی ہوتا تب بھی ان کا بہت بڑا پرستار ضرور ہوتا ۔ جالب بھائی بہت ہمدرد اور خلیق انسان ہیں ۔ خاندان والوں کے کیا کیا کام آئے ہیں ۔ بس یوں سمجھ لیں کہ کسی بھی کام کے لئے ان کے ہاں انکار نہیں ہے ۔ گھر میں اور گھر کے باہر ان کا برتاؤ یکساں ہے ۔ یہ جو ان کا حق سچ بولنے کا معاملہ ہے تو یہ خوبی ' یہ جوہر انہیں والدہ صاحبہ سے ورثے میں ملا ہے ۔ ہماری والدہ منہ پر سچ بولنے والی خاتون تھیں ۔ اسی لئے پورا خاندان ہماری والدہ صاحبہ کو برا سمجھتا تھا اور سبھی ان سے ناراض رہتے تھے ۔ بالکل اسی طرح جیسے جالب بھائی سچ لکھتے اور بولتے ہیں تو اہل اقتدار ان سے ناراض ہوجاتے ہیں ۔

جالب بھائی جہاں غصے کے بہت تیز ہیں وہاں وہ بے حد خوش مزاج بھی ہیں ۔ کبھی خوشگوار موڈ میں ہوں گے تو انتہا کردیں گے ۔ بچوں کے ساتھ بچے بن جائیں گے ۔ ایسے میں اگر کوئی انہیں دیکھے تو حیران رہ جائے ۔ میں جب جب ان سے ناراض ہوا تو وہ ناراضگی

بارہ گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ مثلاً میں ان سے ناراض ہو کر گھر پہنچا تو دوسرے دن صبح ہی صبح گھنٹی بجی اور جالب بھائی موجود چہرے پر اپنی مخصوص مسکراہٹ سجائے، سر قدرے جھکائے، مخصوص لہجے میں کہیں گے۔

حضور حبیب جالب حاضر ہے اور پھر ہاتھ میں پکڑا تھیلا اور جھولی میں ہرا مصالحہ، مولی ٹماٹر وغیرہ۔ لو بھئی یہ قیمہ ابھی بھون لو۔ ناشتہ اسی کا کریں گے اور یوں ناراضگی ختم۔

حبیب جالب کے بھائی ہونے کا بھی عجیب نشہ ہے کہ کوئی نظروں میں جچتا ہی نہیں ہے ایک سرور و کیف کا عالم ہے جو رہتا ہے۔

بھائی صاحب کی گرفتاریوں اور قید بند کے طویل سلسلے کا میں بھی ایک قریبی گواہ ہوں بھائی کو گرفتار ہوتے کئی بار دیکھا مگر مرحوم طاہر عباس (جالب کا بیٹا، جس کا بارہ سال کی عمر میں انتقال ہوا) کے نویں والے دن بھائی کی گرفتاری کو میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ گھر کو چاروں جانب سے اہلکاروں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ گھر پہلی منزل پر تھا۔ نیچے سے کسی نے آواز دی۔ ناصر! ناصر! (ناصر بھائی صاحب کا بڑا بیٹا ہے) میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو تین چار افراد کھڑے نظر آئے۔ میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ شاید ناصر کے اسکول کے اساتذہ ہیں، تعزیت کے لئے آئے ہیں، بھائی صاحب ان سے ملنے نیچے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد نیچے سے بھائی صاحب کی آواز آئی۔ سعید ذرا نیچے آؤ۔ میں نیچے پہنچا، تو بھائی صاحب نے چاروں افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ ڈی ایس پی حضرات ہیں اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہوگا۔ پھر مجھے کہا کہ ان کو لے کر اوپر آجاؤ، یہ کہتے ہوئے جالب بھائی اور چاروں ڈی ایس پی حضرات اور میں اوپر آگئے۔ اوپر آکر جالب بھائی نے ڈی ایس پی حضرات سے کہا کہ آپ لوگ انتظار کریں کیونکہ میں ابھی بیت الخلاء جاؤں گا۔ ناشتہ کروں گا اور پھر چلیں گے۔ چھوٹا سا گھر اور پھر گھر میں بٹھانے کے لئے کوئی انتظام بھی نہیں۔ لہٰذا چاروں ڈی ایس پی حضرات گھر کے صحن میں کھڑے رہے۔ بھائی صاحب بڑے اطمینان سے بیت الخلاء گئے اور پھر ناشتہ کیا۔ (میں نے اس دوران انڈہ آملیٹ بنالیا تھا) ان تمام حالات سے بے خبر بھابی دوسرے کمرے میں تعزیت کے لئے آئی ہوئی خواتین کے ساتھ مصروف تھیں اور بھائی نے بھی بس اپنی واسکٹ اٹھائی، نہ بیوی سے ملے، نہ بچوں کی طرف دیکھا اور آنے والوں کے ساتھ چلے گئے۔ یہ ہمت، یہ جرات، یہ عزم انہی کا حصہ ہے۔ میں اور میرا بھتیجا ناصر، محمود علی قصوری صاحب کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے کمشنر لاہور اور اسلام آباد ہر جگہ فون کئے، مگر جالب بھائی کی گرفتاری کی ذمہ داری کوئی

بھی ایجنسی قبول نہیں کر رہی تھی اور قصوری صاحب مرحوم نہ جانے طیش میں اہل کاروں کو کیا کیا سنا رہے تھے۔ شام چار بجے گھر پر کچھ اہل کار دوبارہ آئے اور بھائی کا اٹیچی کیس پہنچانے کے لئے کہہ گئے۔ ہم اٹیچی کیس پہنچانے کے لئے چلے تو والدہ صاحبہ بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگیں اور جب ہم والدہ صاحبہ کے ساتھ بھائی صاحب سے ملے تو اماں کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے جالب بھائی کی آنکھوں میں پانی کی ایک لکیر سی ابھری اور پھر غائب ہوگئی جیسے ایک طوفان ابھرا ہو اور کسی نے مضبوط ترین بند باندھ دیا ہو۔ جالب بھائی کمال ہمت، وقار اور عزم کے ساتھ بول رہے تھے۔ چہرے پر قلندرانہ جلال بہت نمایاں تھا۔ وہ مجھے کہہ رہے تھے۔ ارے بھئی! اماں کو کیوں تکلیف دی۔ انہیں کیوں لے آئے۔ اماں نے آگے بڑھ کر بھائی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا کہ بیٹا ہمت نہ ہارنا۔

ہاں ہاں اماں سب ٹھیک ہے اور پھر مجھے کہا کہ اماں کو لے جاؤ۔ اچھا جاؤ اور پھر اسی شام بھائی صاحب کو ایک دوسرے شہر کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔

بھائی کی تمام عمر قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئی۔ اب ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ مکمل صحت یاب ہوجائیں

منظور اے چوہدری

وہ جالب ہم کو چھوڑ گیا

جالب جو امن کا پیامبر تھا، حق کا پیکر، خدا کی کے دل کی آواز، ضمیر کا قیدی تھا، وقت کا منصور، اس کو اپنی سچائی پر پختہ ایمان تھا۔ اور اپنے شعور سے آگہی رکھتا تھا۔ وہ شاعری نہیں کرتا تھا عوام کے دکھ درد اپنے شعروں میں پیش کرتا تھا، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور تحریک تھا، اس نے ساری عمر قلمی جہاد کیا۔ وہ ظلم و جبر کے اندھیروں میں ایک روشن چراغ تھا۔ جس کو موت کی آندھی نے بجھا دیا اور ہم سے چھین کر بہت دور لے گئی۔ جالب کو اپنے قلم کی آزادی ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ خود کہتا ہے کہ؛

میرے ہاتھ میں قلم ہے میرے ذہن میں اُجالا — مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا

مجھے فکرِ امنِ عالم، مجھے اپنی ذات کا غم — میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

اس کے ہر لفظ سے مقصدیت پنہاں ہے۔ جالب نے خود کئی بار کہا کہ علامہ اقبال نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔" اور ڈیوٹی کو سرانجام دیتے ہوئے مجھے پندرہ سولہ بار جیل جانا پڑا۔ اس نے اپنی زندگی کے حسین لمحے عوام کے حقوق کی خاطر پابندِ سلاسل گزارے۔ جالب پاکستان کے عوام کے دلوں میں بستا ہے۔ اور جب تک باشعور لوگ زندہ ہیں۔ جالب کا نام زندہ رہے گا۔ لیکن صد افسوس کہ جالب، آج ہم میں نہیں ہے۔

تھا عزم جواں جس کے دم سے — وہ جالب ہم کو چھوڑ گیا

وہ صبح روشن کا راہی — دنیا سے منہ موڑ گیا

۱۷ اپریل بروز جمعہ جالب کا چہلم تھا۔ اپنی رہائش گاہ واقع ۱۹ سم۔ نیلم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن

لاہور میں آپ ۱۲ مارچ کو لاہور میں فوت ہوگئے۔

جالب نے بھرپور اور بامقصد زندگی گزاری۔ اسے اس کا شعور تھا۔ جالب خود کہتے ہیں کہ:

سورج کا اک دیا جلا تو دیا چہرۂ تیرگی دکھا تو دیا

جاں گنوا کے جلا کے گھر اپنا پاس جو کچھ تھا لٹا تو دیا

اک انسان نے بے وقاروں کو سر اٹھانے کا حوصلہ تو دیا

شورِ خونِ دوراں نے اے جالب دردمندوں کو کچھ جگا تو دیا

یہ امن کا پیامبر ۱۹۲۸ء کو مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور کے ایک دیہات میانی افغاناں میں پیدا ہوا۔ آپ کے والد کا نام صوفی عنایت اللہ اور والدہ کا نام رابعہ بصری تھا۔ آپ کے بھائیوں میں مشتاق مبارک جس سے جالب بے حد پیار کرتے تھے۔ جالب سے بڑے تھے۔ باقی عبدالحمید خان، سعید پرویز اور ایک بہن رشیدہ بیگم تھیں۔ اپنے بڑے بھائی کے بارے میں تو آپ یہاں تک کہتے کہ اگر مشتاق مبارک نہ ہوتا تو میں آج جالب نہ ہوتا۔ بلکہ ایک عام سادیہاتی ہوتا۔ مشتاق مبارک شاعر بھی تھے۔ اور کراچی کے ادبی حلقوں میں ایک اچھا خاصا نام تھا۔ جالب جب دہلی میں گاؤں سے آکر بسے تو انگریز کے اقتدار کا سورج ڈوب رہا تھا۔ اور ہر طرف انگریزوں کے خلاف نفرت تھی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم دیکھ کر جالب بھی انگریز سے نفرت کرنے لگا۔ پھر برصغیر کی تقسیم دیکھی۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتلِ عام دیکھا۔ قیامت خیز مناظر دیکھے۔ مذہب کے نام پر آدم کی تقسیم دیکھی تو جالب کی عقل دنگ رہ گئی۔ جالب جب ہجرت کر کے پاکستان آئے تو اس وقت اٹھارہ سال کے نوجوان تھے' دہلی سے کراچی آگئے بڑے بھائی کی وساطت سے ادبی حلقوں میں تعارف ہوا۔ پھر جالب تعارف کے محتاج نہ رہے۔ جالب کا سیاسی سفر اس وقت شروع ہوا۔ جب مشتاق احمد گورمانی کے دور میں اسٹوڈنٹس پر گولی چلی تو جالب تڑپ اٹھا۔ جالب ظلم و جبر کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے حیدر بخش جتوئی کی ہاری تحریک میں شامل ہوگیا۔ یہ تحریک مقامی وڈیروں کے ظلم و ستم کے خلاف ہاریوں کی تحریک تھی۔ ہاریوں کی یعنی مظلوموں کی تحریک ہو اور جالب کی پرسوز مترنم آواز "حیدر بخش جتوئی اے سائیں" جالب نے ہاری تحریک کو عوامی رنگ دے کر جان ڈال دی۔ اور پہلی مرتبہ حیدر بخش جتوئی گرفتار ہوتے ۱۹۵۴ء کو پھر یہ سیاسی سفر جاری رہا۔

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں اڑتے پتوں کے پیچھے اڑتا رہا

جب جالب پہ آوارہ کا الزام لگا تو خود بولے :

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں　　دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

اسی دوران ایسا ہوا کہ علاؤ الدین اداکار بڑا انسان دوست اور قدردان انسان ہوا ہے جو کہ اپنے وقت کا مایہ ناز اداکار تھا ۔ وہ جالب کو فلم انڈسٹری کی طرف لانا چاہتا تھا کہ جالب انڈسٹری کے لئے لکھے اور اس کے حالات ٹھیک ہو جائیں ۔ وہ کوشش کر کے جالب کو لاہور لے آیا اور اپنے ساتھ ٹھہرا لیا ۔ جالب میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ وہ کبھی اس پر حرف نہ آنے دیتے تھے ۔ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے "اس وقت کے مشہور فلم ڈائریکٹر جعفر شاہ بخاری اپنی گاڑی میں آئے اور جالب میکلوڈ روڈ لاہور میں ایک پان کی دوکان سے پان خرید رہے تھے کہ گاڑی تھوڑی دور رکی اور جعفری صاحب نے اپنا آدمی بھیجا کہ جالب کو بلا لاؤ ۔ اس سے فلم کے لئے گانے لکھوانے ہیں ۔ اب جالب لاہور لائے بھی اسی مقصد کے لئے گئے تھے کہ فلموں میں گانے لکھیں گے ۔ بڑی دیر بعد یہ چانس مل رہا تھا ۔ لیکن جالب اس بات پر برا مان گئے کہ کوئی کار میں بیٹھ کر اسے اپنے پاس بلائے اس آدمی کو کہا کہ "جا کر کہہ دو کہ میں نہیں آتا" پھر بخاری صاحب خود آئے اور جالب نے کہا "بخاری صاحب غریبوں کی عزت امیروں سے زیادہ نازک ہوتی ہے ۔" اور یہ خودداری ساری زندگی نبھائی کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی ۔ پابند سلاسل رہ کر بھی قدم ڈگمگائے نہیں ۔ کبھی لغزش نہیں آئی ۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اسمبلی کا ٹکٹ دینا چاہا تو جالب نے کہا کہ میں NAP نیشنل عوامی پارٹی میں ہوں اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا اسے ٹھکرا دیا ۔ ہزاروں ایسی مثالیں ملتی ہیں ۔ آخری دنوں میں جب ہسپتال میں تھے ۔ تو حکمرانوں نے کہا کہ ہم آپ کو علاج کے لئے باہر بھیج دیتے ہیں تو جالب بولے کہ "عوام کو تو اسپرین کی گولی نہیں دیتے ہو اور مجھے بیرون ملک بھجوا رہے ہو ۔ نہیں جاؤں گا ۔" اور کبھی سرکاری امداد قبول نہیں کی ۔ پھر روزنامہ جنگ والوں نے جالب کو علاج کے لئے بھیجا ۔

جالب ایک تاریخ ساز شاعر تھے وہ اپنی شاعری کے ذریعے "عوامی تاریخ" لکھ گئے ہیں ۔ جب بھی کسی نے پاکستان کی سیاسی زندگی کا حقیقی روپ دیکھنا ہو اور حکمرانوں اور عوام کے تعلقات کا اندازہ لگانا ہو تو وہ جالب کے کلام کا مطالعہ کر لے ۔ جالب نے عوامی تاریخ کی بنیاد ڈالی ہے ۔

۱۹۶۲ء میں ایوب خان کے آئین کا بڑا چرچا تھا ۔ مری کے مشاعرے میں جالب کو مدعو کیا گیا جس میں سرکاری افسر اور عوام کا جم غفیر تھا ۔ جالب نے اپنی نظم "دستور" پڑھی تو ہل چل مچ گئی ۔ عوام کا جوش و ولولہ قابل دید تھا ۔ حبیب جالب کو بلایا گیا تو کسی کو توقع نہ تھی کہ جالب ایسی نظم کہے گا لیکن عوام کا مجمع ہو پھر جالب کی مترنم آواز عوام کا ضمیر بول اٹھا :

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو
پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

ہجوم نے جلسے کے بعد جالب کو کندھوں پر اٹھا لیا اور ایوب خان مردہ باد کے نعرے بلند ہوئے اس کے بعد جالب فاطمہ جناح کے جلسوں میں جاتے فاطمہ جناح ہر جلسہ میں جالب کو ساتھ رکھتی تھیں۔ ایوب خان کے خلاف نفرت میں جالب کا خاصہ ہاتھ تھا۔ اس وقت کے گورنر نواب آف کالا باغ نے جالب کی گرفتاری کا آرڈر دیا تھا۔ لیکن جالب ان کے ہاتھ نہیں آتے تھے اور عوام کے ہجوم میں وہ اسے گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ جالب کے نغمے عوام کے دلوں میں بسنے لگے۔ جالب اب ایک عوامی شاعر بن کر ابھرے، جالب بولا:

عام ہوئی غنڈہ گردی   چپ ہیں سپاہی باوردی
شمع نوائے اہلِ سخن   کالے باغ نے گل کردی

اسی طرح جالب وقت کے ساتھ ساتھ عوامی تاریخ رقم کرتے جاتے ہیں۔ جب یحییٰ خان کے دور میں مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن ہوا تو عوام کا ضمیر بولا:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو   وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے   یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

جالب بھٹو کو ایک اچھا انسان سمجھتا تھا، لیکن جب بھٹو کے دور میں ظلم و تشدد ہوا تو بولے:

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا   لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

پھر ضیاء الحق کا دور آیا، مارشل لاء لگا ہزاروں سیاسی کارکن جیلوں میں گئے شاہی قلعے کی سیر کی۔ اذیتیں سہیں جالب خود اکثر جیل میں رہے تو ہمعصروں نے کہا کہ ظلمت کو ضیا لکھوا انعام ملتے ہیں مگر

'کو صبا کہو خطاب ملتے ہیں۔ بندے کو خدا کہو ایوارڈ ملتے ہیں' جالب نے کہا جو ضمیر مانے گا' عوام چاہیں گے وہ لکھوں گا جالب بے ساختہ بول اٹھے:

ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر' دیوار کو در' کرگس کو ہما کیا لکھنا
اِک حشر بپا ہے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنبدِ بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
لوگوں ہی پہ ہم نے جاں واری کی ہم نے انہیں کی غمخواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جالب عہد بہ عہد عوام کے حقوق کی جنگ لڑتا رہا انہیں صراطِ مستقیم بتاتا رہا اور سچائی سے آگاہ کرتا رہا' اور اپنے جینے کا حق ادا کرتا رہا' اپنے خیالات کا پرچار کرتا رہا جب عوام دوست، جمہوریت پسند اور ترقی پسندوں کے خلاف ملاؤں نے شور ڈالا تو جالب نے رہنمائی کی' بولے:

خطرہ ہے درباروں کو
شاہوں کے غمخواروں کو
نوابوں' غداروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
خطرے میں اسلام نہیں

پھر عوام نے جالب کی آواز میں آواز ملائی اور کہا کہ:

خطرہ ہے سرداروں کو
اسلام کے ٹھیکیداروں کو
امریکہ کے یاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
خطرے میں اسلام نہیں

جب جمہوریت ہی کے نام پر عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا گیا تو جالب عوام کو اپنی مجبوری بھی بتاتے رہے اور نام نہاد جمہوری قدروں کا پردہ بھی چاک کرتے رہے:

دیس میرا آزاد ہے یارو، دور نالے جمہوری اے
حق دی گل میں کہہ نئیں سکدا اینی کی مجبوری اے

جالب کی شاعری میں ہر دور کا منظر اور حقیقی عوامی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ عوام کا مقدمہ لڑتا رہا۔ اس ملک کے لئے، اس ملک کے لیے عوام کی خوش حالی کے لئے، مزدوروں، کسانوں کے لئے، غریب عوام کے لئے وہ اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا تھا۔ وہ تو پاکستان میں امن، خوش حالی اور مساوات کا حقیقی روپ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ انسان دوست اور انسان سے پیار کرنے والا شخص تھا۔ جالب خود کہتے ہیں:

اپنا تو منشور ہے جالب سارے جہاں سے پیار کرو

عوام نے جالب کو پیار بھی دیا۔ لیکن جالب نے بھی عوام سے وفا آخری وقت تک نبھائی۔ عوام دوستی کے صلے میں تو جالب نے ۱۷ - ۱۵ بار جیل کاٹی۔ صرف عوام کی خاطر۔ جالب نے عوام دوستی کی بڑی بھاری قیمت چکائی زندگی کے حسین لمحات پابند سلاسل رہ کر گزار دیئے۔ جنرل ضیاالحق کے دور میں جب صوبائی تعصب پھیلایا گیا پنجابی کو سندھی گالی دینے لگا مہاجر کو سندھی اپنا دشمن خیال کرنے لگا سندھ میں احساس محرومی بڑھا۔ ضیاء نے فوجی دنیا کے افسروں کو سندھ میں زمینیں الاٹ کیں اور جان بوجھ کر سندھ میں بڑے بڑے انتظامی عہدوں پر پنجابیوں کو لگا دیا جس سے مارشل لاء کے خلاف نفرت کی بجائے پنجابیوں سے نفرت کی جانے لگی تو ایسے حالات میں ۱۹۸۳ء میں لاہور ہائی کورٹ بار کے زیر اہتمام ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں جالب مدعو تھا جالب نے حالات کو پرکھا اور موقع کو غنیمت جانا اور بولے:

جاگ میرے پنجاب کہ پاکستان چلا لوٹ چلے سب خواب کہ پاکستان چلا
جن کو ذات کا غم ہے وہ کب مانے ہیں بے بس لوگوں پہ بندوقیں تانے ہیں
قاتل ہیں اسباب کہ پاکستان چلا جاگ میرے پنجاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
سندھ بلوچستان تو کب سے روتے ہیں اور اہل پنجاب ابھی تک سوتے ہیں
آنکھیں ہیں پُر آب کہ پاکستان چلا جاگ میرے پنجاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد بے نظیر کا دور آیا تو جالب کو تھوڑا سا سکون ملا کہ اب کوئی سیاسی قیدی جیل میں نہیں جائے گا۔ عوام کی حالت سدھر جائے گی۔ مہنگائی کم ہو گی۔ عوام کا معیار زندگی بلند ہو گا لیکن

یہ سب خواب تھے جالب کے جو پورے نہ ہو سکے۔ عوام جوں کے توں محروم اور بے سہارا، مہنگائی میں دبے، مرجھائے چہرے۔ جالب سے نہ رہا گیا۔ اور کہا؛

وہی حالات ہیں فقیروں کے　　دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے

ہر بلاول ہے دیس کا مقروض　　پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

اور پھر بولے ؛

ناں جا امریکہ نال کڑے　　ساڈوں تیرا بہت خیال کڑے

جالب NAP کے وقت سے ولی خان کے ساتھ چلے آرہے تھے جب چار پارٹیوں سے مل کر عوامی نیشنل پارٹی ANP بنی (یعنی مزدور کسان پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی PNP، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی NDP اور پاکستان عوامی تحریک پلیجو گروپ) تو جالب بھی NAP میں شامل تھے اور ولی خان کو اپنا لیڈر مانتے تھے۔ اور جب نواز شریف کے دور میں ANP نے اسلامی جمہوری اتحاد کا ساتھ دیا اور نواز حکومت میں شامل ہو گئی تو جالب رنجور ہو گئے۔ اور ایک انٹرویو میں صاف کہہ دیا کہ اب ولی خان میرے لیڈر نہیں ہیں نہ میں NAP کا ہوں، میری پارٹی اب عوام ہیں۔ جس پارٹی کی خاطر انہوں نے بھٹو کی طرف سے پیش کردہ قومی اسمبلی کا ٹکٹ ٹھکرا دیا تھا اس کو اپنے اصولوں پر چلتے ہوئے چھوڑ دیا۔ ایسے اصول پرست سیاسی زندگی میں بہت کم ملتے ہیں باقی نواز شریف کے بارے میں کسی نے پوچھا کہ آپ نواز شریف کے خلاف کیوں ہیں تو جالب نے کہا بھائی میری ساری زندگی سیاسی سفر میں گزری ہے جلسوں جلوسوں میں گیا ہوں ہر جمہوری تحریک میں شریک ہوا ہوں جیل میں رہا ہوں پورے اس سیاسی سفر میں نواز شریف کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ میں کیسے اسے اپنا لیڈر مان لوں اب نواز حکومت ختم ہو چکی ہے اور گو بابا گو کا نعرہ لگانے والی بابے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ آج جالب زندہ ہوتے تو بے نظیر سے سخت ناراض ہوتے۔

ایک دفعہ جالب ہمارے ایک دوست کے یہاں ماڈل ٹاؤن لاہور میں تشریف لائے جہاں اکثر آتے جاتے تھے راقم بھی وہیں پہ رہائش پذیر تھا کہ جالب صاحب رات کو تقریباً نو بجے آئے۔ اس دن بڑے موڈ میں تھے ایم آر ڈی کی تحریک چل رہی تھی۔ مارشل لاء کا زمانہ تھا ہم جالب سے سوال کر رہے تھے وہ بڑی متانت سے جواب دے رہے تھے ہم نے تو جالب کو صرف شاعر سمجھا تھا وہ تو بلا کا دانشور تھا میں نے جالب کی کافی ساری نظمیں یاد کر رکھی تھیں جو کہ ہم ایم آر ڈی کے جلسوں میں پڑھتے تھے جب میں نے جالب کو ان کی نظمیں ترنم سے سنائیں تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے آپ جیسے ساتھیوں کو دیکھ کر میرا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے جالب نے خود بھی بہت سی نئی نظمیں سنائیں

ہم ایک دفعہ جالب کو راولپنڈی میں یوم مئی کے جلسے میں لائے تھے جس میں مزدور رہنما او طارق لطیف

بشیر ظفر اور دیگر رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ رات کے آٹھ بج گئے تھے لیکن جالب کی مسحور کن آواز اور مترنم نظمیں سن کر ہر کوئی مچل رہا تھا اور پورا مجمع جالب کا شیدائی بن گیا اس سے پہلے جالب رائے ونڈ میں نہیں آیا تھا لیکن اس جلسہ کے بعد ہر ایک کی زبان پر جالب کا نام تھا جالب کو اپنی سچائی کا یقین تھا۔ جالب کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے:

آئی اے رحمٰن

جالب ایسا ہی آزاد، خوددار، نڈر اور خوش گو تھا جیسا کہ وہ اشعار میں نظر آتا ہے۔

محسن بھوپالی

تذلیل کے حربوں سے رنجور نہیں ہوتا — تحسین کے جملوں سے مغرور نہیں ہوتا
جو کچھ بھی کہا اس سے انکار نہیں ہوتا — اور خوف حراست سے مستور نہیں ہوتا
حق بات بھی کہتا ہے پھر ظلم بھی سہتا ہے — اور ملک میں رہتا ہے مفرور نہیں ہوتا

سید سبط حسن

اُردو زبان نے نظیر اکبرآبادی کے بعد اگر سچ مچ کوئی عوامی شاعر پیدا کیا ہے تو وہ حبیب جالب ہے۔ ان کا رہن سہن عوامی ہے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عوامی ہے ان کی قدریں عوامی ہیں ان کی محبتیں اور نفرتیں عوامی ہیں اور وہ عوام کے دکھ درد، آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی عوام کی زبان میں کرتے ہیں۔

جالب نے جو کچھ کیا وہ اس سے مطمئن نظر آتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی، ایک انسان جس نے اپنے جسم و روح کا رشتہ بھی قائم رکھنا ہو۔ وہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے۔ جالب خود کہتے ہیں۔

ذرے ہی سہی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم — دل لے کے سر عرصۂ غم آ تو گئے ہم
اب نام رہے نہ رہے عشق میں اپنا — روداد وفا دار پہ دہرا تو گئے ہم
اٹھیں کہ نہ اٹھیں یہ رضا اُن کی ہے جالب — لوگوں کو سرِ دار نظر آ تو گئے ہم

(ماہنامہ منشور کراچی مئی ۱۹۹۳ء)

بیاد جالب
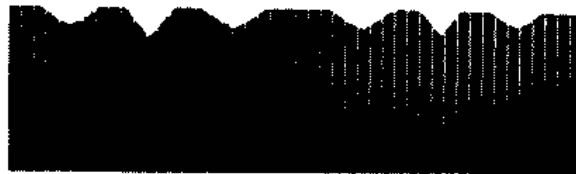
احمد ندیم قاسمی

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ لمحے فن میں ڈھل کر صدیاں بن جاتے ہیں۔ اُس کی ایک مثال تو مولانا ظفر علی خان کی استعمار دشمن شاعری ہے۔ اُن کے فوراً بعد حبیب جالب کا نام آتا ہے۔ اُس نے شاعری کا آغاز روایتی موضوعات سے کیا اور کچھ ہی عرصے میں اُس نے اپنی انفرادیت یوں تسلیم کرالی کہ اس شاعری کو سہل ممتنع کی ایک بلیغ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ سلاست اظہار بہت مشکل فن ہے۔ خاص طور سے جب اظہار ایسے جذبات و تصورات کا ہو جن کو فن میں منتقل کرتے ہوئے بیشتر اُردو شعراء نے طویل تراکیب اور پے در پے اضافتوں اور عربی فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ کی بھرمار کردی ہو۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ سلاستِ اظہار اُردو شاعری کی ایک قدیم روایت سے باقاعدہ بغاوت ہے اور جالب نے ابتدائی دَور کی غزلوں میں اپنے آپ کو اِس طرح کا ایک کامیاب باغی ثابت کیا۔

اُس کے بعد جالب نے اپنے فن میں اظہار کی ایک اور صفت کو اتنی خوبی اور تسلسل سے برتا کہ وہ پاکستان کی گزشتہ ۳۵ برس کی تاریخ میں آزادیِ اظہار اور جراَتِ اظہار کی ایک علامت بن گیا ----- اور لطف کی بات یہ ہے کہ آزادی و جراَت کے اظہار میں بھی وہ سلاستِ اظہار سے دست کش نہ ہوا بلکہ، میری رائے کے مطابق، اُس دَور میں جالب کی ملک گیر مقبولیت میں اُس کے موضوعات کی اہمیت اور ہمہ گیری کے علاوہ اُس کی سلاستِ اظہار کا بھی بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ جو بھی کہتا ہے، کچھ اس طرح عام بول چال کے انداز میں کہتا تھا کہ اس کا کلام، پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ میں براہ راست اُتر کر اُس کی شخصیت میں رچ بس جاتا تھا۔

حبیب جالب ترقی پسند ادب کی تحریک کی پیداوار تھا مگر گزشتہ ۳۵ برس کے ادبی منظر میں اُس کی شخصیت شاید واحد شخصیت ہے جس نے بجائے خود ایک تحریک کا منصب ادا کیا۔ ترقی پسند ادب

تقسیم، ہجرت اور فرقہ واریت کے شکار
برصغیر کے کروڑوں افراد کی زندگی کے
عظیم تاریخی المیہ
پر مبنی
نند کشور وکرم
کے ناول
یادوں کے کھنڈر
کا دوسرا ایڈیشن
قیمت ۵۰ روپے
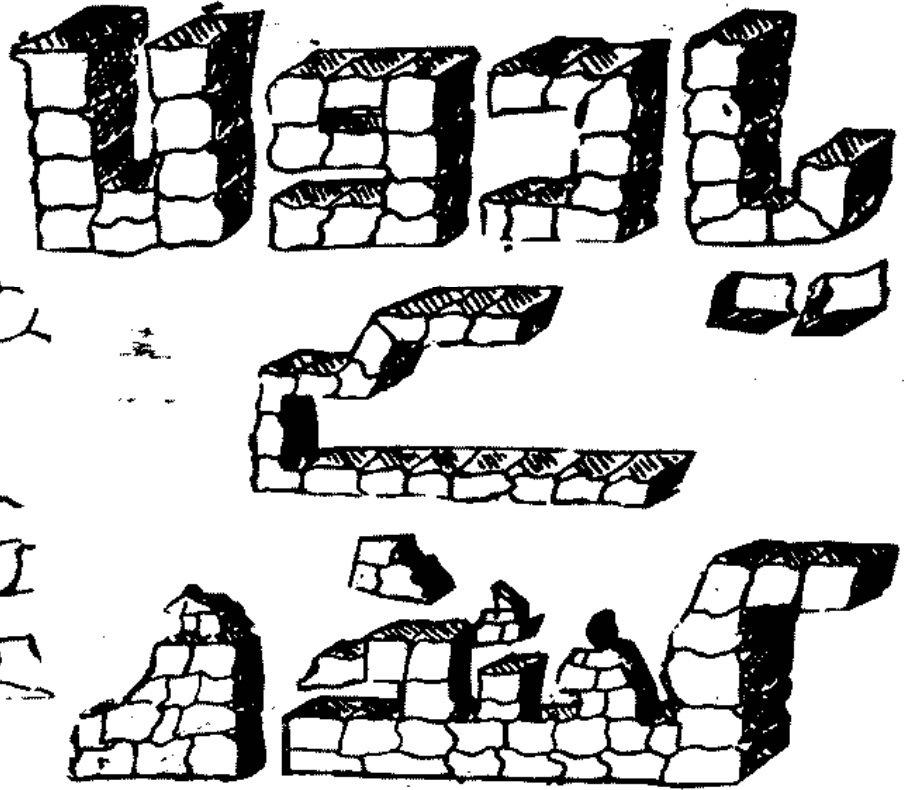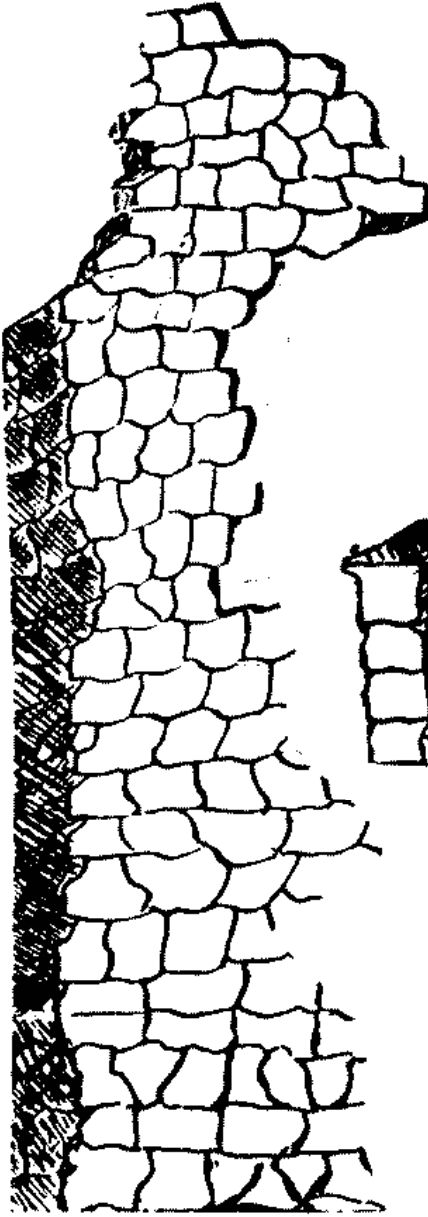
کی تحریک تو اب تک رواں دواں ہے مگر اُس کی تنظیم آج سے نصف صدی پہلے انتشار کا شکار ہو گئی تھی اور تنظیم کی غیر موجودگی میں کسی واحد شاعر کا تحریک ساز بن کر نمایاں ہونا بہت ہی دشوار مرحلہ ہے۔ حبیب جالب نے یہ مرحلہ پامردی سے طے کیا اور اسی لئے وہ معاصر اُردو شاعری میں حق گوئی اور بے باک گوئی کی ایک علامت بن گیا۔ ہر فرد اپنی اپنی معاشرتی مجبوریوں کا اسیر ہوتا ہے اور شعرا بھی معاشرے کے افراد ہوتے ہیں اس لئے وہ اس اسیری سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ حبیب جالب بھی آپ کی اور ہماری طرح اسی معاشرے کا ایک رکن تھا مگر اُس کا امتیاز یہ تھا کہ اُس نے اس طرح کی کسی مجبوری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اُس کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ اُس نے نہ تو دور از کار علامت کا سہارا لے کر خود کو چلمن کے پیچھے چھپایا اور نہ استعارے کو پھیلا کر اپنے مافی الضمیر کو فنی پینتروں کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا۔ ہر بات براہِ راست کی اور قطعی طور پر غیر مبہم اور دو ٹوک انداز میں کی اور اُس نے یہ سب کچھ اُس دور میں کیا جب سچ بولنا اپنا سر کاٹ کر ہتھیلی پر دھر لینے کے مترادف تھا۔

بے شک اس سے پہلے متعدد شعراء غزل کو عصری حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں قابلِ قدر کام کر چکے تھے اور غزل کو قدیم دور کے معین موضوعات کے حبس سے نکالنے کے لئے زمین ہموار کر چکے تھے مگر جب کوئی کاشت کرنے والا ہی نہ ہو تو ہموار زمینیں بھی ویرانوں میں بدل جاتی ہیں۔ اُس دور میں صرف جالب ہی ایک ایسا شاعر تھا جس نے چھپ چھپا کر نہیں بلکہ دن کی روشنی میں اور ساری دنیا کے سامنے اُن ممنوعہ زمینوں کا رُخ کیا اور اُن میں حق و صداقت اور حوصلہ و جرأت کی ایسی فصلیں کاشت کیں کہ خود اُس کے حصے میں تو قید و بند کی صعوبتیں آئیں مگر اُس نے آنے والی نسلوں کے لئے سچ بولنا آسان بنا دیا۔

بہر طور یہ ہے کہ اُس نے جو کچھ بھی کہا، حیرت انگیز حوصلے اور خلوص کے ساتھ کہا۔ یہ حوصلہ اسے صداقت کے اعتماد نے بھی دیا اور ملک کے اُن عوام کی حمایت نے بھی جن کی محرومیاں اور جن کے بنیادی حقوق کی پامالی جالب کی شاعری کا موضوع بنی اور اُس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ بن گیا۔ یہ شہرت اور مقبولیت اور عزت اُس پر آسمان سے نہیں پھٹ پڑی تھی۔ اُس نے یہ سب کچھ بے شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا کہ اُس کی عظیم جدوجہد ہی اُس کا استحقاق تھا۔ پاکستان کی ادبی اور سیاسی تاریخ میں اُس کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

(فنون لاہور جنوری۔ اپریل ۱۹۹۳ء)

افضل توصیف

حبیب جالب نے بہت کچھ کہا اور خود اپنے بارے میں جو مختصر کہا وہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ کسی اور کو کہنے کو بچا کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس کی شاعری دس کروڑ عوام کی جمہوریت ہے۔ یہ شاعری لوگوں کے لئے ہے، لوگوں کی ہے اور لوگ ہی اس کے تخلیق کار ہیں۔ ایک وسیع زمین پر پھیلی لوگوں کی زندگی اور نصف صدی تاریخ کے اُتار چڑھاؤ میں، شاعری کو جو کردار ادا کرنا تھا، وہ سب سے زیادہ حبیب جالب کے حصے میں آیا۔ آج یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ گواہی کے لئے اس کا کلام سامنے پڑا ہے۔ اس کتاب کو جہاں بھی شروع کر لو، دو حوالے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وقت اور سیاست لوگوں کی حالت اور احساس۔ عالمی سطح پر اور ملک کے اندر کی زمین پر جو کچھ ہوا اور جس طرح سے بھی ہوا حبیب جالب نے اُس پہ لفظوں کا جال پھینکا۔ اور ہمیشہ لوگوں کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر۔

جب بھی دیکھیں جہاں سے بھی دیکھیں، جس دَور کی نظم کو دیکھیں تاریخ کا جھروکہ کھلتا ہے۔ اسی جھروکے سے وقت کا آسمان بھی دکھائی دیتا ہے، دنیا میں پڑا ہوا سامراجوں اور عوام کے مابین دنگل کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا ہے وہ زمین جس پر دس کروڑ عوام کے ساتھ جالب خود رہ رہا ہے۔ جالب کی اُمیدیں، انتظار اور محبتیں، نفرتیں وہی ہیں جو پاکستان کے محنت کش عوام کی ہیں۔ جالب کی مرضی ہے، ضرورت، خواہش، نظریہ اور فلسفہ سبھی کچھ لوگوں کی آزادی، خوش حالی اور ترقی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ شاندار انقلاب ہے یہی عوامی جمہوریت ہے جس کی زندگی کو ضرورت ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ ہے وہ زندگی کے منافی ہے، یہاں صرف جالب ہی نہیں

اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو جالب نے نہ مانا' تو لوگوں نے بھی نہ مانا۔ مگر لوگوں کے خلاف تو مسلسل سازشیں چل رہی تھی۔ اس سازش کو بے نقاب کرنا بھی ضروری تھا' عوام کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کی طاقت کا شعور دینا بھی۔ صدیوں کی پسماندگی اور جہالت نے اس خطے کے عوام کو اپنی طاقت سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ دس کروڑ پر چند لوگوں کی بادشاہی۔ جالب اس بادشاہی کو نہیں مانتا۔ وہ اس طاقت کو براہِ راست مخاطب کرتا ہے:

مشعلیں کر دو روشن دُور تک اندھیرا ہے
کب سے کالے ہاتھوں نے آدمی کو گھیرا ہے
یہ ملیں یہ جاگیریں کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں کس کے بل پہ جیتی ہیں
کس کی محنت کا پھل داشتائیں کھاتی ہیں
کاش تم کبھی سمجھو دس کروڑ انسانو!

انہیں دس کروڑ انسانوں کی پناہ میں کھڑے ہو کر جالب میں اتنی طاقت آگئی کہ وہ اعلان کرنے لگا "اپنی جنگ جاری رہے گی!" اس جنگ میں وہ پورے مشرق میں پھیلے ہوئے عوامی محاذوں کا اتحادی ہو گیا۔ محل کے خلاف کٹیا کے ساتھ' مغرب کے خلاف مشرق کے ساتھ، سامراج کے خلاف پرولتاریہ کے ساتھ۔ مرد شاونزم کے خلاف کمزور عورتوں کے ساتھ۔ سیٹھ کے خلاف سیل مین کے ساتھ۔ جالب کی جنگ کا محاذ لمبا ہوتا چلا گیا۔ اس کی مقبولیت لوگوں میں پھلتی پھولتی رہی۔ کتنی نظمیں اگرچہ سیاسی نہیں مگر کس بہت مقبول عام گیت کی طرح گلیوں اور بازاروں میں گائی جانے لگیں۔

ایوب خان کی آمریت میں زبان بندی کے سخت دستوروں کے ساتھ گماشتہ سرمایہ داروں نے اس ملک میں قدم رکھا۔ سامراج نے عوام کے خلاف' انقلاب کے خلاف قلعہ بندیاں کیں۔ حکمران طبقے کو عیش کا خوگر بھی بنایا۔ دولت کی ایڈ آئی دولت کا ارتکاز ہوا تو مفلسی و بدحالی خوب پھیلی۔ جالب کی آواز ابھری:

بیس گھرانے آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب زندہ باد
آج بھی ہم پہ جاری ہے
کالی صدیوں کی بے داد

پاکستان میں کالی صدیوں کی ایکسٹنشن ہو گئی تو نئی صدی میں یہاں نیو کلونیل دور اُتر آیا۔ سیٹو سینٹو کے معاہدوں کا پابند ہو کر یہ ملک قعرِ غلامی میں اترتا چلا گیا۔ مگر جالب کو یہ سب کچھ منظور نہیں تھا۔ وہ سامراج کے مقابل تن کر کھڑا ہو گیا اور سامراج دوست حکمرانوں کا دشمن بن

گیا۔ اس کی حب الوطنی بڑھتی چلی گئی۔ وہ سارے عوام کو خوشحال اور ترقی کرتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ سب کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں۔ علم و تعلیم کے دروازے سب پر کھلے ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے اگر سامراج سے آزادی ہو۔ جاگیرداری و سرمایہ داری کا نظام ختم ہو۔ اگر لوک راج ہو، محنت کش کی برتری ہو، تب ہی پاکستان کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے یہ ملک بنا تو پھر یہی ہونا چاہیئے۔ پاکستان کا منشور جالب کے لفظوں میں اس طرح ہونا چاہیئے:

روٹی کپڑا اور دوا　　گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت مجھے تعلیم دلا　　میں بھی ہوں مسلمان واللہ

مسلمانوں کے حق کی حفاظت کا تقاضا تو یہ ہے کہ:

کھیت وڈیروں سے لے لو　　ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو　　رہے نہ کوئی عالی جاہ

جالب کی شاعری کا پھیلاؤ اتنا ہی ہے جتنا پاکستان کے عوام کا، تیسری دنیا کے مظلوم اور ظلم کے خلاف صف آرا ہونے والے انسانوں کا۔ جہاں کہیں بھی ہو کچھ بھی ہو جالب وہیں ہوتا تھا، کراچی میں گولی چلے یا بنگال کی بگیا لہولہان کی جائے۔ فلسطینی بے گھر ہوں یا لبنان جلے۔ طلبا شہر بدر کئے جائیں یا اخبار ضبط ہو۔ عورت کی حیثیت گرانے کا قانون بنے یا نیلوفر بجیسر پہن کر ناچنے سے انکار کردے۔ جالب نظم لکھتا، مظاہروں میں جاتا۔ پولیس کی لاٹھیاں کھاتا۔ جمہوریت کی تحریک میں آگے آگے چلتا۔ حاکم اس کی طاقت کو سمجھتے تھے۔ لیکن کسی حاکم نے اس کی بات کو نہیں سمجھا حالانکہ وہ صاف صاف جتادیا کرتا تھا۔ اور آخر میں اس کی کہی بات ہی درست بھی ثابت ہوئی:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو　　وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے　　یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

اس دور میں لوگوں کی طرف کے شاعر کو جو کرنا چاہیئے جالب نے وہ کیا۔ اپنی قطعی کمٹمنٹ کے ساتھ اپنی سچائی کا جالب کو خود بھی پورا یقین تھا۔ گا ہے گا ہے وہ اس کا اعلان بھی کیا کرتا تھا۔ نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی۔ خوشامدی اور درباری سے اسے نفرت تھی۔ ان سے بھی جنہوں نے لوبھ لالچ کے لئے فن کی حرمت بیچ ڈالی۔ ایک فرد کی زندگی کی اوقات ہی کیا ہے، خواہ وہ شاعر ہو یا ادیب۔ یہ بات جالب خوب سمجھتا تھا۔ اس نے کئی بار ایسے شاعروں، ادیبوں

کی سندا کی جو دکھاوے کے لئے لکھتے ہیں یا لوبھ لالچ کے لئے ۔ عوام کے دکھ درد سے الگ رہ کر اپنی اور اپنے حاکم کی خوشی چاہتے ہیں ۔ حبیب جالب کی شاعری کا اثر پھیلتا تھا ۔ اجالے کی طرح اس کی آواز اثر رکھتی تھی ۔ سخت اندھیری اور لمبی راتوں میں غریب کی کندھ کا یہ دیا آخر بجھ گیا ۔ مگر ایک بے مثال جد و جہد کی مثال چھوڑ گیا ۔ آندھیوں سے لڑتے ہوئے چراغ کا استعارہ اب جالب کا نام ہوگا ۔ نئے شاعر کے لئے اس نے بہت پہلے وصیت لکھی تھی ۔ سچ ہی لکھتے جانا :

دینا پڑے کچھ ہی ہرجانہ، سچ ہی لکھتے جانا — مت گھبرانا مت ڈر جانا سچ ہے لکھتے جانا
باطل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی بجھ پائیں — وہ شمعیں روشن کر جانا سچ ہی لکھتے جانا
پل دو پل کے عیش کی خاطر کیا دبنا کیا جھکنا — آخر سب کو ہے مر جانا، سچ ہی لکھتے جانا
لوحِ جہاں پہ نام تمہارا لکھا رہے گا یونہی — جالب سچ کا دم بھر جانا سچ ہی لکھتے جانا

سچ لکھنے والے نے زندگی بھر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ۔ اور جنگ بستر مرگ پر بھی جاری رکھی ۔ جالب تو چلا گیا ۔ جب تک جیا اس نے سچ ہی لکھا ۔ جب اس کی آواز نے ساتھ دیا وہ کڑی اور سخت سچائیوں کو مدھر گیت بنا کر گاتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخری دم تک سچ لکھنے کا اس کا مشن پورا ہوا ۔ مگر اس کے خواب پورے نہیں ہوئے ۔ نئی دنیا کی شاندار حقیقتیں جالب کی آنکھوں کے خواب تھیں وہ اندھیری غریب بستیوں میں چراغاں دیکھنا چاہتا تھا سماج کو انقلاب آشنا دیکھنے کا تمنائی ۔ انسان کی عزت آبرو کا خواہاں تھا ۔ قوموں اور قومیتوں کی آزادی کا حامی تھا ۔ استحصالی نظام کا خاتمہ چاہتا تھا ۔ اسے نفرت تھی ۔ ۔ سامراجوں سے ڈکٹیٹروں اور سیٹھوں سے ۔ پولیس کی لاٹھی اور جاگیرداری کے بدمعاش کلچر سے ۔ جالب روشنی چاہتا تھا علم کی عقل اور انسانیت کی ۔ اس نے محنت کش کو آسودہ زندگی دینے کے وعدے کر رکھے ہیں ۔ اس کی شاعری میں ایک آدرش ہے ایک مستقبل کا خواب ۔ مستقبل جو زندگی کو آسودہ کرتا اور آگے بڑھاتا ہے ۔ محرومیوں سے نکالتا استحصال سے بچاتا ہے ۔ خوش حالی کے کھیت لہراتا ہے، بھکاری بچوں کے لئے اسکول کھولتا ہے ۔ بے بضاعت عورتوں کے لئے آبرومندی کے مقام بناتا ہے ۔ وہ مستقبل جو اس صدی کے شروع میں دنیا کی دھرتی کے کچھ حصوں پر اترا تھا جس نے کارخانے کھولے ۔ بردا فعل ہاؤس بند کئے ۔ جس نے کسان کے لئے کمیون بنائے ۔ مزدور کے لئے شاندار یونین قائم کی ۔ اسی مستقبل کے لئے پاکستان کی دھرتی بھی آس لگائے بیٹھی ہے ۔

جالب وعدہ کر کے گیا ہے کہ یہ آس ٹوٹے گی نہیں ۔ وہ صبح ضرور آئے گی اور وہ عہد حسین جس کا وعدہ ہے ۔ جس کا انتظار ہے اس دھرتی کو ۔ اس پر بسی ہوئی ہر ایک غریب بستی کو وہ کہتا ہے :

میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت
دکھ میں ڈوبے ہوئے دن رات گزر جائیں گے
کوئی تحقیر کی نظروں سے نہ دیکھے گا ہمیں
پیار کے رنگ ہر اک سمت بکھر جائیں گے
پیار اُگائے گی نگاہوں کو سکوں بخشے گی
یہ زمیں خلدِ بریں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ بریں کی صورت

اس عہد میں کیا کچھ ہوگا۔ وہی جالب کے خوابوں کی تعبیر ہوگی۔ وہی انسان کی عزت ہوگی۔ وہی غلامی سے نجات ہوگی۔ سبھی کچھ بدل جائے گا۔ نظام بھی کتاب بھی اور زبان بھی:

ایسے الفاظ نہ اوراقِ لغت میں ہوں گے
جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے
ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے
چند لوگوں ہی کی تسکین کا پہلو نکلے
خوں نہ روئے گا کبھی درد کی تنہائی میں
دل کسی خاک نشیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت

وہ عہدِ حسیں جس میں اولادِ آدم غلاموں اور آقاؤں کے گھیرے توڑ کر ایک جگہ کھڑی ہوگی حاکم محکوم، ظالم مظلوم بنانے کا دستور مٹ جائے گا ایسے الفاظ بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے انسان کا وقار مجروح کیا جاتا ہے:

کسی لہجے سے نہ مجروح سماعت ہوگی
جہل سے ناز اُٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو
یاس انگیز اندھیرا نہ کبھی چھائے گا
آس کے دیپ بجھانے نہ پڑیں گے ہم کو
غم کے ماروں کی ہر شاخ چمک اُٹھے گی
صبحِ فرخندہ جبیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت

کیوں نہیں، جالب زمین کا آدمی تھا۔ زمین کا آدمی ہمیشہ لوٹ آتا ہے۔ اور کسی نئے عہد میں ہی اس کی واپسی ہوا کرتی ہے۔

(ماہنامہ منشور کراچی اپریل ۱۹۹۳ء)

کے

کتابی روپ

☆ دلی والے (جلد اول)	مرتب : ڈاکٹر صلاح الدین	۳۶/-
☆ دلی والے (جلد دوم)	مرتب : ڈاکٹر صلاح الدین	۵۰/-
☆ مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے	مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم	۴۸/-
☆ داغ دہلوی حیات اور کارنامے	مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی	۳۱/-
☆ خواجہ حسن نظامی حیات اور کارنامے	مرتب : خواجہ حسن ثانی نظامی	۲۹/-
☆ اردو صحافت	مرتب : انور علی دہلوی	۳۲/-
☆ دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل	مرتب : صدیق الرحمٰن قدوائی	۲۳/-
☆ اردو غزل	مرتب : کامل قریشی	۴۰/-
☆ نیا اردو افسانہ تجزیہ اور مباحث	مرتب : پروفیسر گوپی چند نارنگ	۴۰/-
☆ نئی تعلیمی پالیسی اور تدریس	اردو اکادمی کی پیش کش	۳۰/-
☆ اردو مرثیہ	مرتب : ڈاکٹر شارب ردولوی	۵۰/-
☆ نیا افسانہ مسائل اور میلانات	مرتب : پروفیسر قمر رئیس	۴۸/-

سعید انجم

پاکستان سے علامہ اقبال کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر منعقد ہونے والے مشاعرے کی آڈیو کیسٹ اوسلو پہونچی تو دوستوں نے شوق سے ایک اجتماع کا اہتمام کیا اور کان سپیکروں سے لگا دیئے۔ جالب کی باری آئی تو وہ اشعار سنانے سے پہلے بولے ــــــ "علامہ اقبال ڈیوٹی لگا گئے تھے: ع اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ــــــ اور میں ڈیوٹی بھگتانے کے نتیجے میں کوئی پندرہ مرتبہ جیل جا چکا ہوں۔"

"گنبدِ بے در" ۱۹۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی تو جالب کی پہلی کئی کتابوں کی طرح اسے بھی بین کر دیا گیا۔ سویڈن کے ایک مکتبہ نے اس مجموعہ کا نیا ایڈیشن شائع کر دیا۔ تب ناروے سے حبیب جالب کے نام ایک دعوت نامہ بھیجا گیا کہ وہ اوسلو تشریف لائیں۔ سکنڈے نیویا کی خوش قسمتی کہ شاعر کا جواب اثبات میں آگیا۔ اب ضرورت تھی ایک خط کی جو نارویجن حکام کے نام اس مہارت سے لکھا جاتا کہ اسلام آباد میں نارویجن سفارت خانہ ہمارے مہمان کا ویزہ روکنے کی کوشش نہ کرتا۔

ویزہ نہ ملنے کے خدشات اس لئے بھی تھے کہ سویڈن سے شائع ہونے والے ایڈیشن کے پیش لفظ میں سبطِ حسن صاحب نے لکھا تھا ــــــ "مہنگائی کے اس دور میں ایک اور چیز (خون کا وہ پہلے ذکر کر چکے تھے) بہت سستی بک رہی ہے اور وہ ہے غداری کی تہمت۔ یہ تماشا ہم گزشتہ چوتھائی صدی سے دیکھ رہے ہیں۔ جو شخص استبداد کے تازیانے کو اللہ کی

رستی نہیں کہتا، پاکستان کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ پھر حبیب جالب میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے کہ اس پر یہ الزام نہ لگتا۔"

چنانچہ طے پایا کہ نارویجن حکام کے نام ویزے کے لیے خط کسی نارویجن دوست کی مدد سے لکھا جائے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب انیتا سے جالب کا غائبانہ تعارف کرایا گیا۔ اُس نے بتایا کہ خط میں یہ مت لکھو کہ اُس کے دشمن کیا کہتے ہیں بلکہ یہ بتاؤ کہ خود شاعر اپنے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اُس کے دوستوں کا اُس کے بارے میں کیا خیال ہے۔

جالب کا اپنے بارے میں ایک موقف تو بہت واضح تھا۔ اُس نے کئی موقعوں پر کہا تھا کہ معاشرے میں دو ادارے ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ایک دربار کا ادارہ اور دوسرا عوام کا۔ خود کو اُنھوں نے ہمیشہ عوام کے ادارے سے منسوب کیا تھا۔

دوستوں کے بارے میں سوچتے ہی فراق گورکھپوری کا خیال آیا جنھوں نے کہا تھا ـــــــــ "میرا بائی کا سوز اور سورداس کا نغمہ جب یکجا ہو جاتے ہیں تو اُسے حبیب جالب کہتے ہیں"۔ پھر فیض صاحب کی بات بھی یاد آئی ـــــــــ "ولی دکنی سے لے کر آج تک کسی بھی شاعر کو اتنے سامعین میسّر نہیں آئے جتنے حبیب جالب کو ملے ہیں"۔

اِس آئیڈیا کو تو فوراً جھٹک دینا ہی مناسب لگا۔ ولی دکنی، فراق گورکھپوری، میرا بائی اور سورداس ـــــــــ یہ سب نام مغرب کے لیے اجنبی تھے۔ پھر اُس کتاب کا خیال آیا جو لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے جالب کی پچاسویں سالگرہ پر اُسے پیش کرنے کے لیے لکھی اور شائع کی تھی۔ اُس میں جالب کو اُس کی کارکردگی پر خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ اس کے لیے سوال تھا کہ کوئی اس خراج تحسین کا کسی مغربی زبان میں خلاصہ تیار کرے۔ چنانچہ اس پتھر کو بھی چوم ہی کر چھوڑنا پڑا۔

تب کراچی پریس کلب کی اُس تقریب کا خیال آیا جس میں حبیب جالب کو لائف ممبرشپ دی گئی تھی ...... اِس موقعہ پر سبطِ حسن صاحب نے قدیم یونان کے ادیب سوفوکلیز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ حبیب جالب جیسا شاعر تھا۔ اُس نے بہت پہلے یہ بتا دیا تھا کہ اگر ریاست کے قانون اور فرد کے ضمیر میں تصادم ہو جائے تو انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے اُنھوں نے سوفوکلیز کے ڈرامے "اینٹی گونی" کی مختصر کہانی بھی سنائی۔ جس کے مطابق بھائی کی لاش بے گور و کفن رکھی ہے اور اس کی تجہیز و تکفین کرنے والے کے لیے موت کی سزا ہے۔ بہن مرنے کی پروا کیے بغیر اپنے بھائی کو دفناتی ہے اور ماری جاتی ہے۔ سبطِ صاحب کے مطابق سوفوکلیز نے یہ نتیجہ نکالا کہ

جب بھی ضمیر اور ریاست میں تصادم ہو تو انسان کو اپنے ضمیر سے وفاداری نبھانی چاہیئے۔

اس گفتگو میں سبطِ حسن صاحب نے بتایا کہ مملکت اور وطن دو الگ چیزیں، دو الگ حقیقتیں ہیں مملکت تو انسان کی بنائی ہوئی ایک مصنوعی چیز ہے جب کہ وطن ایک قدرتی جذبہ ہے۔ وہ ماں کا پیار ہے۔ اُس سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے؟ حبیب جالب اس فرق کی زندہ مثال ہیں۔ اُنہوں نے اس فرق کو محسوس کر لیا ہے کہ مملکت اور وطن میں فرق کیا ہے۔ اُن کی شاعری وطن اور اہلِ وطن کی محبت سے بھری ہوئی ہے۔ اسی لئے بگھیا لہو لہان ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وطن کو مانتا ہوں لیکن تجو بھی قانون تم بناؤ، دستور بناؤ اور حکم دو ـــــ اُس کو بھی میں آنکھیں بند کر کے مان لوں ـــــ یہ ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے حبیب جالب پیارے مادرِ وطن کی محبت کی علامت ہیں اور ان کا کلام، اُن کی زندگی ایک سکون پرور سعادت مندی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کر کے اپنی مادرِ وطن سے محبت کا اعلان کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو کا خلاصہ سُن کر انیتا نے خوشی خوشی خط لکھ دیا۔ اسلام آباد میں نارویجن سفارت خانے نے ویزہ جاری کر دیا۔ جالب کی سیٹ بک ہوگئی۔ مقررہ تاریخ کو اسلام آباد ایئرپورٹ سے جہاز پر سوار ہونے کے لئے ڈیپارچر لاؤنج سے دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز پر سوار ہونے کے لئے نکلے۔ جالب ابھی جہاز کی سیڑھیوں تک نہیں پہونچے تھے کہ حکومت کے کارندوں نے اُن کو بیرونِ ملک کے سفر سے منع کر دیا اور ان کا پاسپورٹ بحقِ سرکار ضبط کر لیا۔

اب اوسلو میں دوستوں کے فرائض دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ تھا پاکستان میں جالب کے حقوق کے لئے مشترکہ دوستوں سے رابطہ قائم کرنا اور دوسرا حصہ تھا سکنڈے نیویا میں اہلِ قلم کو متحرک کرنے کی کوشش ـــــ یہی وہ زمانہ تھا جب انیتا کو جالب کی شاعری اور زندگی کے ساتھ تفصیلی تعارف کی خواہش پیدا ہوئی۔ ناروے میں پاکستان اور پاکستانیوں کے مثبت تعارف کے لئے متحرک دوستوں نے خوشی خوشی یہ ذمہ داری نبھائی۔

تب انیتا نے بتایا کہ جالب کی کہانی اُسے ناروے اور سویڈن کی دیو مالا کی یاد دلاتی ہے۔ جس میں جراُت اور صاف گوئی کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس میں گرمی اور روشنی کے دیوتا خیر کی علامت ہیں۔ شدید سردی اور تاریکی کے عفریت، دیوتاؤں کے دشمن ہیں۔ سب سے بڑا دیوتا اُودین ہے جو دھنک کے پُل کے پار رہتا ہے۔ اُس کے کندھوں پر دو پرندے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک خیال اور دوسرا حافظہ۔ وہ دن میں ایک مرتبہ ساری دنیا کا چکر لگاتے ہیں اور اودین کو دنیا بھر کے حالات سے باخبر کرتے ہیں۔ اُودین منتخب سورماؤں کے لئے ضیافتوں کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔

یہ وہ بہادر ہیں جو میدان جنگ میں بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ ان کو کنواریوں نے دھنک کا پُل پار کر کے وہاں پہونچایا تھا۔ یہ سورمے لڑتے ہیں اور مرتے ہیں لیکن ان کے زخم معجزانہ طور پر مندمل ہو جاتے ہیں۔ تو یہ زندہ ہو کر پھر لڑتے ہیں۔ دیومالا کے مطابق ایک وقت ایسا بھی آئیگا جب سورج دھندھ ہو جائے گا۔ زمین سمندر میں ڈوب جائے گی۔ ستارے اور آسمان ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ پھر خداوند خدا نیا آسمان اور نئی زمین بنائے گا جو سمندر سے نمودار ہوگی۔ دنیا نیکی سے بھر جائے گی۔ کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی ہوگی اور ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو جائے گا۔

اسی دوران خبر آئی کہ عابد حسن منٹو نے جالب کے پاسپورٹ کے لئے قانونی چارہ جوئی شروع کر دی ہے۔ پھر پتہ چلا کہ پاسپورٹ مل گیا ہے۔ تب جالب یورپ آن پہونچا۔ ہیتھرو ایر پورٹ نے اُس کا استقبال کیا۔ اب اُس نے پردیس میں بیٹھے اہلِ وطن کی محبت میں ملاقات کے لئے ترتیب دی گئی شاموں میں پہونچنا شروع کیا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۵ء کی شام یورپ کا ایسا پہلا اجتماع اوسلو میں تھا۔ پتّے کے اپریشن کے بعد اُس کے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ وہ قدیم داستانوں کے سورما کی طرح جرأت اور صاف گوئی کے ہتھیار لئے پھر میدان زار میں دیوزاد عفریت کو للکار رہا تھا۔

انیتا اُسے ناروے کے آزاد خیال روز نامے "داگ بلاد" کے دفتر لے گئی۔ اگلے روز پورے صفحے کا انٹرویو تھا۔ جالب کے کلوز اپ کے ساتھ۔ صحافی نے سرخی لگائی تھی: "وہ جو لکھے سب بین"۔

"بین الاقوامی اداروں نے ابھی تک جالب کو پہچانا نہیں؟" ایک روز انیتا نے پوچھا۔

"صرف ایمنسٹی انٹرنیشنل نے۔ انہوں نے اسے فوجی آمریت کی قید کے دوران ضمیر کا قیدی قرار دیا تھا۔" ایک دوست نے بتایا۔

پھر سنا کہ جالب یورپ سے واپس پاکستان چلا گیا ہے۔ وہ سالہا سال تک میدانِ جنگ میں ایک دیومالائی کردار کی بہادری کے ساتھ لڑتا رہا۔ اُس کو کئی زخم آئے۔ وہ مندمل ہو گئے تو وہ قدیم سورماؤں کی طرح پھر دیوزاد عفریتوں کے ساتھ نبرد آزما ہو جاتا جو شر کے مظاہر تھے۔ صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ اُس کے پاس نظریے اور حافظ کے دو کبوتر تھے جو دنیا بھر کی صورت حال سے اُسے ہر لحہ باخبر رکھتے تھے۔

اب تازہ ترین خبر یہ ہے کہ مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ء کو حبیب جالب دھنک کا پل پار کر گیا ہے۔ انیتا کو یقین ہے کہ اُودین ایک بہت بڑی ضیافت کا بندوبست کرے گا جس میں حبیب جالب کے ساتھ کل عالم کے دوسرے اُس جیسے سورما بھی مدعو ہوں گے۔

اوسلو میں بہت سے دوست انیتا کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ انیتا کی بات سچ ہو نہ ہو جالب کے کبوتر اُن کے پاس آتے رہیں گے۔

سلیمان اطہر جاوید
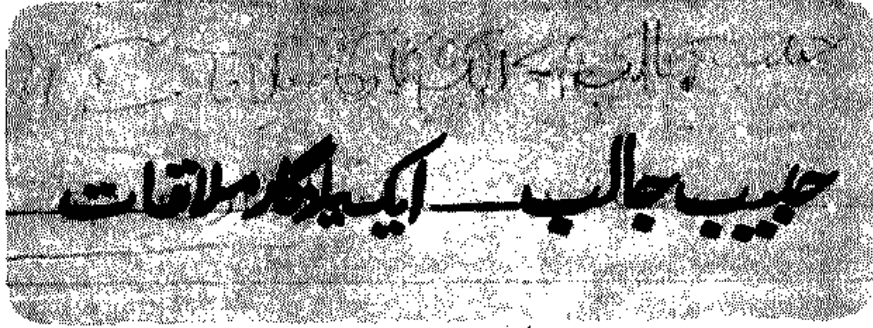
وہ بھی عجیب ملاقات تھی ——— ۱۰ تا ۱۲ فروری ۱۹۸۹ء کو دہلی میں دوسری عالمی اُردو کانفرنس تھی۔ سمینار میں، میں بھی مدعو تھا۔ ۹ فروری کو دہلی پہونچا۔ راؤز ایونیو ——— عالمی اُردو کانفرنس کے دفتر میں، منتظمین، سربرآوردہ شخصیات اور بعض مدعوئین موجود۔ کانفرنس کا انتظام کچھ اتنا باضابطہ، منقح اور مسجع کہ بہت کم کانفرنسوں وغیرہ میں ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔ مدعوئین کے قیام کا انتظام ہوٹل جن پتھ اور ہوٹل رنجیت میں ——— مدعوئین کے ناموں اور ہوٹلوں میں اُن کے لئے مختص کردہ کمروں کے نمبروں کی فہرست لئے منتظمین موجود۔ دو ایک منٹ میں بتادیا گیا کہ میرا قیام ہوٹل جن پتھ کے کمرہ نمبر ۴۳۵ میں ہوگا۔ اور چند منٹ میں ہوٹل جن پتھ ——— استقبالیہ پر رسمی اندراجات کے بعد میں اپنے کمرے میں۔ یہ ڈبل روم تھا ———

چائے پی اور کچھ ستانے کے لئے لیٹا ہی تھا کہ کمرہ کی گھنٹی بجی، دروازہ کھولا۔ روم بوائے کے ہمراہ ایک صاحب، وجیہہ شخصیت، اونچا قد، تن و توش معقول، ایک جہاں کے خوب و خراب کو دیکھی ہوئی آنکھیں، قدرے گندمی مائل رنگ، تیکھے نقوش، چہرے، بالوں اور لباس، غرض ہر طرح آزادہ و خود بیں، طرح دار، آشفتہ مزاج! ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندوستان سے دُور، گویا اِس معاشرہ میں رہتے ہوئے اِس معاشرہ سے دُور، بے زار نہیں بے نیاز۔ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ میں حبیب جالب سے مل رہا تھا۔ یہ نام میرے لئے نیا نہیں تھا۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ میں بھی اُن کے لئے ایسا نیا نہیں۔ وہ صابر دت کے "فن اور شخصیت" کے فیض احمد فیض اور قتیل شفائی نمبروں میں خاص طور پر مجھے پڑھ چکے تھے۔ اُن کے کئی اشعار میرے نوکِ زباں تھے۔

چند ایک اشعار تو اُسی وقت یاد آگئے ؎

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا | تو جینا کس قدر آسان ہوتا
مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے | میں ہر گرما میں انگلستان ہوتا
مری انگلش بلا کی چست ہوتی | بلا سے میں جو اُردو دان ہوتا
زمینیں مری ہر صوبہ میں ہوتیں | میں واللہ صدرِ پاکستان ہوتا

میں نے عرصہ قبل جب یہ اشعار پڑھے تھے اور اپنے کسی مضمون میں اُن کا حوالہ دیا تھا تو سوچا تھا۔ یہ شاعر کیسا ہوگا جس نے اس جرأت کے ساتھ اور اس دو ٹوک انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے، طنز کتنا کاری تھا، ضرب کتنی شدید تھی۔ مجھے ایسی توقع نہیں تھی کہ کبھی حبیب جالب سے مل سکوں گا اور اب جو ملنے کا موقع ہوا تو ایسا کہ ایک ہی کمرے میں اُن کے ساتھ رہا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں میں رسمی انداز رہا اور پھر وہ ایسے ملے جیسے کوئی اپنے چھوٹوں سے ملتا ہے اور میں نے بھی اپنے کسی بزرگ کی طرح اُن کا احترام کیا۔ پاکستان سے روانگی سے قبل ہی حبیب جالب کی طبیعت خراب تھی ــــــ وہ نہ آتے، لیکن دہلی کی یاد، جس سے اُن کے کئی اشعار مہکتے اور آباد ہیں۔ اور دہلی کے دوستوں کی یاد اُنہیں یہاں کھینچ لائی۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ اِس سے پہلے کبھی اُنہیں ہندوستان آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور اب جو اجازت ملی تو اُنہوں نے غنیمت جانا ــــــ سفر خواہ طیارہ کا ہو اور خواہ کتنا ہی مختصر، بہر حال سفر ہوتا ہے اور پھر ایسے شخص کے لئے جس کی طبیعت ناساز ہو۔ جالب صاحب کی خراب طبیعت کچھ اور خراب ہو گئی۔ اُنہوں نے سوٹ کیس سے دوائیاں نکالیں، مجھ سے پانی لانے کے لئے کہا۔ وہ وقفہ وقفہ سے دوائیاں استعمال کرتے رہے۔ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ میں اُن کی مدد کرتا، سنبھالتا۔ باتھ روم جانے کے لئے اُنہیں سہارا دیتا۔ اُنہیں اس کا احساس تھا۔ میں جو اُن کے لئے ایک "اجنبی" تھا اُن سے "اپنوں" کی طرح پیش آرہا تھا۔ وہ تکلف کرنا چاہتے تھے لیکن اُن کی حالت ایسی نہیں تھی۔ میں ممکنہ حد تک اُٹھنے بیٹھنے، دوا کے استعمال میں اور ہر طرح اُن کی اعانت کرتا۔ وہ سراپا ممنون ہوتے اور دعائیں دیتے۔ شام ہوتے ہوتے اُن کی طبیعت کچھ اور خراب ہو گئی۔ اُنہوں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کہا۔ اسی دوران قتیل شفائی صاحب پاکستان سے اور اسد مفتی ہالینڈ سے عالمی اُردو کانفرنس میں شرکت کرنے آچکے تھے۔ اُن دونوں سے جالب صاحب کے نہایت گہرے مراسم۔ اسد مفتی تو جالب صاحب کے عقیدت مندوں میں نکلے۔ جالب صاحب کے کہنے پر میں نے اُن دونوں کو جالب صاحب کی ناسازیٔ مزاج کی اطلاع دے دی۔ وہ دونوں آئے اور چند احباب بھی۔ اتنے میں ڈاکٹر بھی آگیا۔ اُس نے دوائیاں لکھیں۔ میں نے لاکھ اصرار کیا کہ دوائیاں لے آتا ہوں۔ وہ ہندوستان

میں مہمان ہیں اور میزبانی کے فرائض مجھے انجام دینے چاہئیں لیکن اسد مفتی نہیں مانے وہ گئے اور دوائیاں لے آئے۔ بعد میں وہ اور قتیل شفائی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ رات بھر جالب صاحب بے چین سے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے قدرے افاقہ ہوا۔ اب وہ شعر و ادب کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اُردو شاعری۔ مروّجہ رجحانات، نئے میلانات، کچھ توقعات، کچھ نا اُمیدیاں۔ معاشرتی اور سیاسی حالات ـــــــ اُنہیں صرف پاکستانی عوام سے اور وہاں کی آمریت سے شکایات نہیں تھیں۔ اُنہیں دنیا کے خواہ کسی بھی علاقے کے ہوں مظلوم اور مقہور عوام سے ہمدردی تھی۔ اُنہیں جابر، آمر اور ظالم حکمرانوں سے ہمدردی نہ تھی خواہ وہ دنیا کے کسی علاقے کے ہوں اور خواہ کسی عنوان سے حکومت کرتے ہوں۔ اُنہوں نے کبھی کسی ملک کا نام لے کر یا کسی تخصیص کے ساتھ گفتگو نہیں کی۔ وہ مجموعی طور پر انسان کے دُکھ دَرد اور انسانیت کی صلاح و فلاح کی بات کرتے۔ اُنہیں امریکی اور برطانوی سامراج سے نفرت تھی لیکن امریکی اور برطانوی عوام کے بارے میں اُنہوں نے بُرا نہیں کہا۔ وہ سمجھتے تھے یہ حکمران ہیں جو اپنے ذاتی اور خاندانی مفادات کے لئے عوام کے حق میں قہر و غضب بنے ہوئے ہیں۔ ریگن اور برطانوی حکمرانوں ہی کے بارے میں اُنہوں نے برملا اور نام لے کر نہیں کہا بلکہ ایوب خان کے بارے میں بھی اُنہوں نے کسی رو رعایت کے بغیر قلم اُٹھایا۔ ایوب خان کے دَور میں حبیب جالب کی شاعری کی بڑی دھوم تھی۔ اُنہوں نے اپنے کئی اشعار میں ایوب خان کا نام لے کر اظہارِ خیالات کیا ہے۔ اور ایسے میں ان کی نظم "بیس گھرانے" غیر معمولی معنویت کی حامل ہو جاتی ہے جس کو ایک زمانے میں شہرت بھی حاصل رہی ـــــــ حبیب جالب کی شاعری ہے بھی احتجاج اور بغاوت کے عناصر سے بھرپور۔ ایسے موضوعات پر گفتگو کرتے وقت اُن کا لہجہ اور اُن کی شخصیت بھی احتجاج اور بغاوت کی تفسیر اور تعبیر ہو جاتے ہیں۔ وہ گفتگو کر رہے تھے۔ اپنی علالت کے سبب اُنہیں دھیمے لہجے ہی میں بات کرنی چاہیئے تھی لیکن یہ اُن سے کہاں ممکن تھا۔ وہ تو کہہ چکے ہیں ؎

اور سب بھول گئے حرفِ صداقت لکھنا	رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا
لاکھ کہتے رہے ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا	ہم نے سیکھا نہیں پیارے بہ اجازت لکھنا
اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کیا ہوگی	پڑھ کے ناخوش ہیں مرا صاحبِ ثروت لکھنا

اُردو میں احتجاجی شاعری ابتدا سے رہی ہے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مسائل، معاملات اور اقدار کے خلاف احتجاج ہمارے شاعروں کے خمیر میں رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسی شاعری مبہم اور اشاریتی نہیں ہو سکتی۔ احتجاج واضح اور برملا ہونا چاہیئے اور ایسا جو فوراً سمجھ میں آجائے۔ اُردو

کی احتجاجی شاعری میں حبیب جالب کی شاعری کو نمایاں اور امتیازی مقام حاصل رہے گا کیونکہ اُنھوں نے جو بات بھی کہی برملا کہی ہے ؎

ہم کبھی نہ چھوڑیں گے بات برملا کہنا ہاں نہیں شعار اپنا دَرد کو دوا کہنا

یا

مجھ سے خفیف ہیں مرے ہمعصر اس لئے میں داستانِ عہدِ ستم کھل کے کہہ گیا

قطع نظر اس کے اُن کے شعری مجموعوں کے عنوانات "سرِ مقتل"، "عہدِ ستم"، "ذکر بہتے خون کا" اور "گوشے میں قفس کے" وغیرہ اُن کے احتجاجی مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔

حبیب جالب نے قید و بند کی صعوبتیں سہیں، حکمرانوں کو للکارا، اُن کو چیلنج کیا، اُن کو اُن کے انجام سے باخبر کیا۔ اُس کی پروا کئے بغیر کہ خود اُن کا انجام کیا ہوگا؟ حبیب جالب سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے جو اُن کے اشعار یاد آئے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا ؎

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

ایسا بانکا اور طرح دار شاعر جس نے عوامی جذبات و احساسات، مظلوموں اور بے کسوں کی دلی کیفیات کی اپنے قلم سے مصوری کی، قطعی ایک جُداگانہ ماحول میں گفتگو کر رہا تھا۔ اِس دوران قتیل شفائی اور دیگر اصحاب بھی آتے رہتے۔ عالمی اُردو کانفرنس کے اجلاس جاری تھے۔ مجھے شرکت کرنی تھی۔ حبیب جالب صاحب نے کہا کہ وہ تو اب مشاعرے میں شرکت کریں گے میں اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اُنہیں تنہا چھوڑوں لیکن منتظمین کے تعاون سے دوا اور اُن کے کھانے کا انتظام کر کے روانہ ہوا۔ عالمی اُردو کانفرنس کے منتظمین کا رویہ نہایت پُرخلوص اور ہمدردانہ تھا۔

میں صبح کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد واپس ہوا۔ حبیب جالب صاحب قدرے بہتر تھے ——— اتنے میں وہ اُٹھے اپنے سوٹ کیس سے کتابوں کا پیکٹ نکالا جس میں اُن کے کلیات "حرفِ سرِ دار" کی چند کاپیاں تھیں۔ ایک کاپی نکالی اور اُس کے سرِ ورق کے بعد کے کسی صفحہ پر لکھا: "مخلص دوست سلیمان اطہر جاوید کی نذر۔ حبیب جالب، ۱۰ فروری ۱۹۸۹ء" ——— میرے جذبات عجیب تھے۔ اُن سے ملاقات ہوئے ابھی ۲۴ گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے لئے ایسا کیا کیا تھا۔ لیکن اُنہوں نے اِس قدر محسوس کیا۔ یہ دراصل اُن کا خلوص، عنایت اور شفقت تھی۔ میں نے شکریہ کے ساتھ "حرفِ سرِ دار" کی یہ کاپی قبول کی۔ قبل ازیں حبیب جالب کے بس ایک دو شعری مجموعے نظر سے گزرے تھے اور بعض جرائد میں اُن کا کلام دیکھا تھا لیکن اب جو اُن کا کلیات ملا تو پتا چلا کہ اُن کے تاحال کئی

شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "برگِ آوارہ" "سرِ مقتل" "عہدِ ستم" "ذکر بہتے خون کا" "گوشے میں قفس کے" اور "گنبدِ بے در"۔۔۔۔۔ "سرِ مقتل" "ذکر بہتے خون کا" اور "گنبدِ بے در" تو اُن کے وہ مجموعے تھے جن کو حکومتِ پاکستان نے ضبط کر لیا تھا۔ "حرفِ سرِ دار" اُن سارے مجموعوں پر مشتمل ہے۔ اتنے میں اُنہوں نے بتایا کہ میرے جانے کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے کچھ طلبہ آئے تھے اور اُنہیں مدعو کر کے گئے ہیں۔ دعوت نامہ تحریری بھی تھا۔ مجھے بتایا۔ وہ بڑے مسرور تھے۔۔۔۔۔ ہندوستان اور پاکستان کے اپنے احباب کے بارے میں بے اختیارانہ انداز میں ٹوٹ ٹوٹ کر گفتگو کرتے رہے۔ علی سردار جعفری، سبطِ حسن، محمد حسن، مخدوم اور نہ جانے کن کن کے بارے میں۔ لیکن سب کے بارے میں اُن کا انداز اپنائیت کا تھا۔ تقسیمِ ہند اور ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کے بارے میں اہلِ سیاست جانیں لیکن حبیب جالب تہذیبی اور ادبی طور پر اُس کو بہت بڑا زیاں تصور کرتے تھے بلکہ اُنہوں نے جب بھی گفتگو کی نہ پاکستان کو اپنا سمجھا اور نہ ہندوستان کو غیر۔ بلکہ یہ دونوں ممالک اُن کے اپنے تھے۔ اُن کی تو ایک نظم کا مصرعہ ہی ہے ؎

ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

اُن کو اپنے احباب کے چھوٹنے کا غم تھا، ایک تہذیب کے لٹنے کا غم تھا۔

۱۱ فروری کو صبح کے اجلاس میں میرا مقالہ تھا اور شام میں موسیقی کا پروگرام۔۔۔۔۔ حبیب جالب نے زیادہ وقت ہوٹل کے کمرہ ہی میں گزارا۔ دیگر ممالک سے آئے احباب اور اُن کے پرستار ملاقات اور مزاج پرسی کو آتے رہے۔ میں نے بھی عالمی اُردو کانفرنس کے اجلاسوں کے علاوہ زیادہ وقت کمرہ ہی پر گزارا۔ کئی احباب سے یوں ملاقات ہو گئی۔ ۱۲ فروری کو صبح فلسطین کے بارے میں اجلاس تھا اور شام میں مشاعرہ۔۔۔۔۔ نہ جانے کیا ہوا حبیب جالب کی طبیعت پھر کچھ قابو میں نہ رہی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا اور دوسرے بھی کہ وہ مشاعرہ میں شرکت نہ کریں۔ میں نے دبی زبان سے کہہ بھی دیا لیکن وہ مشاعرہ پڑھنے پر مصر تھے بلکہ مشاعرہ میں سنانے کے لئے بعض اشعار گنگنانے بھی لگے۔ یہ طے پایا کہ ہم لوگ تو وقت پر چلے جائیں گے اور جب مشاعرہ شروع ہوگا اور حبیب جالب صاحب کی باری آئے گی تو اُنہیں بلا لیا جائے گا۔ اور وہ مشاعرہ پڑھتے ہی واپس ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اپنی باری پہ وہ مشاعرہ گاہ (پرگتی میدان) آئے۔ اُن کا نام پکارا گیا وہ شعر سنانے کے لئے اُٹھے۔ اُس شام جنہوں نے حبیب جالب کو سنا ہوگا اُنہیں شاید اندازہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ اُن کی طبیعت خراب ہے۔ اُن کے الفاظ کی کاٹ، آواز کی کھنک، لہجے کا اُتار چڑھاؤ، اشعار میں وہی ترشی اور تلخی۔۔۔۔ اُن کے پڑھنے کا انداز آج بھی میری آنکھوں میں ہے۔ اُنہوں نے دو تین چیزیں سنائیں اور وہ مشاعرے پر چھا جانے والے

شاعروں میں رہے۔ مشاعرہ پڑھنے کے بعد اُن کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ انہوں نے غیر معمولی بار لیا جو نہیں لیا جانا چاہیئے تھا اُن کی صحت یہ برداشت نہیں کر سکی۔ منتظمین فوراً انہیں دواخانہ لے لئے۔ میں متردد اور کوشش تھا لیکن کیا کرتا۔ اُن کے ساتھ بس، ایک آدھ کوئی گیا تھا۔ مشاعرہ

کے خاتمے پر کھانے سے فارغ ہو کر رات دیر گئے جب میں ہوٹل پہونچا کمرہ مقفل پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دواخانہ میں داخل کردیئے گئے ہیں۔ اُس وقت دواخانہ جانے کی صورت نہ تھی میں نے سوچا تھا کہ صبح دواخانہ ہو آؤں گا لیکن یہ بھی نہ ہوسکا۔ مجھے صبح ۹ بجے کی ٹرین سے واپس ہونا تھا۔ کانفرنس ختم ہو چکی تھی، شرکاء واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مجھے بھی جلدی تھی۔ منتظمین سے ربط پیدا کیا لیکن وہ کیا کرتے وہ بھی مجبور تھے۔ میں نے حبیب جالب صاحب کے سامان کے بارے میں قتیل شفائی صاحب سے کہہ دیا اور کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس طرح اُس وقت ہوٹل جن پتھ (دہلی) سے لوٹا، اُن سے واپسی میں ملاقات نہ کرنے کا افسوس رہا، آج بھی ہے۔ ہاں اُس کے بعد کسی بھی سمینار وغیرہ میں دہلی میں قتیل شفائی صاحب سے ملاقات ہوئی، حبیب جالب کا بھی ذکر آیا۔ اور آج جب اُن کے تعزیتی اجلاس کے بارے میں پڑھا تو آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں نے تو انہیں بیمار دیکھا تھا لگا اسی بیماری نے آخر اُن کا کام تمام کیا ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۞ میرے اُن سے کچھ ایسے مراسم نہیں تھے۔ میں نے کچھ ایسی ملاقاتیں بھی نہیں کی تھیں۔ خط وکتابت بھی نہیں رہی۔ بس یہی دو تین روز کی ملاقاتیں جو آج بھی تابندہ ہیں اور میرے وجود میں ہمیشہ تابندہ رہیں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ حبیب جالب نے جو سوچا، وہ کیا اور وہی لکھا۔ اُس کو اپنا فن ہی نہیں اپنی زندگی بھی بنا لیا۔ ایسے لوگ کہاں ہیں ہے

(ہماری زبان نئی دہلی ۸ رجون ۱۹۹۳ء)

فہیم انصاری

فیض صاحب کا ایک شعر ہے۔

رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے　　تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

جب میں اس شعر کی روشنی میں حبیب جالب کی زندگی کو دیکھتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ جالب نے پوری زندگی ہجر کی فراغت کے ساتھ بڑے اطمینان، اہتمام اور تیقن کے ساتھ گزاری اور ان کی استواری عہد کا جو عالم تھا وہ برصغیر میں کم شعراء کی زندگی میں آیا ہے جالب کی شاعری پر ابھی تحقیق ہونا باقی ہے کیوں کہ اب تک ان کی شاعری کے بارے میں الزامات تو بہت لگائے گئے لیکن سنجیدگی سے ان پر تحقیق نہیں کی گئی۔ جالب کی شاعری کو صحافتی شاعری، حادثاتی شاعری وغیرہ کہا گیا ہے لیکن واقعتاً صورت حال اس سے بہت مختلف ہے۔

یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا　　جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

یا پھر

کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں　　عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

درج بالا دو اشعار کو دیکھا جائے تو انہیں کسی بھی طور صحافتی اور حادثاتی شاعری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ذرا آخر الذکر شعر کے مصرعہ ثانی پر غور کریں "عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں" جالب پر صحافتی شاعری کا الزام لگانے والے بڑے بڑے جید شعراء کو بھی اس بلندی تک پہونچنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ دراصل ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر ذہنی ورزش کرنے والے دانشوروں کی جالب تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ جالب خود بند کمروں میں منعقد ہونیوالی نشستوں کا شاعر

نہیں تھا۔ میرے نزدیک کسی بھی ادب کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو اپنے آپ کو اس عہد اور ان مخصوص حالات میں لے جانا ازحد ضروری ہے جس میں وہ ادب تخلیق کیا گیا۔ بدقسمتی سے جالب کا مطالعہ کرتے وقت ان حالات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن میں اس کی شاعری کے نازک پودے نے تناور درخت کا روپ اختیار کیا جالب کے بارے میں اس رویہ کا شکار محض اس کے مخالفین ہی نہیں وہ لوگ بھی ہوئے ہیں جو اس کے نظریاتی دوست ہیں۔ مخالفین کی بات کا ذکر تو اس لئے ضروری نہیں کہ جو بات ذہن کو بند کر کے کہی جائے اس پر توجہ دینی ہی نہیں چاہیئے۔ تاہم جالب کے دوستوں کے اس رویہ کی وجہ جالب کی سیاست تھی جالب نے سیاسی طور پر اپنے آپ کو نیپ کے جس دھڑے سے وابستہ رکھا۔ بائیں بازو کے فعال اور موثر کارکنوں کے کئی بڑے گروپس نے اس سے اپنے آپ کو نیپ میں ہوتے ہوئے بھی الگ رکھا یوں سیاسی سطح پر جالب بائیں بازو کے ان بڑے اور موثر گروپوں کے ساتھ کام نہ کر سکے ان کے برعکس ان کی شاعری اول تا آخر ان نظریات کی حمایت کرتی رہی۔ اور ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے وقت ان کی سیاسی اور ادبی زندگی کے اس فرق کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جالب بائیں بازو کے کسی موثر گروپ کے ساتھ کام نہ کر سکے اور ایک مرتبہ یہ تنگ ہو کر انہوں نے تنگ آ کر تن تنہا اپنی جماعت بنا ڈالی لیکن اس کے باوجود جالب نے کسی بھی مرحلہ پر بال برابر بھی اپنا وزن مخالفین کے پلڑے میں نہیں ڈالا۔

جالب کی شاعری احتجاجی رجائیت کی شاعری ہے یہ ہرگز وہ رجائیت نہیں جس کا تذکرہ پروفیسر احتشام حسین نے اُردو کے ایک جید شاعر کی رجائیت کے بارے میں کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ان شاعر کے کلام میں رجائیت میرے نزدیک ایسی ہی ہے جیسے بیچ دریا میں ڈوبتے ہوئے شخص کو کوئی کنارے پر کھڑا ہو کر ڈوبنے سے بچنے کی تراکیب بتائے۔ احتجاجی رجائیت معاشرے کے لئے کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ معاشرے میں موجود احتجاج کی مختلف اشکال سے کیا جا سکتا ہے احتجاجاً ایک تعلیم یافتہ' بے روزگار نوجوان بندوق اٹھا لیتا ہے تو پھر پولیس مقابلے کا شکار ہونے والے ڈاکو کی لاش کی شکل میں سامنے آتا ہے اگر ہم احتجاج سے رجائیت کو نکال دیں تو محض انارکی ہی رہ جاتی ہے اب اس روشنی میں ہم جالب کی شاعری کو دیکھیں تو وہ ہمیں ایک بلند مرتبہ پر نظر آتا ہے ایک ایسا شاعر جو سکہ بند شاعروں کے ہجوم سے الگ تھلگ معاشرے کی خدمت کا فریضہ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے جالب احتجاجی رجائیت کا شاعر ہے درج ذیل اشعار دیکھیے:

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم　　　جبر بزیر نقاب دیکھیے کب تک رہے

حسرت آزاد پر جور غلامانِ وقت | از رہ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

حسرت موہانی

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا | کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

فراق

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے | تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد | فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیض

یہ لوہے کی سلاخیں کب تلک روکیں گی ملنے سے | یہ دیواریں رہیں گی تیرے میرے درمیاں کب تک

تجھے مجھ تک نہ آنے دے گا پھاٹک قید خانے کا | مجھے تجھ تک نہ جانے دیں گے آخر پاسباں کب تک

علی سردار جعفری

جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک | کب تک آئین کی محتاط مذمت ہوگی

ایک اک نام پہ کہرام مچے گا کب تک | کب تک اس طرح بالاقساط بغاوت ہوگی

کیفی اعظمی

ان اشعار کے بعد جالب کی نظم "میری بچی میں آؤں نہ آؤں۔ آنے والا زمانہ ہے تیرا" کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

درد کی رات ہے کوئی دم کی
ٹوٹ جائے گی زنجیر غم کی
مسکرائے گی ہر آس تیری
لے کے آئے گا خوشیاں سویرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

یہ نظم جالب نے درِ زنداں کو لبیک کہتے ہوئے لکھی اور ایک یہی نہیں جالب کی پوری کی پوری شاعری دراصل بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے جو انسان کو ایک بہتر دنیا کی تشکیل پر آمادہ اور مجبور کرتا ہے اس مختصر مضمون میں جالب کے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ممکن نہیں لہٰذا اس بات کو یہیں چھوڑ کر میں بعض ایسی باتوں کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہوں گا جو جالب کی رحلت کے بعد سامنے آئی ہیں جالب کی یاد میں منعقدہ تعزیتی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ہمارے ایک دوست نے جالب کو ایک انتہائی غیر جانبدار شاعر قرار دیا جالب کی شخصیت کے

ساتھ یہ بڑا ظلم ہے جالب ایک ایسا شخص ہے جس نے انتہائی جانبداری کے ساتھ ہر ظلم و زیادتی کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ ظالم کا ساتھ دینے والے اور ظلم پر خاموشی اختیار کرنے والوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا غالباً ہمارے دوست کہنا یہ چاہتے تھے کہ جالب نے ظلم کے خلاف لڑنے والوں میں کبھی امتیاز نہیں برتا۔ یہ بات صحیح ہے لیکن جالب نے ظلم کے خلاف لڑنے والوں کا ساتھ بھی ایک نظریہ کے تحت دیا لہٰذا وہ کسی بھی حمایت سے قبل یہ ضرور دیکھتے تھے کہ کہیں وہ رجعت پرستی کا آلہ کار تو نہیں بن رہے۔ مجھے جنرل ضیا کے گیارہ سالہ آمرانہ دور کے بعد کراچی کے ہاشو آڈیٹوریم میں جالب کے اعزاز میں منعقدہ ایک شام یاد آرہی ہے اس وقت ملک میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت تھی جالب نے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے پیپلز پارٹی سے متعلق ایک مزدور رہنما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم کتنے ہی اسٹیج کیوں نہ بنوالو جاگیرداروں کی قیادت سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا انہوں نے کہا کہ آج بھٹو صاحب کی بیٹی کی حکومت ہے تو بہت سے اس کے اور بھٹو صاحب کی حمایتی ہو گئے ہیں بھٹو صاحب میرے دوست تھے اور میں نے ایک چیز ان کے ساتھ جتنی پی ہے لوگوں نے اتنا پانی ان کے ساتھ نہیں پیا ہوگا تاہم جب انہوں نے مجھے پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی تو میں نے انکار کر دیا حالانکہ محمود علی قصوری جیسے لوگ ان کے ساتھ چلے گئے۔ لہٰذا کسی بھی طرح یہ کہنا کہ جالب غیر جانبدار تھے مناسب نہیں اور اس سے کنفیوژن ہی پھیلے گا۔ جالب کی جانبداری کا عالم تو یہ تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور میں نیشنل بک کونسل کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک لاکھ روپے کا انعام دیا گیا اور انہوں نے اس کے بعد وہ نظم لکھی جس کے ابتدائی بول تھے۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

انہوں نے نہ صرف یہ نظم لکھی بلکہ بہت لہک لہک کر وہ اسے پڑھتے بھی رہے جالب کے بارے میں ان کی رحلت کے بعد ملک کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کے ایک سکہ بند کالم نویس نے بظاہر خود کو جالب کا مداح ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۸۹ء کی دہلی کی عالمی اُردو کانفرنس کے مشاعرے میں جب حبیب جالب نے فرمائش پر یہ شعر پڑھا

وہ کہہ رہے ہیں کہ محبت نہیں وطن سے تجھے سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے

تو بقول مذکورہ کالم نویس کے کہ وہ بھڑک اٹھے اور انہوں نے جالب سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور جالب نے ان سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اسے دیارِ غیر میں نہیں پڑھیں گے خیر یہ جالب کا بڑا پن تھا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ اس واقعہ سے اپنے بارے میں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں ظاہر

ہے جب آپ اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر لوگوں کو اظہار کی آزادی نہیں دیں گے، سچ کہنے والوں کو زنداں کے حوالے کر دیں گے، تو بات یقینی طور پر سرحدوں سے باہر جائے گی پھر ملکی سرحدوں سے باہر اس سے قبل کیا کہا کچھ نہیں کہا گیا حیرت ہے کہ ان کی رگِ حب الوطنی جالب کے مذکورہ شعر پر ہی پھڑکی حالانکہ جس وقت جالب موچی دروازے میں یہ پڑھ رہا تھا۔

دیپ جس کے محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

اس وقت مذکورہ کالم نویس قصرِ صدارت میں آمرانہ آئین بنانے والوں کے شریک کار تھے اور ادیبوں اور شاعروں کو رائٹرز گلڈ کے شکنجے میں کس کر اقتدار پر قابض قوتوں کے سامنے پیش کرنے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے اور حبیب جالب پسِ زنداں یہ کہہ رہا تھا:

گھر کے زنداں سے اسے فرصت ملے تو آئے بھی جانفزا باتوں سے آ کے دل مرا بہلائے بھی
تک کے زنداں کی سلاخوں سے مجھے وہ دیکھ لے کوئی یہ پیغام میرا اس تلک پہنچائے بھی

تو وہ آمریت کے زیرِ سایہ ادیبوں کو گرفتار گلڈ بنانے کی خدمات کے عوض بیرونِ ملک دورے کا پروگرام بنا رہے ہوں گے یا صدر کینیڈی سے مصافحہ کی تصویر کی ڈرائنگ روم میں آنے والے افراد کے سامنے نمائش کر رہے ہوں گے اب جالب کا انتقال ہو گیا تو اس کے ہمدرد بن کر جلیسان جالب کو یہ بتا رہے ہیں کہ کس طرح انہوں نے جذبہ حب الوطنی سے مجبور ہو کر جالب کو اس کی ایک غلطی پر ٹوکا پتہ نہیں یہ کس قماش کے لوگ ہیں کہ جو جالب کو بڑا آدمی بھی کہتے ہیں لیکن اس کی گرفتاریوں اور اس کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے وقت ان کے لب سلے ہوتے ہیں اور پھر ایک دم سے کھڑے ہو جاتے ہیں جالب کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے لئے اپنے کالم میں انہوں نے ایک غلط بیانی اور کی کہ جالب کم سواد اہلِ قلم کی مصلحت آمیزی کی جانب توجہ دلا کر انہیں خفیف نہیں کرتے تھے حالانکہ جالب نے نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری میں انہیں لتاڑا بلکہ ایسے اشعار پڑھتے وقت وہ ان کے خلاف تبصرے بھی کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں سادات امروہہ کا ایک مشاعرہ ہے جو اس وقت کے وزیر دفاع میر علی احمد تالپور کی صدارت میں ہو رہا تھا اور جس میں انہوں نے علی احمد تالپور مرحوم کے اتنے ٹچکے لگائے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ بعد میں انہیں جو دل کا دورہ پڑا اس میں جالب کے ان ٹچکوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا خیر بات ہو رہی تھی ان کالم نویس کی

جن کی رگ حب الوطنی حبیب جالب کے شعر پر پھڑک اٹھی۔ حالانکہ یہ رگ کبھی ان کے اپنے اعمال پر نہیں پھڑکی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب لوگ یہ جانتے ہیں کہ جس شخص پر وہ لکھ رہے ہیں وہ ان کے بونے پن کے آگے قطب مینار کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر مصنوعی طریقہ پر خود کو اس سے بلند تر ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں اخبار کا پیٹ تو ان باتوں سے بھی بھر جاتا ہے جو اس کے علاوہ ہر ہفتہ شائع ہوتی ہیں ضروری ہے کہ آدمی جالب کو بھی نشانہ بنائے اور وہ بھی جالب کی طبعی موت کے بعد! وما علینا الا البلاغ

(ماہنامہ منشور کراچی مارچ ۱۹۹۳ء)
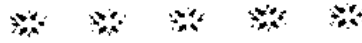
※ ※ ※ ※ ※

※ ※ ※ ※ ※
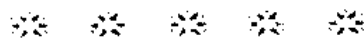
مجاہد بریلوی

عوامی شاعر حبیب جالب

میں ڈاکٹر اقبال سے جالب صاحب کے لندن میں علاج کے بارے میں پوچھتا ہوں ڈاکٹر اقبال جن کے چہرے پر مسلسل مسکراہٹ رہتی ہے بڑے دھیمے لہجے میں کہتے ہیں "جالب صاحب اس ملک کا بیش بہا سرمایہ ہیں کامیابی کی گو ایک فیصد امید ہے مگر جس بے بسی کی حالت میں وہ پچھلے چار ماہ سے ہیں اسی حالت میں انہیں مزید رکھنا بے رحمی ہے ہوٹل کے کمرے میں میرے سامنے ایک ریل چل رہی تھی۔

لاہور ہائیکورٹ میں یا تو جسٹس ایم آر کیانی کی آواز گونج رہی ہے یا پھر موچی گیٹ میں حبیب جالب آمریت کو للکار رہے ہیں۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

"دستور" نظم کیا تھی کہ اس نے اقتدار کے ایوانوں کو لرزہ بر اندام کر دیا۔

"ملک صاحب آپ یقین جانیں اب ہمارا آئین نہیں چلے گا نہیں چلے گا"

اس نظم کے بعد ہی جالب صاحب کی قید و بند کا سلسلہ شروع ہو گیا ایوب خان کے بعد جنرل یحییٰ خان آئے تو جالب صاحب نے انہیں بھی آتے ہی للکارا۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا　　اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

یحییٰ خان کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت آئی آمریت کے دَور میں جالب صاحب کا بھٹو صاحب سے بڑا ساتھ رہا تھا مگر کیونکہ جالب نیپ میں تھے اس لئے حیدر آباد سازشں کیس میں دھر لئے گئے اور تقریباً سال بھر جیل کاٹی

لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

پیپلز پارٹی کے دَور حکومت میں جالب صاحب کی ایک ایسی نظم تھی کہ جس نے بڑی شہرت پائی ...... پیپلز پارٹی کے بعد جنرل ضیاء الحق آئے ...... جالب صاحب گو اس دوران ملتان جیل یاترا کے سبب خاصے بیمار ہو چکے تھے مگر حق گوئی کی روایت کا تسلسل انہوں نے برقرار رکھا۔

ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

جنرل ضیاء الحق کے دَور میں اس نظم نے بھی بڑی شہرت پائی اس نظم کے سبب انہیں پنجاب کی بدترین جیل میانوالی میں چھ ماہ رہنا پڑا۔ مرحوم جنرل ضیاء الحق کے بعد لگتا تھا کہ جالب صاحب خاصے تھک چکے ہیں عمر اور بیماری دونوں ان پر حاوی ہو رہی تھیں مگر پیپلز پارٹی کے جیالے وزیروں نے جب مسلم لیگی وزیروں کے اطوار اپنانے شروع کئے تو جالب صاحب چپ نہ رہ سکے۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے　　دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض　　پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

میری آخری ملاقات ۱۲ فروری کو شیخ زید بن سلطان النہیان اسپتال کے کمرہ نمبر ۱۲ میں ہوئی بڑی افسردگی سے انہوں نے جملے توڑتے ہوئے کہا

"یار مارے گئے نا!"

جالب صاحب کی یہ بات سن کر میں خاموش ہو گیا کہتا بھی کیا ؟ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ اگر ذاتی حالات تبدیل کرنے کے فارمولے پر جالب صاحب عمل کرتے تو ان کے حالات کب کے درست ہو چکے ہوتے۔

جالب صاحب آپ کو تو مارا جانا ہی تھا

میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے
نہ جاں دے دو، نہ دل دے دو، بس اپنی ایک مل دے دو

جالب صاحب بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے آپ کو تو مارا جانا ہی تھا۔

(ماہنامہ منشور کراچی اپریل ۱۹۹۳ء)

کتاب	مصنف	قیمت
پرکرتی تتلی (ناول)	ہنس راج رہبر	۳۰/- روپے
یادوں کے کھنڈر (ناول)	نند کشور وکرم	۵۰/- روپے
انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول)	نند کشور وکرم	۸۰/- روپے
گیانی ذیل سنگھ	سریندر سنگھ جوہر / مترجم نند کشور وکرم	۱۲۰/- روپے
پرندے اب کیوں نہیں اڑتے	دیویندر اسر	۷۰/- روپے
خوشبو بن کے لوٹیں گے (ناولٹ)	دیویندر اسر	۵۰/- روپے
مستقبل کے روبرو (تنقید)	دیویندر اسر	۳۰/- روپے
کینوس کا صحرا (افسانے)	دیویندر اسر	۳۰/- روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۲ء	نند کشور وکرم	۳۰/- روپے
منتخب افسانے ۸۵-۱۹۸۴ء	نند کشور وکرم	۴۰/- روپے
منتخب افسانے ۸۷-۱۹۸۶ء	نند کشور وکرم	۴۰/- روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۸ء	نند کشور وکرم	۴۰/- روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۹ء	نند کشور وکرم	۴۴/- روپے
منتخب افسانے ۱۹۹۰ء	نند کشور وکرم	۵۰/- روپے
ہنس راج رہبر کے منتخب افسانے ـ ایک تعارف	نند کشور وکرم	۷۰/- روپے
اُردو ۱۹۸۳ء	نند کشور وکرم	۸۰/- روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۸۶ء	نند کشور وکرم	۸۰/- روپے
عالمی اُردو ادب ۸۸-۱۹۸۷ء	نند کشور وکرم	۸۰/- روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۸۹ء	نند کشور وکرم	۸۰/- روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۹۰ء	نند کشور وکرم	۱۰۰/- روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۹۱ء	نند کشور وکرم	۱۰۰/- روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۹۲ء	نند کشور وکرم	۱۵۰/، وپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۹۳ء	نند کشور وکرم	۱۵۰/- روپے

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے-۲ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

مشرف عالم ذوقی

اک بنجارہ عوامی شاعر

اس میں دو رائے نہیں کہ پاکستان میں ہندوستان کے مقابلے میں شاعری کا معیار بلند رہا ہے ۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے کہ پاکستانی شاعروں کا اپنا ڈھکا چھپا انداز رہا ہے ۔ اسے "یوں کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ایک خاص طرح کی سنسر شپ میں خود کو مجبور پاتے ہوئے علامتوں، استعاروں اور کنایوں میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی گئی ـــــ پاکستان کا فوجی نظام کچھ ایسا رہا کہ ادب بھی اس کا شکار ہوا لیکن جذبات اور احساس کبھی کسی کے بلند نہیں رہی درد و غم، ظلم، جبر و حشت انکا اثر ہمیشہ سے شاعری قبول کرتی رہی ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ پاکستان کے فوجی نظام حکومت کے خلاف شاعری نہیں کی گئی ۔ شاعری درد و غم کی کیفیت اور ظلم و بربریت کے احتجاج کے بطور احساس کے بطن سے جنم لیتی ہے ۔ تو یہ شاعری ہر دور میں ہر نظامِ حکومت میں جنم لیتی رہی مگر زبان پر لگی بندشوں کی وجہ سے بولنے والی زبان چپ تھی اور غم و غصہ کی جگہ استعارے اور کنائے نے لے لی ۔ فہمیدہ ریاض یا پروین شاکر کو جب حکومت کے خلاف بولنا ہوتا تھا یا خود پر لگی پابندیوں کے خلاف بولنے کی باری آتی تو جذبات و احساس بندشوں کے گھیرے میں اسے یوں کہتے، کہ میرے ملک میں پرندوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت نہیں ہے ۔ احمد فراز اس سے دو قدم آگے تاریخی حوالے سے قابیل کی سند لے کر آئے تو پاکستان نکالا پر مجبور ہوئے ۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں شاعری کیا پروان چڑھتی اور احتجاج اندر دبی چنگاریوں کو نکال کر تیز و تند موج کا روپ کیونکر لیتا ـــ

حبیب جالب مجھے شروع سے ہی اس لئے زیادہ پسند رہے ہیں کہ دوسروں کی طرح انہوں نے اندر سلگ رہی چنگاریوں کو احساس کے قید خانے میں گھٹنے پر مجبور نہیں کیا ـــ انہوں نے گھٹن اور جبر محسوس کیا تو ویسی ہی چیخ ان کے ہونٹوں سے بھی پھوٹی ۔ ویسے ہی خنجر کے تیز دھار جیسے لہولہان کر جانے والے لفظوں نے جنم

لیا اور ان کی شاعری کی وسیع وادیوں میں داخل ہوتی چلی گئیں ــــــــ اسلامی طرزِ حکومت کا سہارا لے کر ظلم و بربریت کی انتہا کر دینے والے فوجی نظام کو ان کے ذہن نے کبھی قبول نہیں کیا ــــــــ وہ کبھی فوجی ظلم سے گھبرائے نہیں، جیل جانے سے نہیں ڈرے اور ان سب کے باوجود ان کے منہ پر کبھی بندشوں کا قفل نہیں لگا۔ وہ جتنی بار اور جس جس موقع پر جیل گئے اور جیسی جیسی زیادتیاں برداشت کیں، ان کے قلم نے حکومتِ وقت کے ہر وار کا منہ توڑ جواب دیا ــــــــ وہ دوسروں کی طرح مصلحت پسندی اور چاپلوسی کے قائل نہیں رہے، انہیں کبھی زنداں کی اندھیری قطاروں سے ڈر نہیں لگا، جبر و تشدد کے ایسے موقعوں پر انہوں نے اپنی زبان پر خاموشی کا قفل نہیں لگایا، وہ کبھی تختۂ دار سے خائف نہیں رہے، انہوں نے تو ہمیشہ منصوری شان کو پسند کیا اور حق کے نام پر کچھ بھی کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا ــــــــ اپنی نظم دستور میں وہ کھل کر اپنے زاویۂ فکر کا اشارہ دیتے ہیں۔

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے

ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

اُردو شعراء کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو عوامی شاعری کا پورا صفحہ خالی دکھائی دیتا ہے ۔ نظیر اکبرآبادی کو چھوڑ دیجئے ۔ تو وہ لہجہ، وہ شعور، وہ بانکپن، وہ ادا کسی شاعر کا مزاج نہ بن سکی جو شاعری کے لئے ضروری مانا جاتا ہے ۔

سچ پوچھئے تو اُردو کے افق پر عوامی شاعری کی سطح پر جگمگانے والا اکیلا ستارہ نظیر تھے ۔ اور نظیر کے بعد لمبا سکوت طاری رہا اور یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ اس سکوت کو ایک لمبے عرصے تک توڑنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فکر و نظر کے معیار و مزاج سے اُردو شاعری کا قد ہمیشہ بلند رہا ہے ــــــــ غالب و میر سے ہوتی ہوئی اُردو شاعری اقبال و فیض تک آتے آتے ایک مخصوص نظریۂ حیات اور ایک مخصوص نظامِ فلسفہ کے تحت شعری سانچے میں ڈھلنے لگی اور حیات و زماں پر اپنے نئے فلسفے کی مہر ثبت کرنے لگی ۔ خیال و افکار کے نئے نئے دریچے وا ہونے لگے، عالمی مسائل پر نظر جانے لگی، دنیا کی زبوں حالی، تنگ دستی، اور جنگِ عظیم سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں قوت گویائی کی محرک ثابت ہونے لگیں ۔

ساحر میں عوامی شاعر کہلانے والی پوری بات موجود تھی مگر افسوس، ساحر کو فلمی بازاروں نے

برباد کر دیا، اس کے باوجود ساحر کی کچھ فکر انگیز نظموں میں عوامی سطح پر کچھ ایسی شعوری کارفرمائیوں کو دخل رہا ہے، جس نے انہیں عوام کے درمیان بے حد مقبول بنا دیا۔

فیض کا شمار اُردو کے بہترین نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ فیض کا شاعرانہ نظام، فکری سطح اور نظم کے لئے استعمال کی گئی مخصوص COMPACTNESS جہاں انہیں اپنے عہد میں دوسروں سے ممتاز بناتی ہیں وہیں ان کی شاعری اپنے سبک نرم لہجے اور انفرادی فکر وتیور کی وجہ سے صرف خواص میں مقبولیت کی سند حاصل کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا محرک جو عوام رہی، وہی عوام فیض کے شعری سفر کو سمجھنے سے قاصر رہے — فیض کی شاعرانہ پرواز اتنی بلند ہے کہ عوام تک اپنی بات پہونچانے کا استعارہ انہیں حاصل نہ ہوسکا۔ گو فیض نے معمولی، عام سے، سسکتے بلکتے، دردر کی ٹھوکریں کھاتے، رنج والم میں گرفتار، مصیبتوں کے شکار، رنجور و پریشان حال، مزدور طبقے اور عام انسانی پریشانیوں اور مسائل میں ہی جھانکنے کی کوشش کی، اس کے باوجود ان کے تخلیقی سرچشموں تک عوام کی رسائی نہ ہوسکی —

عوامی شاعر وہی ہے جو عوام کے احساس وجذبات کو بخوبی سمجھتا ہو اور اسے شعری سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جانتا ہو — وہ انقلاب کی باتیں کرتا ہو تو وہاں صرف لفظی بازیگری اور گھن گرج کو دخل نہ ہو، بلکہ سماجی برائیوں اور دبے کچلے لوگوں کی تڑپ کسک کو سمجھنے کی شعوری کوشش بھی شامل ہو۔ حبیب جالب کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ سے رشک آمیز استعجاب سے واسطہ پڑا ہے۔ موضوع کا انتخاب اور Contacts کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اشاروں کنایوں اور ضرورت پڑنے پر دوٹوک اپنی بات کہنے میں حبیب جالب کا جواب نہیں — مثال کے طور پر ؎

ایسے الفاظ نہ اوراق لغت میں ہوں گے
جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے
ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے
چند لوگوں ہی کی تسکین کا پہلو نکلے

میں ضرور آؤں گا ایک عہد حسیں کی صورت

(اپنے بچوں کے نام)

کہاں ٹوٹی ہیں زنجیریں ہماری — کہاں بدلی ہیں تقدیریں ہماری
وطن تھا ذہن میں، زنداں نہیں تھا — چمن خوابوں کا یوں ویراں نہیں تھا
مسلط ہے سروں پر رات اب تک — وہی ہے صورتِ حالات اب تک

(۱۴، اگست)

حبیب جالب تخلیق کار کے قدر اور منصب کو سمجھتے تھے، اس لئے اپنی بات کہتے ہوئے کہیں کوئی جھجک یا خوف اُن کے اندر نہیں ہے۔ نہ وہ تختۂ دار سے ڈرے، نہ انہیں زنداں کی دیواروں کا ہی خوف ہے ـــــ وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ دیواریں کلمۂ حق کی صدا لگانے والوں کے لئے شروع سے رہی ہیں۔ چاہے یہ سقراط ہوں یا منصور ـــــ سچ کہنے کی سزا سب کو ملتی رہی ہے ـــــ اور بیشک یہ سزا حبیب جالب کو ان کی زندگی میں ملتی رہی۔ لیکن ان سزاؤں سے وہ گھبرائے کب، نہ ہی ان کی قوت گویائی میں کوئی کمی آئی۔ ہاں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ، ظلم، ناانصافی، حکومت، فوجی نظام، بربریت اور تشدد کو نشانہ بنانے لگے۔ پاکستان کا امریکہ کی چاپلوسی کرنا انہیں شروع سے ناپسند تھا ـــــ امریکہ کی تخریبی کارروائیوں اور پاکستان کی خوشامدانہ روش کی انہوں نے اپنی کئی نظموں میں پُرزور مخالفت کی۔

ان کے ملک نے سیاست میں عموماً امریکہ کے کندھوں کا سہارا لے کر ہی اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خمیازہ عوام کو فوجی حکومت کی شکل میں ہی بھگتنا پڑا۔ لاٹھی گولی کی سرکار سے عوام کا اعتبار اُٹھ گیا۔ بندشوں اور فوجی پہروں میں ایک خاص طرح کی غلامی جنم لیتی ہے۔ حبیب جالب کی آزادانہ طبیعت شروع سے ہی اس غلامی کی مخالف رہی۔ ان کی نظموں کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ تقسیم کے حق میں کبھی نہیں رہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں سے ایک ہی طرح سے پیار کرتے رہے۔ یہاں ان کی غیرت کو دھکا اس وقت لگتا تھا جب ان کا وطن عزیز دوسرے ملکوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا۔ حبیب خود مختاری کے قائل تھے۔ اور جب یہ جذبہ زخمی ہوتا نظر آتا تو وہ بے ساختہ چلا اٹھتے تھے ؎

پاکستان کی غیرت کے رکھوالو\
بھیک نہ مانگو\
اپنے بل پر چلنا کب سیکھو گے\
طوفانوں میں پلنا کب سیکھو گے\
انگریزوں کے پٹھو کہلاؤ نا\
امریکہ کے تلوے سہلاؤ نا\
آزادی کے سر پہ خاک نہ ڈالو\
بھیک نہ مانگو

حبیب اسلام اور اسلامی عقیدوں کے مخالف کبھی نہیں رہے۔ مگر ان کی حکومت جو اسلام عوام پر تھوپنے کی کوشش کر رہی تھی، حبیب جالب اُس سرکاری نظام کے کٹر مخالف رہے تھے۔ وطن عزیز

میں اسلام کے نام پر ہونے والی برائیوں، مظالم اور بربریت کا ننگا ناچ دیکھ کر ان کا دل رو اٹھتا تھا ـــــ عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک، آزادی پر پہرہ اور اس طرح کے سینکڑوں ایسے واقعات تھے، حبیب جیسے بدلنے کے حق میں تھے ۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک سچے اور آزاد پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے اور ذہنی اور جسمانی غلامی کی فضا میں یہ ممکن نہ تھا ـــــ اسلام کے نام پر جبر و تشدد کے واقعات جب کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگے تو حبیب جالب کا قلم خاموش نہ رہ سکا ـــــ وہ اس کی پرزور مخالفت پر اُتر آئے ۔

اسلام خطرے میں ہے' کی آواز لگانے والے ملاؤں کے تو وہ سخت ترین مخالف تھے ـــــ اسلام کے ٹھیکیداروں کے لئے ان کی مشہور نظم خطرے میں اسلام نہیں، خاص مزے کی چیز ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ـــــ

خطرہ ہے خوں خواروں کو
رنگ برنگی کاروں کو
امـــریکہ کے پیاروں کو
خطرے میں اسـلام نہیں

حبیب جالب دراصل عمل کرنے میں یقین کرتے تھے، اس لئے وہ اس اسلام کے قائل نہیں جو حقوق کی آزادی پر پہرہ سکھاتا ہے ۔ اسلام کا نام لے کر اپنی دکان چلانے والوں کو وہ لبنان، فلسطین اور بیروت کے کربناک مناظر دکھاتے ہیں، جہاں دھواں ہے خوف ہے، چیخیں ہیں اور لاشیں ہی لاشیں ہیں۔ وہ بیکار تقریروں اور فتووں کے حق میں نہیں تھے ـــــ وہ تقدیر سے زیادہ تدبیر اور دعا سے زیادہ عمل پر بھروسہ رکھتے تھے ۔ اس لئے کہتے ہیں۔

کروڑوں کیوں نہیں مل کر فلسطیں کے لئے لڑتے
دعا ہی سے فقط کٹتی نہیں زنجیـــــر مولانا

ظاہر ہے، حبیب جالب کی ان باغیانہ انقلابی نظموں کا شائع ہونا تھا کہ اللہ کے خاص الخاص درباریوں، کو انہیں کافر کہتے ہوئے شرم نہیں آئی ـــــ حکومت کے لئے تو ان کی ہستی شروع سے ہی ناپسندیدہ رہی تھی ۔ لیکن حبیب جالب خود پر ہونے والے مظالم سے کبھی گھبرائے نہیں ۔ ہاں اللہ کے درباریوں سے انہوں نے جم کر شکوہ کیا اور اس کا بدلہ اس طرح لیا ۔

خدا تمہارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

لہو پیو گے کہاں تک ہمارا دھوانو
بڑھاؤ اپنی دکاں سیم و زر کے دیوانو
نشاں کہیں نہ رہے گا تمہارا شیطانو
ہمیں یقیں ہے کہ انسان اس کو پیارا ہے
خدا تمہارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے

درحقیقت حبیب جالب کی شاعری انسانیت کی ترجمان ہے۔ خدا کی عبادت سے زیادہ بڑی عبادت انہیں خدمت خلق لگتی ہے ــــــ زمین پر بہتے ہوئے انسانی خوف حبیب جالب کی شاعری میں اتر کر ایسے لہو لہان عناصر کو جنم دیتے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فلسطین ہو یا لبنان، یا بیروت کے شہید معصوم انسان اور بچے، یہ بچے اور انسان جس کسی ملک اور جس کسی مذہب سے جڑے ہیں، یہ سب حبیب کے برادرانہ رشتہ سے بندھے تھے، ان کی آہ حبیب کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور قلب سے جو دکھ کی صدا پھوٹتی تھی وہ شعری تخلیق کا سرچشمہ ثابت ہوتی تھی۔

حقیقتاً حبیب جالب عوامی طرز کے شاعر تھے۔ ان کا اپنا انفرادی رنگ اور تیور تھا، وطن کے دبے کچلے مظلوم اور پابند۔لوں کے اسیر عوام اور ان کی غلامانہ ذہنیت کو حبیب زیادہ دن تک نہیں جھیل پائے ــــ محض شکوے گلے پر یقین نہ کرنے والے حبیب قلندر صفت انسان تھے ــــ وہ میدانِ کارزار میں ڈٹے رہے، انہیں عوام کی مجبوریوں کا خیال رہا، اور جو مسائل انہیں درپیش رہے انہیں پورٹریٹ کرنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی ــــ حبیب جالب نے اپنی شاعری سے عوام کے دل کو جیتا تھا اس لیے حبیب جالب کی مکمل شاعری کو انسانی بھائی چارگی اور عالمگیر برادری کے نام منسوب کیا جاسکتا ہے۔

نند کشور وکرم

عوام کا محبوب شاعر۔ حبیب جالب

موجودہ صدی میں ہمیں اقبال، جوش، فراق، فیض، حفیظ، احسان دانش ایسے کئی عظیم المرتبت شاعر نصیب ہوئے جن پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ لیکن اسی صدی کے وسط میں دنیائے شاعری میں ایک ایسا ممتاز و منفرد شاعر نمودار ہوا جس نے اپنی شاعری ہی نہیں بلکہ زندگی بھی عوام کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور جو مرتے مرتے مر گیا لیکن نہ تو قید و بند سے اُس کے ارادے متزلزل ہوئے اور نہ ہی آمرانہ جبر و استبداد ہی اسے اپنی راہ سے ہٹا سکے۔

اس ہر دل عزیز اور عوام کے محبوب شاعر کا نام تھا حبیب جالب۔ جو برسوں اپنے ملک کے عوام کی بہتری و خوشحالی اور درخشندہ مستقبل کی خاطر صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد آخر ۱۹۹۳ء کی ۱۲ اور ۱۳، مارچ کی درمیانی شب کو لاہور کے ایک ہسپتال میں دم توڑ گیا اور اُردو ادب ایک ایسے شاعر سے محروم ہو گیا جس کی شخصیت اور شاعری میں کوئی تضاد نہیں ملتا تھا اور جو گفتار کا ہی نہیں کردار کا بھی غازی تھا۔

جالب ۲۸ فروری ۱۹۲۸ء میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے اور برصغیر کی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے لیکن وہاں جا کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ ملک پے بہ پے سیاسی بحرانوں کا شکار ہو رہا تھا اور اقتدار کی جنگ میں رہنما عوام کو بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ ایسے حالات میں ان کی شاعری میں شدت پیدا ہو گئی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعے "حرفِ سر دار" کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

"برگِ آوارہ دھیمے لہجے کی شاعری ہے جس میں چھوڑے ہوئے دیاروں،

بچھڑے ہوئے یاروں کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ جگہ جگہ عدم تحفظ کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے بعد میں آنے والی کتابوں میں دھیما لہجہ بلند آہنگ ہو گیا ہے۔ کیوں نہ ہوتا کہ ایک منظم منصوبے کے تحت وطن عزیز کو خوفناک آمریت کے شکنجے میں جکڑا جا رہا تھا۔ جتنا جبس بڑھتا گیا لہجہ اتنا ہی تیز و تند ہوتا گیا۔ اس لہجے کی وجہ سے کئی بار پسِ دیوارِ زنداں بھی گیا اور زنداں سے ایک شعری مجموعہ لے آیا۔"

ملک کی ڈانواں ڈول اور غیر یقینی سیاسی صورتِ حال میں جب جنرل ایوب خان نے عوام پر فوجی حکومت مسلط کر دی تو انہوں نے اس کی کھل کر مخالفت کی حتیٰ کہ ان کی انقلابی شاعری جنرل ایوب خان کے خلاف مس فاطمہ جناح کی مہم میں ایک طرح سے مینی فیسٹو کی حیثیت اختیار کر گئی اور پھر جب فوجی دَور حکومت میں ملک پر عوام دشمن دستور نافذ کیا گیا تو انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا نظم لکھی جس نے تہلکہ مچا دیا اور ساتھ ہی اُن پر مصیبتوں اور اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ نظم ہر کہ و مہ کی زبان پر تھی اور ہر طرف یہ آواز گونج رہی تھی۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

جالبؔ کو جنرل ایوب، یحییٰ خان اور ضیاالحق کے دَورِ حکومت میں ہی نہیں بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں کے ساتھ اُن پر بھی حیدر آباد سازش کیس کے تحت مقدمہ چلایا گیا مگر اس کے باوجود اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ وہ ہمیشہ جابر و آمر سے ٹکراتے رہے اور سیاسی بازی گروں اور صاحبانِ اقتدار کے جھوٹ کی قلعی کھولنے سے انہیں دار و رسن بھی باز نہ رکھ سکے بقول اُن کے ؎

رستہ کہاں سورج کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر بند

جیسا کہ ہم جانتے ہیں حبیب جالب کی شاعری اُس دَور کی پیداوار ہے جب کہ حصولِ آزادی کے بعد برصغیر سیاسی بحران کا شکار تھا اور سیاسی رہنما تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر ہر قیمت پر اقتدار

حاصل کرنے کی دَوڑ میں لگے ہوئے تھے ۔ اور ہر شے بکاؤ بن چکی تھی ۔ قلم ، ضمیر، ظرف ، ہر ایک کی قیمت تھی مگر ایسے دَور میں یہ شاعرِ حساس دلیری وجرأت سچائی وبے باکی استقلال وثابت قدمی کی علامت بن کر عوام کے سامنے نمودار ہوا اور اُس نے سہمے اور خوفزدہ عوام میں اپنی شاعری سے نئی روح پھونکنے کی کوشش کی حتیٰ کہ جب فوج مشرقی پاکستان میں نہتے اور بے قصور انسانوں پر مظالم ڈھا رہی تھی اور اکثر نے مصلحتاً خاموشی اختیار کرلی تھی اُس وقت بھی اس عوامی شاعر کو فوجی جبر و استبداد خاموش نہ کرسکا اور انہوں نے ببانگِ دہل کہا ؂

محبت گولیوں سے بو رہے ہو — وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے — یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

اس میں شک نہیں کہ جالب کی شاعری پاکستانی پس منظر میں پروان چڑھی اور اُنہوں نے اپنے ملک کے غریب لاچار اور مظلوم عوام کے رنج والم اور تکالیف کی آئینہ داری کی مگر حقیقی شاعر کی طرح ان کی شاعری کسی ملک ، خطے ، ذات ، قوم یا نسل تک محدود نہیں ۔ ان کی شاعری آفاقی ہے ۔ اور وہ دنیا کے تمام مظلوم افراد کی ترجمانی کرتی ہے ۔ اور وہ پاکستان کے ہی نہیں تمام دنیا کے مظلوم اور ستائے ہوئے عوام کو ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے ہمت بندھاتے ہیں اور کہتے ہیں ؂

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے چاک گریباں کا
چاروں جانب خاموشی ہے دیوانے یاد آتے ہیں

حصولِ آزادی کے بعد جب اکثر ادیبوں ، شاعروں ، صحافیوں اور دانشوروں نے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کے لئے ایمانداری اور غیر جانب داری کو تلانجلی دے دی تھی اور اپنے معمولی سے آرام وآرائش کی خاطر اپنے ظرف ، ضمیر اور قلم تک کو گروی رکھ دیا تھا ۔ اور عوام کا ساتھ چھوڑ کر برسرِ اقتدار طبقہ کے ساتھ ہوگئے تھے ، جالب اپنے منتہائے مقصود کی جانب ثابت قدمی سے رواں دواں رہے اور کچھ انعامات و اعزازات اور آرام و آسائش کے حصول کے لئے اپنے اصولوں کو خیر باد کہہ کر بک جانے والے بے ضمیر ادیبوں اور صحافیوں کو مخاطب کرکے بڑے دکھ سے کہتے رہے ۔

قوم کی بہتری کا خیال چھوڑ — فکرِ تعمیرِ ملک دل سے نکال
تیرا پرچم ہے تیرا دستِ سوال — بے ضمیری کا اور کیا ہو مآل

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

اسی طرح سرمایہ داروں ، مل مالکوں ، افسروں اور جاگیرداروں کی دھاندلیوں اور جبر و ستم پر بھی وہ خاموش نہیں رہے اور انہیں للکار کر تنبیہہ کرتے ہیں ۔

ملوں کے مالکو اے افسرو زمیندارو
ہماری راہِ ترقی میں کالی دیوارو
ہو چند روز ہی تم سیم و زر کے بیمارو
نشاں یزید کا باقی ہے اور نہ زار کا ہے
یہ دَور اصل میں انسان کے وقار کا ہے

درحقیقت جالب کی شاعری ان کے عشقِ بشر اور ایماندارانہ احتجاجی رویّے پر مبنی ہے۔ گو احتجاجی ادب لگ بھگ ہر زبان میں پایا جاتا ہے اور اُردو ادب میں بھی اس کی کمی نہیں لیکن جتنا احتجاج جالب کی شاعری میں پایا جاتا ہے اتنا اُردو کے کسی اور شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ ان کی ابتدائی شاعری کا لہجہ دھیما ضرور تھا لیکن جوں جوں آمریت کا قہر و جبر بڑھتا گیا اور بے اصول سمجھوتوں کا دَور دورہ شروع ہو گیا ان کا احتجاج شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اسی طرح انسان سے ان کا عشق اس معراج تک پہونچ گیا تھا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ ساری خدائی کا درد ان کے دل میں سما گیا تھا اور وہ ساری عمر انسانی کرب میں تڑپتے رہے۔ مجبور محکوم لاچار اور درماندہ افراد کے حق میں آواز بلند کرنا ان کا شیوۂ زندگی بن گیا اور اس سے انہیں کوئی قہر و جبر بھی نہ روک سکا اور نہ قید و بند کی صعوبتیں اور اذیتیں۔ انہیں اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ عشق ہر فرد کے بس کی بات نہیں اسے اختیار کرنا آگ کے دریا میں کودنا ہے اسی لئے وہ اپنے ساتھیوں اور عوام کو خبردار کرتے ہیں کہ ؎

غم کے ڈھانچے میں ڈھل سکو تو چلو — تم میرے ساتھ چل سکو تو چلو
دُور تک تیرگی میں چلنا ہے — صورتِ شمع جل سکو تو چلو

جالب کی غزلوں کو ان کی نظموں کے مقابلے میں کم اہمیت دی گئی ہے حالانکہ ان کی غزلوں کو غنائیت اور سلاست میں احتجاج اور تلخ کلامی کی آمیزش نے پرکشش اور پرتاثیر بنا دیا ہے جیسا کہ احمد ندیم قاسمی نے ان کے پہلے شعری مجموعے "برگِ آوارہ" کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"حبیب جالب کی نظموں اور بعض غزلوں کے اِکّا دُکّا اشعار میں تلخی اور طیش کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے لیکن یہ ان کے فن کا نقص نہیں اُس کے فنی خلوص کا احتجاج ہے اور جس فنکار کو احتجاج کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ خود فن کی بے حرمتی پر صرف آنکھیں جھپک کر رہ جاتا ہے۔"

جالب کی غزلوں میں کلاسکیت بھی ہے اور جدیدیت بھی اور وہ اس امتزاج سے ایسے ایسے اشعار کی تخلیق کرتے ہیں جو ہم پر بے پناہ اور اَمٹ تاثر چھوڑتے ہیں اور جنہیں ہم بار بار دہراتے ہیں جیسے ؎

کسے خبر تھی ہمیں راہبر ہی لوٹیں گے — بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے

نگاہ دہر میں ذرے سہی ہم لوگ — ضیا کی بھیک نہیں مانگتے ستاروں سے

تعجب ہے ستم کی آندھیوں میں — چراغِ دل ابھی تک جل رہا ہے

ان بستیوں میں رسمِ وفا ختم ہو چکی — اے چشمِ نم کسی سے نہ کر عرضِ غم یہاں

ہم سے پوچھو چمن پہ کیا گزری — ہم گزر کر خزاں سے آئے ہیں

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

حیرت سی برستی ہے در و بام پہ ہر سو — روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار — ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گوہر ہیں

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب نے ماضی میں ہمیں کئی عظیم المرتبت شاعر عطا کئے ہیں اور آئندہ بھی کئی بڑے شاعر ہمیں نصیب ہوں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ حبیب جالب جیسے بے باک و دلیر شاعر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس میں تو کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ حصولِ آزادی کے بعد برصغیر کی کسی زبان میں بھی ان جیسا نڈر اور باضمیر شاعر پیدا نہیں ہوا جس نے مظلوم اور مجبور عوام کے لئے اربابِ اقتدار سے ٹکر لی ہو اور اپنی زندگی کا طویل عرصہ قید و بند کی اذیتیں برداشت کرتے میں گزارا ہو۔ بلاشبہ وہ برصغیر کے واحد شاعر تھے جنہوں نے اپنا قلم ہی نہیں اپنی زندگی بھی عوام کے لئے وقف کر دی تھی اور جو گفتار کے ہی نہیں کردار کے بھی غازی تھے اور جنہیں آمروں، اور جابروں کا قہر و ستم بھی اپنی منزلِ مقصود سے نہ ہٹا سکا۔ جو اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں کے باوجود سچائی کے پرچم کو بلند کئے رہے، جنہوں نے کسی قیمت پر قلم اور ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ اور ہمیشہ ہی نعرۂ حق بلند کیا کہ ؎

میرے ہاتھ میں قلم ہے میرے ذہن میں اجالا
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکرِ امنِ عالم تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

(ماہنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی جنوری ۱۹۹۴ء)

وحید انور

سنگینوں کے راج میں سچ کہنے والے

مرحوم حبیب جالبؔ

فیض احمد فیض کے بعد پاکستان میں "احتجاجی شاعری" کی سب سے اہم آواز کا نام حبیب جالب تھا۔ اب وہ آواز ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی ہے۔

ابتدا ہی سے حبیب جالب نے اپنا رشتہ عوام سے جوڑا۔ اُن کے دُکھ دَرد کو اپنایا۔ اُن کی زندگی کے اہم مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اسی لئے فیض احمد فیض نے انہیں "پاکستان کا عوامی شاعر" قرار دیا۔

دراصل جالب نے فیض اور مخدوم کی پیروی کی۔ اُن دونوں کو اپنا آئیڈیل سمجھا۔ اور اپنی شاعری کو عوام تک پہونچانے کے لئے اس کا رخ احتجاج اور انقلاب کی طرف موڑ دیا۔ اُن کی آواز عوام کی آواز تھی۔

وہ پاکستانی عوام کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ اُن کی شاعری چالیس سال پر محیط ہے۔ اُن کی ساری زندگی جنرلوں کی حکومتوں سے لڑتے ہوئے گزری۔ ہر دَور میں وہ ظلم جبر اور استحصال کے خلاف آواز اُٹھاتے رہے۔ اُن کی شاعری ایک مخصوص نقطۂ نظر اور انداز فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔

وہ ہندوستان میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے پاکستان میں۔ میں حبیب جالبؔ کو پاکستان کا مخدوم محی الدین کہتا ہوں۔ جس طرح مخدوم نے اپنی ساری زندگی عوام کے لئے وقف کر دی تھی۔ حبیب جالبؔ نے بھی اپنی ساری زندگی پاکستانی عوام کے لئے وقف کر دی تھی۔ دونوں نڈر اور بے باک تھے۔ ان کی زندگی کا ایک خاص مقصد تھا۔ انہوں نے کبھی بھی Establishment سے سمجھوتہ

نہیں کیا اور حکومت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ ان پر عتاب نازل ہوئے۔ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا جہاں ان کو صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن انہوں نے سچائی کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنے مقصد پر اٹل رہے۔

دونوں قولاً فعلاً شاعر تھے۔ عوام سے بے پناہ پیار اور عوام کی طاقت پر بھروسے نے اُن کی شاعری کو جلا دی تھی۔ عوام کا سارا دُکھ درد اُن کی ساری خوشیاں اُن کی شاعری میں کھنچ کے آگئی تھیں۔ وہ عوام سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ایوب خان، بھٹو اور ضیاء الحق کے دَور حکومت میں جالب پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ان کو جیل میں اذیتیں دی گئیں۔ لیکن انہوں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ انہوں نے جیسے خونِ دل میں اپنی انگلیاں ڈبو لی تھیں۔ وہ برابر حکایات خونچکاں لکھتے رہے۔

کئی بار انہیں عہدوں کا لالچ دیا گیا اور ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ بکے نہیں۔ اور انتظامیہ کا شکار نہیں ہوئے۔

انہیں اس سماج سے نفرت تھی جس میں کمزور و بے بس انسانوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اُن کے حقوق کو غصب کیا جاتا ہے۔ ان پر ہر طرح کا ظلم کیا جاتا ہے۔

ظلم کہیں بھی ہو ہم اس کا سر خم کرتے جائیں گے
محلوں میں اب اپنے لہو کے دیئے نہ جلنے پائیں گے

حبیب جالب ایک خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھتے رہے تھے۔ زندگی کو سنوارنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے تھے۔ اس کی انہیں بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ وہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔

تیرے لئے میں کیا کیا صدمے سہتا ہوں
سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھول بھی ہیں
تیری خاطر کانٹے چنتا رہتا ہوں

تو آئے گا اسی آس پر جھوم رہا ہے دل
دیکھ اے مستقبل!

اپنی بات عوام تک پہونچانے کے لئے جالب کے پاس شاعری ایک مؤثر ذریعہ تھا جسے وہ ظلم، جبر، جہالت، تنگ نظری اور استحصال کے خلاف استعمال کرتے تھے۔

مشاعروں اور جلسوں میں جالب کی بہت شہرت تھی۔ ان کی شہرت سے اکثر ادیب اور شاعر خائف

تھے اور ان پر الزامات لگاتے تھے کہ "حالب موقع پرست ہے۔ وہ تنگ نظری کرتا ہے۔ سیاسی شاعری کرتا ہے۔" انہوں نے حالب کو شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا۔

جیسے جیسے سیاسی پابندیوں میں اضافہ ہوتا گیا سختیاں بڑھتی گئیں۔ حالب کی شاعری میں اتنا ہی زور، اتنا ہی جوش اور ولولہ پیدا ہوتا گیا۔ برسرِ اقتدار قوتوں کو انہوں نے منہ توڑ جواب دیا۔

رہ گئے نقش ہمارے باقی
مٹ گئے ہم کو مٹانے والے

وہ مایوس اور اُداس عوام کو یوں دلاسا دیتے ہیں۔

دیکھ وہ صبح کا سورج نکلا
مسکرا اشک بہانے والے

اُن کا پہلا مجموعۂ کلام "برگ آوارہ" ہے اس میں حالب کا لہجہ نرم اور دھیما ہے۔ لیکن جب ملک آمریت کی نذر ہو گیا اور پاکستان میں اظہارِ بیاں کی آزادی پر پابندی لگا دی گئی اور ادیبوں شاعروں کی تحریروں کو سنسر کیا جانے لگا تو جالب کا لہجہ سخت اور بے باک ہو گیا۔ انہوں نے سنسر شپ اور پابندی کی کوئی پروا نہیں کی اور برسرِ اقتدار حکومت کے خلاف لکھتے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوب خان، بھٹو اور ضیاء الحق نے بالترتیب ان کے تین مجموعوں "سرِ مقتل" "ذکر بہتے خون کا" اور "گنبدِ بے در" کو ضبط کر لیا۔

کوئی بھی حکومت جالب کے عزم و استقلال کو لڑکھڑا نہ سکی۔ وہ برابر محنت کشوں، مزدوروں کسانوں اور طالب علموں کے مسائل اور اُن کے استحصال کے بارے میں لکھتے رہے اور جمہوریت کی لڑائی لڑتے رہے۔

جدھر جائیں وہی قاتل مقابل
یہ صورت کب نہ تھی اے دل مقابل

جب کبھی جالب کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے فلموں کی طرف رخ کیا اور گیت لکھنے لگے۔ ریاض شاہد کی فلم "بھروسہ" سے ان کو شہرت ملی۔

فلمی گانوں کو انہوں نے ایک نیا موڑ دیا اور فلمی گیت نگار کی حیثیت سے بھی یہ کافی مشہور رہے۔ کچھ سال پہلے انہوں نے ایک فلم پروڈیوس بھی کی۔

حبیب جالب کو کبھی بھی انعام یا صلے کی خواہش نہیں رہی۔ ہمیشہ وہ اس سے انکار کرتے رہے۔

ملک کی تقسیم سے پہلے وہ دلّی میں رہتے تھے۔ دہلی شروع سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ہر سال دہلی میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جالب ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اُن دِنوں اُن کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ تب ہی سے ان کی طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہوگئی۔

ملک کی تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ پاکستان کے بارے میں انہوں نے بڑے سہانے خواب دیکھے تھے۔ مگر انہوں نے وہاں دیکھا کہ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے۔ اور ملک استحصال کا شکار ہے۔ یہی سب دیکھ کے جالب کے خواب ٹوٹ گئے۔ انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ حکومت نے انہیں "کافر" کا فتویٰ دے دیا۔ انہیں غدّار تک کہا گیا۔

وہ فیض کے قریبی ساتھیوں میں تھے اور اُن کے بڑے مداح تھے۔ لیکن بعض باتوں میں وہ فیض سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔

ان کے سارے کلام کا مجموعہ کلیات کی شکل میں پہلی بار "حرفِ سرِدار" کے نام سے ۱۹۸۶ء میں لندن سے شائع ہوا۔ بعد میں یہی مجموعہ لاہور سے بھی چھپا۔

"حرفِ سرِدار" کا انتساب جالب نے اس طرح کیا ہے:

دار پہ بھی سچ کہنے والے انسانوں کے نام
طالب علموں محنت کاروں دہقانوں کے نام
دنیا بھر کے اپنے جیسے دیوانوں کے نام

اپنے دیباچے "سرِآغاز" میں لکھتے ہیں: "ایک مدت سے جی چاہتا ہے کہ تفصیل سے ان شعرا کے بارے میں لکھا جائے جو ازل سے رجعت پسند، عوام دشمن برسرِ اقتدار طبقے سے نبرد آزما رہے ہیں۔ مثلاً قرۃ العین طاہرہ، منصور حلاج، ابوالقاسم لاہوتی۔ ایران میں قاچاری اور پہلوی دَور کے شعراء جن کے جسم میں موم بتیاں گاڑی گئیں، زندانوں میں ڈالے گئے اور وہ شعر پڑھتے رہے۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے سلسلے کا شاعر ہوں۔ مولانا حسرت موہانی اور مخدوم محی الدین کا بھی پیروکار ہوں۔"

ایک حساس اور سچا شاعر عوام کا نمائندہ ہوتا ہے جب وہ انسانوں کو اُداس اور مایوس دیکھتا ہے تو خود مایوس نہیں ہوتا بلکہ انہیں مایوسی اور نا امیدی کے اس حصار کو توڑنے اور جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

اشکوں کے جگنوؤں سے اندھیرا نہ جائے گا
شب کا حصار توڑ کر کوئی آفتاب لا
ہر عہد میں رہا ہوں میں لوگوں کے درمیاں
میری مثال دے کوئی میرا جواب لا

کسی ملک کے مالک اس کے عوام ہوتے ہیں، محنت کش، مزدور اور دہقان ہوتے ہیں نہ کہ چند ایک سرمایہ دار اور ان کے گھرانے۔

یہ دھرتی ہے اصل میں پیارے مزدوروں دہقانوں کی
اس دھرتی پر چل نہ سکے گی مرضی چند گھرانوں کی
ظلم کی رات رہے گی کب تک اب نزدیک سویرا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

حبیب جالب کہنے کو تو ایک خاص خطے اور ملک کے شاعر تھے۔ لیکن شاعر کی حیثیت آفاقی ہوتی ہے۔ وہ رنگ و نسل، زبان اور ملک اور سارے بھید بھاؤ سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ ملک کی سرحدوں کو توڑ کر ساری دنیا کی دھرتی کی مٹی میں مل جاتا ہے۔ اور پھر اس کے خمیر سے اٹھتا ہے وہ ہر اس جگہ موجود ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں جہاں انسان ظلم و استبداد، ناانصافیوں اور استحصال کا شکار ہو رہے ہوں اور وہ کچلے جا رہے ہوں۔

حبیب جالب ان معنوں میں ایک آفاقی شاعر تھے۔

اُن کی شاعری اس دھرتی پر بسنے والے سارے مجبور، بے بس اور مظلوم انسانوں کی آواز ہے۔

(ہفتہ وار بلٹز بمبئی اپریل ۱۹۹۳ء)

پرکٹی تتلی (ناول)	ہنس راج رہبر	۳۰ روپے
یادوں کے کھنڈر (ناول)	نند کشور وکرم	۵۰ روپے
انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول) زیر طبع	نند کشور وکرم	۸۰ روپے
گیانی ذیل سنگھ	سریندر سنگھ جوہر مترجم نند کشور وکرم	۱۲۰ روپے
پرندے اب کیوں نہیں اُڑتے (افسانے)	دیویندر اسر	۷۰ روپے
خوشبو بن کے لوٹیں گے (ناولٹ)	دیویندر اسر	۳۰ روپے
مستقبل کے روبرو (تنقید)	دیویندر اسر	۳۰ روپے
کینوس کا صحرا (افسانے)	دیویندر اسر	۳۰ روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۲ء	نند کشور وکرم	۳۰ روپے
منتخب افسانے ۸۵-۱۹۸۴ء	نند کشور وکرم	۴۰ روپے
منتخب افسانے ۸۷-۱۹۸۶ء	نند کشور وکرم	۴۰ روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۸ء	نند کشور وکرم	۴۰ روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۹ء	نند کشور وکرم	۴۴ روپے
منتخب افسانے ۱۹۹۰ء	نند کشور وکرم	۵۰ روپے
ہنس راج رہبر کے منتخب افسانے ۔ ایک تعارف	نند کشور وکرم	۷ روپے
اُردو ۱۹۸۳ء	نند کشور وکرم	۸۰ روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۸۶ء	نند کشور وکرم	۸۰ روپے
عالمی اُردو ادب ۸۸-۱۹۸۷ء	نند کشور وکرم	۸۰ روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۸۹ء	نند کشور وکرم	۸۰ روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۹۰ء	نند کشور وکرم	۱۰۰ روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۹۱ء	نند کشور وکرم	۱۰۰ روپے
عالمی اُردو ادب ۱۹۹۲ء	نند کشور وکرم	۱۵۰ روپے

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز جے-۹ کرشن نگر دہلی ۵۱

کلام غالب
نظمیں
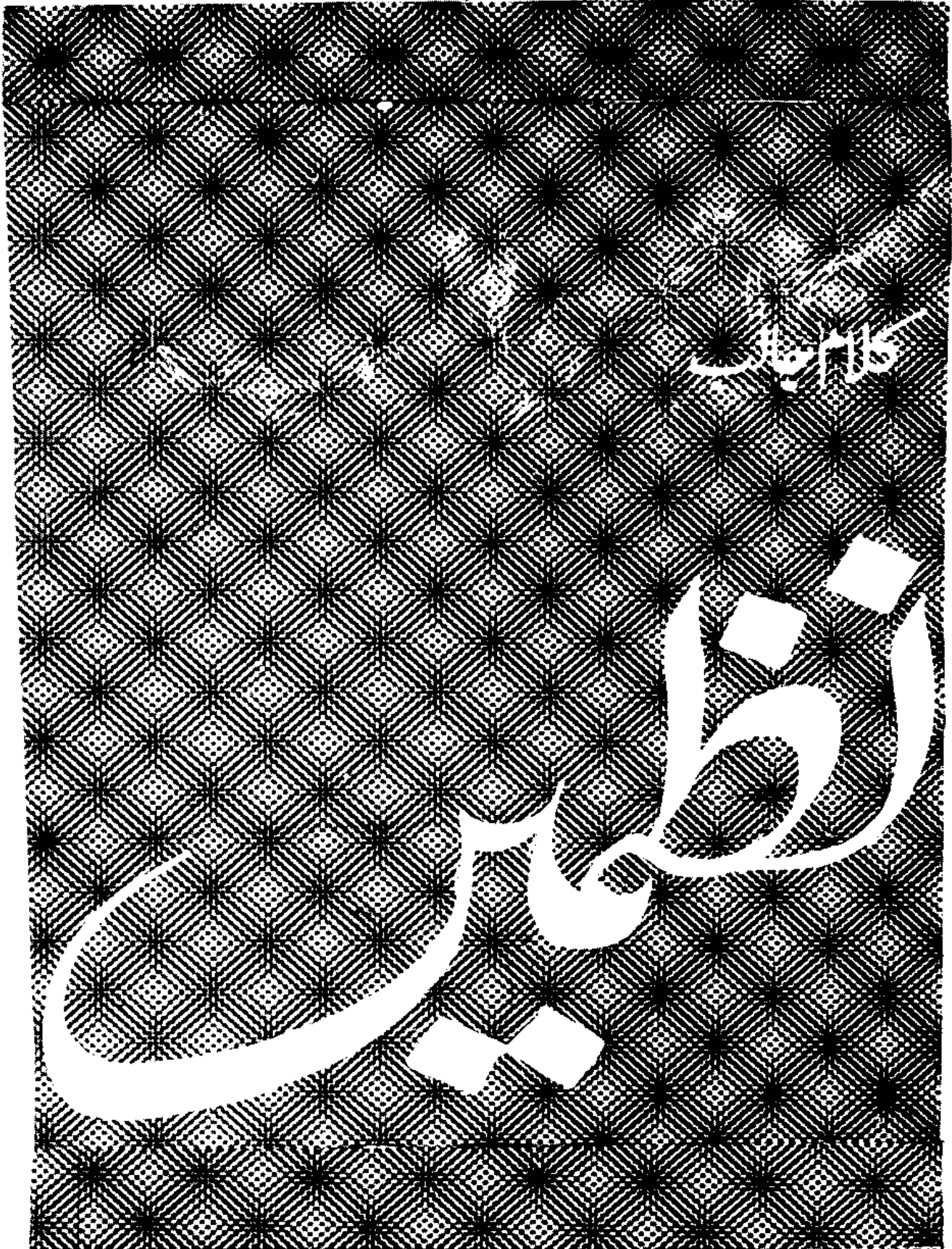
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

اب بھی پیٹ کی خاطر بک رہی ہے مجبوری
اب بھی ہے غریبوں کی اشک و آہ مزدوری
اب بھی جھونپڑوں سے ہے نورِ علم کی دوری
آج بھی لبوں پر ہے داستان مہجوری
آج بھی مسلط ہیں سامراج کے سائے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

توڑتے ہیں دم مفلس ہسپتال کے در پر
چارہ گر بھی ان کے ہیں جن کی جیب میں ہے زر
پارکوں میں سوتے ہیں کتنے نوجواں بے گھر
یہ بھی چاہتے ہوں گے ہم چلیں اٹھا کے سر
کتنے پھول مرجھائے کتنے چاند گہنائے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

ہم بھی نہ چھوڑیں گے بات برملا کہنا
ہاں نہیں شعار اپنا درد کو دوا کہنا
گر عوام خوش ہوں گے ہم کہیں گے کیا کہنا
جھوٹ ہے خوشامد ہے "فخرِ ایشیا" کہنا
رہنما وہی ہے جو فخرِ ملک کہلائے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

آرمینیا کے لوگوں کا نوحہ

ہنستے گاتے آنگنوں کو زلزلے نے آ لیا
چاند سے چہروں کو مرگِ ناگہاں نے کھا لیا

جن پہ گزرا ہے یہ عالم اُن کا غم ہوگا نہ کم
اپنے دِل کو کر کے ہم نے شاعری بہلا لیا

پھول سے بچوں کا مائیں کر رہی تھیں انتظار
گھر نہ لوٹے ہائے گورستان کا رستہ لیا

ہو گیا اک آن میں ویران پریوں کا دیار
آسماں تُو نے زمیں سے کون سا بدلہ لیا
جان لیوا آفتوں پر قابو پایا ہے کبھی
کون کہتا ہے کہ ہم نے منزلوں کو پا لیا

❋ ❋

اپنی بات کرو

چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو
نام نہ لو ان بدکاروں کا اپنی بات کرو
کل جو ہم پر چلی تھی گولی آج بھی وہی چلی
نوابوں کے وعدوں سے کب غم کی شام ڈھلی

کوئی نہیں ہم دکھیاروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو
حال ہمارا کیا جانے گا کوئی دھن والا
آپ ہی آئیں گے تو ہوگا جیون اجالا
گیا زمانہ سرداروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو
رنگ برنگی کاروں والے آخر اپنے کون
یہ تو صورت ہی سے مجھ کو لگتے ہیں فرعون

ساتھ نہ دو ان خونخواروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو

اپنی جنگ رہے گی

جب تک چند لٹیرے اس دھرتی کو گھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی
اہلِ ہوس نے جب تک اپنے دام بکھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

مغرب کے چہرے پر یارو اپنے خون کی لالی ہے
لیکن اب اس کے سورج کی ناؤ ڈوبنے والی ہے
مشرق کی تقدیر میں جب تک غم کے اندھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی
ظلم کہیں بھی ہو ہم اس کا سر خم کرتے جائیں گے
محلوں میں اب اپنے لہو کے دیئے نہ جلنے پائیں گے
کٹیاؤں سے جب تک صبحوں نے منہ پھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

جان لیا اے اہلِ کرم تم ٹولی ہو عیاروں کی
دست نگر کیوں بن کے رہے یہ بستی ہے خودداروں کی
ڈوبے ہوئے دکھ درد میں جب تک سانجھ سویرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

اپنے بچوں کے نام

میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت
دکھ میں ڈوبے ہوئے دن رات گزر جائیں گے
کوئی تحقیر کی نظروں سے نہ دیکھے گا ہمیں
پیار کے رنگ ہر اک سمت بکھر جائیں گے
پیار اُگائے گی نگاہوں کو سکوں بخشے گی
یہ زمیں خلدِ بریں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت

ایسے الفاظ نہ اوراقِ لغت میں ہوں گے
جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے
ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے
چند لوگوں ہی کی تسکین کا پہلو نکلے
خوں نہ روئے گا کبھی درد کی تنہائی میں
دل کسی خاک نشیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت

کسی لہجے سے نہ مجروح سماعت ہوگی
جہل کے ناز اُٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو
یاس انگیز اندھیرا نہ کبھی چھائے گا
آس کے دیپ بجھانے نہ پڑیں گے ہم کو
غم کے ماروں کی ہر اک شام چمک اُٹھے گی
صبحِ فرخندہ جبیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت

❋

اپنے بیٹے طاہر عباس کی یاد میں

آج وہ زندہ جو ہوتا وہ بھی خط لکھتا مجھے
پڑھ کے نورافشاں کا خط وہ اور یاد آیا مجھے

یوں تو کیا پایا ہے اس جینے میں اشکوں کے سوا
زندگی بھر اس کا کھو جانا نہ بھولے گا مجھے

پھول کو جب دیکھتا ہوں میری بھر آتی ہے آنکھ
لگ رہا ہے یہ جہاں صدیوں کا ویرانہ مجھے

جی بھی کیا سکتا تھا وہ اس سنگدل ماحول میں
اب سمجھ آیا جہاں سے اس کا اٹھ جانا مجھے

❋

اُٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اُٹھو مرنے کا حق استعمال کرو
ذلّت کے جینے سے مرنا بہتر ہے
مِٹ جاؤ یا قصرِ ستم پامال کرو

بھوک ننگ سب دین اِنہی کی ہے لوگو
بھول کے بھی مت ان سے عرضِ حال کرو
جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اُٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

سامراج کے دوست ہمارے دشمن ہیں
اِنہی سے آنسو، آہیں آنگن آنگن ہیں
اِنہی سے قتلِ عام ہوا آشاؤں کا
اِنہی سے ویراں اُمیدوں کا گلشن ہے

صبح و شام فلسطیں میں خوں بہتا ہے
سایۂ مرگ میں کب سے انساں رہتا ہے
بند کرو یہ باوردی غنڈہ گردی
بات یہ اب تو ایک زمانہ کہتا ہے
ظلم کے ہوتے امن کہاں ممکن یارو
اِسے مٹا کر جگ میں امن بحال کرو
جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اُٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

❋

اجرائے مساوات

دل تھا مرا پہلے ہی سے شیدائے مساوات
پھر کیسے پسند آئے نہ اجرائے مساوات

خونخوار لیڈروں سے ہو آزاد یہ دھرتی
اِس دیس میں اللہ کرے آئے مساوات

ہر آمرِ فرعون کو آئینہ دِکھائے
لوگوں کا ہو لوگوں سے نہ شرمائے مساوات

احساں نہ اُٹھائے کسی سُلطان کا جاب
منت کشِ امریکہ نہ کہلائے مساوات

ادیبوں کے نام

کج فہم و کج کلاہ ادیبوں کو دیکھیے
بستی اجڑ چکے گی تو لکھیں گے مرثیے

تم نے تو یہ کہا تھا اجالا کریں گے ہم
تم نے تو سب چراغ دلوں کے بجھا دیئے

کرتے ہیں یونہی دُور جہالت کی تیرگی
رکھنا تھا جن پہ ہاتھ وہی سر قلم کیے

اپنوں سے اختلاف ہے غیروں سے جنگ ہے
ہو صورتِ عذاب ہر اک جان کے لیے

زنداں میں گام گام کٹہرے قدم قدم
تم ہی بتاؤ کوئی یہاں کس طرح جیے

جینے کی آرزو ہے تو مرنا پڑے گا اب
اشکوں سے اپنے زخم کوئی کب تلک سیئے

جس ہاتھ نے اجاڑ دیا میرا گلستاں
اُس ہاتھ کو خدا کے لیے اُٹھ کے روکیے

تم شہر کے پاسبان ہو میں خیر کا نشاں
جو چیز تم پیئے ہو وہی میں بھی کیوں پیئے

ہو گا طلوع کوہ کے پیچھے سے آفتاب
شب مستقل رہے گی کبھی یہ نہ سوچئے

اربابِ ذوق

گھر سے نکلے کار میں بیٹھے، کار سے نکلے دفتر پہنچے
دن بھر دفتر کو ٹرخایا
شام کو جب اندھیارا چھایا
محفل میں ساغر چھلکایا
پھول پھول بھونرا لہرایا رات کے ایک بجے گھر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

غالب سے ہے ان کو عزت
میر سے بھی کرتے ہیں اُلفت
اور تخلص بھی ہے عظمت
گھر اقبال کے کھانے دعوت چھوٹی عمر میں اکثر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

بگیا لہو لہان

ہریالی کو آنکھیں ترسیں بگیا لہو لہان
پیار کے گیت سناؤں کس کو شہر ہوئے ویران
بگیا لہو لہان
ڈستی ہیں سورج کی کرنیں چاند جلائے جان
پگ پگ موت کے گہرے سائے جیون موت سمان
چاروں اور ہوا پھرتی ہے لے کر تیر کمان
بگیا لہو لہان
چھلنی ہیں کلیوں کے سینے خون میں لت پت پات
اور نہ جانے کب تک ہوگی اشکوں کی برسات
دنیا والو کب بیتیں گے دکھ کے یہ دن رات
خون سے ہولی کھیل رہے ہیں دھرتی کے بلوان
بگیا لہو لہان

امریکہ نہ جا

کر کے نذرِ گردشِ حالات امریکہ نہ جا
کیسے پورے ہوں گے اخراجات امریکہ نہ جا

بس لٹائے رکھ یونہی جانِ جہاں ہمساؤں سے
بس بنائے رکھ ہماری بات امریکہ نہ جا

تیرے ہی لطف و کرم سے ہے ہماری زندگی
کر کے کم جینے کے امکانات امریکہ نہ جا

تیرے جانے سے تو جاں ہو جائیں گے برباد ہم
دے کے اشکوں کی ہمیں برسات امریکہ نہ جا

ایک پنڈی شہر کیا تجھ پر نچھاور پورا مُلک
بیمتارہ آتشیں آفات امریکہ نہ جا

خاک میں مل جائیں گے سارے ہمارے کرّ و فر
لوگ بیٹھے ہیں لگائے گھات امریکہ نہ جا

کاخِ زرّیں تجھ سے ہے تیری بدولت تخت و تاج
تجھ سے قائم ہے ہماری ذات امریکہ نہ جا

تُو ہی بتلا کس طرح پا لیں گے آئنی فوج کو
جوڑتے ہیں تیرے آگے ہاتھ امریکہ نہ جا

امریکہ یا بزا کے خلاف

طوافِ کوئے ملامت کو پھر نہ جا اے دل
نہ اپنے ساتھ ہماری بھی خاک اڑا اے دل

نہیں ہے کوئی وہاں درد آشنا اے دل
اس انجمن میں نہ کر عرضِ مدعا اے دل

خیال تجھ سے زیادہ اُسے عدو کا ہے
وہ بے وفا ہے اسے اب نہ منہ لگا اے دل

دیئے ہیں داغ بہت اس کی دوستی نے تجھے
اب اور دشمنِ جاں کو نہ آزما اے دل

جو اس سے دور ہیں وہ بھی ہیں آج تک زندہ
سمجھ نہ اُس بتِ کافر کو تو خدا اے دل

اُسے رہی ہے سدا اپنی مصلحت درپیش
اُسے کسی کے زیاں کا ملال کیا اے دل

ہمارے ساتھ رہے ہیں جو بازوؤں کی طرح
نہ ہو سکیں گے کبھی ان سے ہم جدا اے دل

ہر ایک دور میں ہم ظلم کے خلاف رہے
یہی ہے جرم ہمارا یہی خطا اے دل

زمانہ آج نہیں معترف تو کل ہوگا
ہر ابتلا میں تو ثابت قدم رہا اے دل

وطن کے چاہنے والے سمجھ رہے ہوں گے
ہے کس خلوص سے جالبؔ غزل سرا اے دل

❋

ایک شام

یہ شام نغمہ بہ لب شام خوبصورت شام
یہ شام ایک زمانے کے بعد آئی ہے
یہ شام جام بکف شام رنگ و نور کی شام
خرد کے نام جنوں کا پیام لائی ہے

تمام عمر پڑی ہے غمِ جہاں کے لیے
غمِ جہاں سے نگاہیں ذرا بچالیں آج
بچا کے محتسبوں کی نظر ہمیں پر ہے
ہر ایک خوف پہ جی بھر کے مسکرالیں آج

سکون لوٹنے والے تو چاہتے ہیں یہی
کہیں سکوں نہ ملے ہم سے غم کے ماروں کو
چمن اداس رہے یونہی اپنے خوابوں کا
یونہی ترستے رہیں ہم حسیں بہاروں کو

کریں بہار کی باتیں صبا کے لہجے میں
کسی حسیں سے کہیں فیضؔ کی غزل گائے
دیارِ دل کو اجالیں عدمؔ کے شعروں سے
رُخِ حیات پہ رنگ آئے روشنی آئے

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ آزار
ہمارے دل کو نہیں چھو سکے گا غم کوئی
ہمارے ہاتھ میں ہے آفتابِ عالم تاب
قریب آ کے دکھائے شبِ الم کوئی

سلہ اختر شیرانی مرحوم

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں ۔۔۔ ہر آمر کا یہ حامی ہے
ریگن کا مٹا دو نام و نشاں ۔۔۔ کب اس کی سوچ عوامی ہے
انصاف ہے جس سے اشک فشاں ۔۔۔ چودیس اس کی بدنامی ہے
سچ جس کی طبیعت پر ہے گراں ۔۔۔ تقدیر اس کی ناکامی ہے
جو بولتا ہے نفرت کی زباں ۔۔۔ دہشت میں بڑا ہی نامی ہے
جو بانٹتا ہے آہوں کا دھواں ۔۔۔ پختہ اس کی یہ خامی ہے
خطرے میں ہیں جس سے دیدہ وراں ۔۔۔ ہے زہر بھرا اس کا بیاں
اس دہر میں امن کا ہر امکاں ۔۔۔ اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں ۔۔۔ انسان کی شان قذافی ہے
ورنہ وہ مٹا دے گا تم کو ۔۔۔ عالم کی آن قذافی ہے
مٹی میں ملا دے گا تم کو ۔۔۔ اپنا دل جان قذافی ہے
کچھ ایسی فضا دے گا تم کو ۔۔۔ جیون مسکان قذافی ہے
ظلمت میں چھپا دے گا تم کو ۔۔۔ سچ کی پہچان قذافی ہے
جینا ہی بھلا دے گا تم کو ۔۔۔ سچ کی برہان قذافی ہے
رفعت سے گرا دے گا تم کو ۔۔۔ اس جیسا نہ مردِ میداں
پاؤ گے یہ سورج چاند کہاں ۔۔۔ اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں
اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں ۔۔۔ ریگن کا مٹا دو نام و نشاں

اے جہاں دیکھ لے!

اے جہاں دیکھ لے کب سے بے گھر ہیں ہم
اب نکل آئے ہیں لے کے اپنا علم
یہ محلات یہ اونچے اونچے مکاں
ان کی بنیاد میں ہے ہمارا لہو
کل جو مہمان تھے گھر کے مالک بنے
شاہ بھی ہے عدو، شیخ بھی ہے عدو
کب تلک ہم سہیں غاصبوں کے ستم
اے جہاں دیکھ لے کب سے بے گھر ہیں ہم
اب نکل آئے ہیں لے کے اپنا علم

اتنا سادہ نہ بن تجھ کو معلوم ہے
کون گھیرے ہوئے ہے فلسطین کو
آج کھل کے یہ نعرہ لگا اے جہاں
قاتلو، رہزنو، یہ زمیں چھوڑ دو
ہم کو لڑنا ہے جب تک کہ دم میں ہے دم
اے جہاں دیکھ لے کب سے بے گھر ہیں ہم
اب نکل آئے ہیں لے کے اپنا علم

❁

اکتوبر انقلاب

اِس انقلاب سے انساں کا بول بالا ہوا
اِس انقلاب سے کٹیاؤں میں اُجالا ہوا
اِس انقلاب کا دِن اس لئے مناتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں
اِس انقلاب سے محنت کشوں کا راج آیا
اِس انقلاب سے انصاف کا سماج آیا
جب اِس کے رنگ نگاہوں میں مسکراتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں
اِس انقلاب نے تقدیر کو پچھاڑ دیا
ہر ایک جبر کی بُنیاد کو اکھاڑ دیا
ہم اس کے دیپ خیالوں میں جب جلاتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں
اِس انقلاب کی پیامبر ہوائیں ہیں
اِس انقلاب کی باہوں میں یہ فضائیں ہیں
اِس انقلاب کے جب خواب ہم سجاتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں

❁

اے لخت لخت دیدۂ ورو

بٹے رہو گے تو اپنا یونہی بہے گا لہو
ہوئے نہ ایک تو منزل نہ بن سکے گا لہو
ہو کس گھمنڈ میں اے لخت لخت دیدہ ورو
تمھیں بھی قاتلِ محنت کشاں کہے گا لہو
اسی طرح سے اگر تم انا پرست رہے
خود اپنا راہنما آپ ہی بنے گا لہو
سنو تمھارے گریبان بھی نہیں محفوظ
ڈرو تمھارا بھی اک دن حساب لے گا لہو
اگر نہ عہد کیا ہم نے ایک ہونے کا
غنیم سب کا یونہی بیچتا رہے گا لہو
کبھی کبھی مرے بچے بھی مجھ سے پوچھتے ہیں
کہاں تک اور تو خشک اپنا ہی کرے گا لہو
سدا کہا یہی میں نے قریب تر ہے وہ دور
کہ جس میں کوئی ہمارا نہ پی سکے گا لہو

ایک یاد

کچے آنگن کا وہ گھر وہ بام و در
گاؤں کی پگڈنڈیاں وہ رہ گزر
وہ ندی کا سرمئی پانی شجر
جا نہیں سکتا بجا ان تک مگر
سامنے رہتے ہیں وہ شام و سحر

آئے سرِ عالم کئی غاصب کئی قاتل
ظلمت کہاں ٹھہری ہے اُجالوں کے مقابل
حق ہی نے کیے پار امنڈتے ہوئے دریا
باطل کو ملا ہے نہ ملے گا کبھی ساحل

اے مُدیرِ امن

اے مدیرِ امن تیرے شہر کو کیا ہوگیا
بجھ گئے بازار گلیوں میں اندھیرا ہوگیا

اِس دبستانِ ادب کو کھا گئی کس کی نظر
دیکھتے ہی دیکھتے اِک حشر برپا ہوگیا

ہو گئی دنیا ہماری اور بھی بے آسرا
اور بھی ہم بے کسوں کا خُون سستا ہوگیا

زندگی کے لب پہ آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سسکیاں لینے لگے سُر قتل نغمہ ہوگیا

❋

۲۴ جولائی ۱۹۸۷ء

بدبخت سیاستدانو

بدبخت سیاستدانو
شاہوں کے قصیدہ خوانو
ایران میں حشر بپا ہے
کچھ تم کو خوفِ خدا ہے
کب ظلم کو ظلم کہو گے
شیطان نما انسانو

بدبخت سیاستدانو
شاہوں کے قصیدہ خوانو
نیکسوں کی حمایت کب تک
لوگوں سے یہ نفرت کب تک
سورج کو نہ روک سکو گے
کب تک دیوار بنو گے
جس دور میں تم رہتے ہو
صرصر کو صبا کہتے ہو
کیوں دشمنِ جاں کو پل پل
دیتے ہو صدا نادانو!

بدبخت سیاستدانو!
شاہوں کے قصیدہ خوانو!

بے گھر ہیں فلسطیں والے
صحرا میں ہیں خیمے ڈالے
خطرے میں ہے امنِ عالم
حالات کا رُخ پہچانو

بدبخت سیاستدانو
شاہوں کے قصیدہ خوانو

امریکہ کے ایجنٹوں سے ملک بچانا ہے ہم کو
گلی گلی میں آزادی کا دیپ جلانا ہے ہم کو

جن کے کارن اپنے وطن میں گھر گھر آج اندھیارا ہے
اُن کالی دیواروں کو رستے سے ہٹانا ہے ہم کو

نوکرشاہی اصل میں پیارے انگریزوں کی لعنت ہے
اس انگریزی لعنت کا ہر نقش مٹانا ہے ہم کو

بیڑا غرق جو کر دے ساتھی اس امریکی بیڑے کا
بحرِ ہند میں اک ایسا طوفان اٹھانا ہے ہم کو

۱۹۷۱ء کے خوں آشام بنگال کے نام

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

(مشرقی پاکستان میں فوج کشی کے موقع پر)

جھکے گا ظلم کا پرچم یقین آج بھی ہے
مرے خیال کی دنیا حسین آج بھی ہے

بہت ہوائیں چلیں میرا رُخ بدلنے کو
مگر نگاہ میں وہ سرزمین آج بھی ہے

صعوبتوں کے سفر میں ہے کاروانِ حسین
یزید چین سے مسند نشین آج بھی ہے

لوگو

آخری رات ہے یہ سر نہ جھکانا لوگو
حسنِ ادراک کی شمعیں نہ بجھانا لوگو
انتہا ظلم کی ہو جائے وفا والوں پر
غیر ممکن ہے محبت کو مٹانا لوگو

وہ کہتے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے
سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے
میں بے شعور ہوں کہتا نہیں ستم کو کرم
یہی خطاب ملا ان کی انجمن سے مجھے
سپر جو شہ کی بنے غاصبوں کے کام آئے
خدا بچائے رکھے ایسے علم و فن سے مجھے

❋

بھیک نہ مانگو

پاکستان کی غیرت کے رکھوالو
بھیک نہ مانگو
توڑ کے اس کشکول کو آدمی کھالو
بھیک نہ مانگو

اپنے بل پر چلنا کب سیکھو گے
طوفانوں میں پلنا کب سیکھو گے
یہ کہنہ تقدیر کا شکوہ کب تک
اس کو آپ بدلنا کب سیکھو گے
خود اپنی بگڑی تقدیر بنالو
بھیک نہ مانگو

یہ جو راہ میں کالے ناگ کھڑے ہیں
کب یہ آزادی کی جنگ لڑے ہیں
جن کا آزادی میں خون ہے شامل
جب تک جیلوں میں وہ لوگ پڑے ہیں
وقت کٹھن ہے دیس کی آن بچالو
بھیک نہ مانگو

انگریزوں کے پنچھو کہلاؤنا
امریکہ کے تلوے سہلاؤنا
آج تلک ان کے دھوکے کھائے ہیں
اور مگر ان کے دھوکے کھاؤنا
آزادی کے سر پہ خاک نہ ڈالو
بھیک نہ مانگو

بھئے کبیر اداس

اک پٹری پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے
دوجا زلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پہ سوئے
راج سنگھاسن پر اک بیٹھا اور اک اس کا داس
بھئے کبیر اداس

اونچے اونچے ایوانوں میں مورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر اس نگری میں پنڈت دھکے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہے جن کے پاس
بھئے کبیر اداس

گیت لکھائیں پیسے نا دیں فلم نگر کے لوگ
اُن کے گھر باجے شہنائی لیکھک کے گھر سوگ
گائک سُر میں کیونکر گائے کیوں نا کاٹے گھاس
بھئے کبیر اداس

کل تک تھا جو حال ہمارا حال وہی ہے آج
جالب اپنے دیس میں سکھ کا کال ہی ہے آج
پھر بھی موچی گیٹ پہ لیڈر روز کریں بکواس
بھئے کبیر اُداس

❋

بیٹھا ہے

اثر اُس پر نہیں کچھ بھی یونہی وہ تن کے بیٹھا ہے
خدائی ساری کافر ہے وہ مومن بن کے بیٹھا ہے
وطن آدھا گیا آدھا پریشانی کی زد میں ہے
نہیں پروا اُسے اِس کی بغیرِ انجمن کے بیٹھا ہے

بیاد شاہ عبداللطیف بھٹائی

پچھلے دنوں جو بلوائیوں نے یہاں قیامت ڈھائی
اُس پر کیا کیا دل رویا ہے پوچھ نہ شاہ بھٹائی

اپنی اپنی سوچ ہے پیارے اپنا اپنا دل ہے
تو نے لیں قاتل کی بلائیں آنکھ مری بھر آئی

میں نے اتنی دور سے خوں بہنے کا شور سنا ہے
پاس ہی رہنے والوں تک کوئی آواز نہ آئی

یوسف کے قصے سے ہم کو یہ ادراک ہوا ہے
مال منال کے سب ہیں بندے کون کسی کا بھائی

تختِ و تاج کی افسوں کاری اندھا کر دیتی ہے
ہر سچ کی پہچان سے عاری ہوتی ہے دارائی

❋

بیس گھرانے

بیس گھرانے ہیں آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب زندہ باد

آج بھی ہم پر جاری ہے
کالی صدیوں کی بیداد
صدر ایوب زندہ باد

بیس روپیہ من آٹا
اس پر بھی ہے سناٹا
گوہر، سہگل، آدم جی
بنے ہیں برلا اور ٹاٹا
ملک کے دشمن کہلاتے ہیں
جب ہم کرتے ہیں فریاد
صدر ایوب زندہ باد

لائسنسوں کا موسم ہے
کنونشن کو کیا غم ہے
آج حکومت کے در پر
ہر شاہیں کا سر خم ہے
درسِ خودی دینے والوں کو
بھول گئی اقبال کی یاد
صدر ایوب زندہ باد

عام ہوئی غنڈہ گردی
چپ ہیں سپاہی باوردی
شمعِ نوائے اہلِ سخن
کالے باغ نے گل کر دی
اہلِ قفس کی قید بڑھا کر
کم کر لی اپنی میعاد
صدر ایوب زندہ با

یہ میثاقِ استنبول
کیا کھولوں میں اس کا پول
بجتا رہے گا محلوں میں
کب تک یہ بے ہنگم ڈھول
سارے عرب ناراض ہوئے ہیں
سیٹو اور سنٹو ہیں شاد
صدر ایوب زندہ باد

گلی گلی میں جنگ ہوئی
خلقت دیکھ کے دنگ ہوئی
اہلِ نظر کی ہر بستی
جہل کے ہاتھوں تنگ ہوئی
وہ دستور ہمیں بخشا ہے
نفرت ہے جس کی بنیاد
صدر ایوب زندہ باد

پاکستان کا مطلب کیا؟

روٹی، کپڑا اور دوا
گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت مجھے تعلیم دلا
میں بھی مسلماں ہوں واللہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہٰ الا اللہ . . .

امریکہ سے مانگ نہ بھیک
مت کر لوگوں کی تضحیک
روک نہ جمہوری تحریک
چھوڑ نہ آزادی کی راہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہٰ الا اللہ . . .

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہٰ الا اللہ . . .

سرحد، سندھ، بلوچستان
تینوں ہیں پنجاب کی جان
اور بنگال ہے سب کی آن
آئے نہ ان کے لب پہ آہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہٰ الا اللہ . . .

بات یہی ہے بنیادی
گوں کو ہو آزادی
غاصب کی ہو بربادی
حق کہتے ہیں حق آگاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہٰ الا اللہ . . .

پسِ دیوارِ زنداں

اپنی آہوں کا ستم گر پہ اثر ہونے تک
ہم کو جلنا ہے یونہی رات بسر ہونے تک

صرف سودا ہی ضروری نہیں دیوانوں میں
سر بھی درکار ہے دیوار کو در ہونے تک

ترانہ

اب دہر میں بے یار و مددگار نہیں ہم
پہلے کی طرح بے کس و لاچار نہیں ہم

آتا ہے ہمیں اپنے مقدر کو بنانا
تقدیر پہ شاکر پسِ دیوار نہیں ہم

تم ظلم کیے جاؤ خدا ہی رہو اپنے
ساتھی ہیں برابر کے پرستار نہیں ہم

سب جور و ستم لطف و کرم پیشِ نظر ہیں
یہ وہم تمھارا ہے کہ بیدار نہیں ہم

کیوں دستِ نگر ہو کے جئیں برسرِ عالم
ذی عقل ہیں ذی علم ہیں بیمار نہیں ہم

ایمان خدا پر ہے محمد پہ یقیں ہے
لیکن یہ بجا واقفِ اسرار نہیں ہم

ترانۂ دوستی

پاک رُوس دوستی زندگی زندگی
پاک رُوس دوستی روشنی روشنی
پاک رُوس دوستی زندہ باد

چھٹے گی جان جنگ سے
بچیں گے بھوک ننگ سے
کھِلے گا چہرۂ وطن
محبتوں کے رنگ سے
ہوا کے انگ انگ میں
بجیں گے جلترنگ سے
منتظر ہے دیر سے
یہ زمین امن کی

پاک رُوس دوستی زندگی زندگی
پاک رُوس دوستی روشنی روشنی
پاک رُوس دوستی زندہ باد

نہ آئے گا کہیں نظر
عدوئے جاں نظامِ زر
رہیں گے دُور خوف سے
ہمارے گھر ہمارے در
بجے گا عزّ و شان سے
مرے وطن کا ہر بشر
رہ نہ پائے گی یہاں
بے کسی و مفلسی

پاک رُوس دوستی زندگی زندگی
پاک رُوس دوستی روشنی روشنی
پاک رُوس دوستی زندہ باد

نہ لُٹ سکیں گی محنتیں
نہ بِک سکیں گی حسرتیں
امیرِ اس دیار کے
نہ دے سکیں گے ذِلتیں
نصیب میں یہ سنگدل
نہ لکھ سکیں گے ظُلمتیں
دیکھنا ستم زدو
غم کی رات اب ڈھلی

پاک رُوس دوستی زندگی زندگی
پاک رُوس دوستی روشنی روشنی
پاک رُوس دوستی زندہ باد

تیرے ہونے سے

دل کی کونپل ہری تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

کشت زاروں میں تو، کارخانوں میں تو
ان زمینوں میں تو، آسمانوں میں تو

شعر میں، نثر میں، داستانوں میں تو
شہر و صحرا میں تو اور چٹانوں میں تو

حسن صورت گری تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

تجھ سے ہے آفرینش، نمو، ارتقا
تجھ سے ہیں قافلے، راستے، رہنما

تو نہ ہوتی تو کیا تھا چمن، کیا صبا
کیسے کٹتا سفر درد کا یاس کا

آس کی روشنی تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

خوف و نفرت کی ہر حد مٹانے نکل
عقل و دانش کی شمعیں جلانے نکل

زیر دستوں کی ہمت بندھانے نکل
ہم خیال اور اپنے بنانے نکل

لب کشا بے کسی تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

❋

تیز چلو

یہ کہہ رہا ہے دلِ بیقرار تیز چلو
بہت اُداس ہیں زنجیر و دار تیز چلو

جو تھک گئے ہیں انہیں گردِ راہ رہنے دو
کسی کا اب نہ کرو انتظار تیز چلو

خزاں کی شام کہاں تک رہے گی سایہ فگن
بہت قریب ہے صبحِ بہار تیز چلو

ہمی سے خوف زدہ ہیں زمین و زر والے
ہمی ہو چشمِ ستم گر پہ بار تیز چلو

کرو خلوص و محبت کو رہنما اپنا
نہیں درست دلوں میں غبار تیز چلو

بہت ہیں ہم میں یہاں لوگ گفتگو پیشہ
ہے اُن کا صرف یہی کاروبار تیز چلو

خرد کی سست روی سے کیسے ملی منزل
جنوں ہی اب تو کرو اختیار تیز چلو

❋

جاگ مرے پنجاب

جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
ٹوٹ چلے سب خواب کہ پاکستان چلا

سندھ بلوچستان تو کب سے روتے ہیں
اور اہلِ پنجاب ابھی تک سوتے ہیں

آنکھیں ہیں پُر آب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

جن کو ذات کا غم ہے کب وہ مانے ہیں
بے بس لوگوں پر بندوقیں تانے ہیں

قاتل ہیں اسباب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

آگ کی بارش سے ہے گلشن دھواں دھواں
روش روش اب کلیوں کی مہکار کہاں

سپنا ہوئے گلاب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

زُعم ہے یہ بلوائیوں کو ہم جیتیں گے
اور کہوں میں دُکھ کے یہ دن بیتیں گے

جام ہوئے زہراب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

افسردہ غزلیں گریاں افسانے ہیں
حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ویرانے ہیں

دریا ہوئے سراب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

اِنہی چلن سے ہم سے جدا بنگال ہوا
پوچھ نہ اس دکھ سے جو دل کا حال ہوا

روکو یہ سیلاب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

جمہوریت

دس کروڑ انسانو!
زندگی سے بیگانو!

صرف چند لوگوں نے   حق تمہارا چھینا ہے
خاک ایسے جینے پر   یہ بھی کوئی جینا ہے
بے شعور بھی تم کو   بے شعور کہتے ہیں
سوچتا ہوں یہ ناداں   کس ہوا میں رہتے ہیں
اور یہ قصیدہ گو   فکر ہے یہی جن کو
ہاتھ میں علم لے کر   تم نہ اُٹھ سکو لوگو
کب تلک یہ خاموشی   چلتے پھرتے زندانو

دس کروڑ انسانو!

یہ ملیں یہ جاگیریں   کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں   کس کے بل پہ جیتی ہیں
کس کی محنتوں کا پھل   داشتائیں کھاتی ہیں
جھونپڑوں سے رونے کی   کیوں صدائیں آتی ہیں
جب شباب پر آکر   کھیت لہلہاتا ہے
کس کے نین روتے ہیں   کون مسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو   کاش تم کبھی جانو

دس کروڑ انسانو!

علم و فن کے رستے میں   لاٹھیوں کی یہ باڑیں
کالجوں کے لڑکوں پر   گولیوں کی بوچھاڑیں

یہ کراچی کے غنڈے یادگارِ شب دیکھو
کس قدر بھیانک ہے ظلم کا یہ ڈھب دیکھو
رقصِ آتشِ و آہن دیکھتے ہی جاؤ گے
دیکھتے ہی جاؤ گے ہوش میں نہ آؤ گے

اے خموش طوفانو!
دس کروڑ انسانو!

سینکڑوں حسن ناصر ہیں شکارِ نفرت کے
صبح و شام لٹتے ہیں قافلے محبت کے
جب سے کالے باغوں نے آدمی کو گھیرا ہے
مشعلیں کرو روشن دور تک اندھیرا ہے
میرے دیس کی دھرتی پیار کو ترستی ہے
پتھروں کی بارش ہی اس پہ کیوں برستی ہے
ملک کو بچاؤ بھی ملک کے نگہبانو

دس کروڑ انسانو!

بولنے پہ پابندی سوچنے پہ تعزیریں
پاؤں میں غلامی کی آج بھی ہیں زنجیریں
آج حرفِ آخر ہے بات چند لوگوں کی
دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
اٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی
جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی
دوستوں کو پہچانو دشمنوں کو پہچانو

دس کروڑ انسانو!

جواں آگ

گولیوں سے یہ جواں آگ نہ بجھ پائے گی
گیس پھینکو گے تو کچھ اور بھی لہرائے گی

یہ جواں آگ جو ہر شہر میں جاگ اٹھی ہے
تیرگی دیکھ کے اس آگ کو بھاگ اٹھی ہے

کب تلک اس سے بچاؤ گے تم اپنے داماں
یہ جواں آگ جلا دے گی تمھارے ایواں

یہ جواں خون بہایا ہے جو تم نے اکثر
یہ جواں خون نکل آیا ہے بن کے لشکر

یہ جواں خون سیہ رات نہ رہنے دے گا
دکھ میں ڈوبے ہوئے حالات نہ رہنے دے گا

یہ جواں خون ہے محلوں پہ لپکتا طوفاں
اس کی یلغار سے ہر اہلِ ستم ہے لرزاں

یہ جواں فکر تمھیں خون نہ پینے دے گی
غاصبو! اب نہ تمھیں چین سے جینے دے گی

قاتلو! راہ سے ہٹ جاؤ کہ ہم آتے ہیں
اپنے ہاتھوں میں لیے سرخ علم آتے ہیں

توڑ دے گی یہ جواں فکر حصارِ زنداں
جاگ اُٹھے ہیں مرے دیس کے بے کس انساں

❋

۱۴ اگست

کہاں ٹوٹی ہیں زنجیریں ہماری
کہاں بدلی ہیں تقدیریں ہماری

وطن تھا ذہن میں زنداں نہیں تھا
چمن خوابوں کا یوں ویراں نہیں تھا

بہاروں نے دیئے وہ داغ ہم کو
نظر آتا ہے مقتل باغ ہم کو

گھروں کو چھوڑ کر جب ہم چلے تھے
ہمارے دل میں کیا کیا ولولے تھے

یہ سوچا تھا ہمارا راج ہوگا
سرِ محنت کشاں پر تاج ہوگا

نہ لوٹے گا کوئی محنت کسی کی
ملے گی سب کو دولت زندگی کی

نہ چاٹیں گی ہمارا خوں مشینیں
بنیں گی رشکِ جنت یہ زمینیں

کوئی گوہر کوئی آدم نہ ہوگا
کسی کو رہزنوں کا غم نہ ہوگا

لٹی ہر گام پر اُمید اپنی
محرّم بن گئی ہر عید اپنی

مسلط ہے سروں پر رات اب تک
وہی ہے صورتِ حالات اب تک

خوشی ہے چند لوگوں کی وراثت
کہا جاتا ہے غم ہیں اپنی قسمت

ہوئے ہیں جھونپڑے ہی نذرِ طوفاں
مگر قائم ہیں اب تک قصر و ایواں

خدایا کوئی آندھی اس طرف بھی
الٹ دے ان کلہداروں کی صف بھی

زمانے کو جلال اپنا دکھا دے
جلا دے تخت و تاج ان کے جلا دے

ہے اب تک پا بجولاں خطۂ پاک
پڑی آزادیوں کے سر پہ ہے خاک

ستارہ اوج پر ہے رہزنوں کا
نہیں پرساں کوئی خستہ تنوں کا

نہیں وقعت کسی اہلِ نظر کی
عبادت ہو رہی ہے سیم وزر کی

خوشامد کا صلہ تمغائے خدمت
خوشامد سے ملے بغلوں کو عزت

خوشامد جو کرے فن کار ہے وہ
جو سچ بولے یہاں غدار ہے وہ

لبِ اہلِ قلم پر ہیں قصیدے
دکاں تکیانی کی ہیں یا جریدے

ثنا بندوں کی ہم سنتے ہیں اکثر
خدا سے بھی زیادہ ریڈیو پر

ادیب و شاعر و ملّا و رہبر
سبھی کچھ ہو گیا ڈپٹی کمشنر

ادیبوں کو ہے آدم جی نے گھیرا
چٹانوں پر کہاں ان کا بسیرا

ادب میں اب کہاں دل کا اجالا
ادیبوں نے قلم کو بیچ ڈالا

ہیں باہر بانیاں سازندے اندر
یہ سب غنڈوں کے ہیں کانٹے اندر

ابھی غنڈے تو ہیں محلوں میں آباد
کریں گے ہم وطن کو ان سے آزاد

کریں گے ضبط ہم جاگیران کی
نہ چلنے دیں گے ہم تدبیران کی

یہ دولت کی ہوس، جاگیرداری
ہیں دونوں لعنتیں دشمن ہماری

یہ دونوں لعنتیں جب تک رہیں گی
جہاں میں ندیاں خوں کی بہیں گی

❋

بہتے لہو میں سب ترا مفہوم بہہ گیا
۱۴ اگست صرف ترا نام رہ گیا

جلنا ہے غم کی آگ میں، ہم کو تمام شب
بجھتا ہوا چراغِ سرِ شام کہہ گیا

ہمتا اگر پہاڑ تو لاتا نہ تابِ غم
جو رنج اس نگر میں یہ دل ہنس کے سہہ گیا

گذرے ہیں اس دیار میں یوں اپنے روز و شب
خورشید بجھ گیا کبھی مہتاب گہہ گیا

مجھ سے خفیف ہیں مرے ہم عصر اس لیے
میں داستانِ عہدِ ستم کھل کے کہہ گیا

شاعر حضورِ شاہ سبھی سر کے بل گئے
جالب ہی اس گناہ سے بس دور رہ گیا

❋

حسبِ فرمائش

میں تجھے پھول کہوں اور کہوں بھونروں سے
"آؤ اس پھول کا رس چوس کے ناچو جھومو"
میں تجھے شمع کہوں اور کہوں "پروانو!
آؤ اس شمع کے ہونٹوں کو خوشی سے چومو"

میں تری آنکھ کو تشبیہ دوں میخانے سے
اور خود زہرِ جدائی کا طلب گار رہوں
غیر سوئے تری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں
اور میں چاندنی راتوں میں فقط شعر کہوں

مجھ سے یہ تیرے قصیدے نہ لکھے جائیں گے
مجھ سے تیرے لیے غزلیں نہ کہی جائیں گی
یاد میں تیری میں سلگا نہ سکوں گا آنکھیں
سختیاں درد کی مجھ سے نہ سہی جائیں گی

شہر میں ایسے مصوّر ہیں جو سکوں کے عوض
حسن میں لیلیٰ و عذرا سے بڑھا دیں گے تجھے
طول دے کر تری زلفوں کو شبِ غم کی طرح
فن کے اعجاز سے ناگن سی بنا دیں گے تجھے

تجھ کو شہرت کی ضرورت ہے محبت کی مجھے
اے حسینہ تری منزل مری منزل میں نہیں
ناچ گھر تیری نگاہوں میں ہیں رقصاں لیکن
اس تعیش کی تمنائیں مرے دل میں نہیں

دیکھ کے غیر کے پہلو میں تجھے رقص کناں
بھیگ جاتی ہے مری آنکھ سرشکِ غم سے
مجھ کو برسوں کی غلامی کا خیال آتا ہے
جس نے اندازِ وفا چھین لیا ہے ہم سے

مجھ کو بھونرا نہ سمجھ، مجھ کو پتنگا نہ سمجھ
مجھ کو انسان سمجھ میری صداقت نہ کچل
تیری تفریح کا ساماں نہ بنوں گا ہرگز
میری دنیا ہے یہی میری محبت نہ کچل

خدا ہمارا ہے

خدا تمھارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

لہو پیو گے کہاں تک ہمارا دھنوانو
بڑھاؤ اپنی دکاں سیم و زر کے دیوانو
نشاں کہیں نہ رہے گا تمھارا شیطانو
ہمیں یقین ہے کہ انسان کو پیارا ہے
خدا تمھارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

نئے شعور کی ہے روشنی نگاہوں میں
اک آگ سی بھی ہے اب اپنی سرد آہوں میں
کھلیں گے پھول نظر کے سحر کی بانہوں میں
دکھے دلوں کو اسی آس کا سہارا ہے
خدا تمھارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

طلسم سایۂ خوف و ہراس توڑیں گے
قدم بڑھائیں گے زنجیر یاس توڑیں گے
کبھی کسی کے نہ ہم دل کی آس توڑیں گے
رہے گا یاد جو عہد ستم گزارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

❋

خدایا یہ مظالم بے گھروں پر

خدایا یہ مظالم بے گھروں پر
کوئی بجلی گرا فتنہ گروں پر

یہ لٹے اہل جور یہ ظالم لٹیرے
مسلط جانے کب سے ہیں سروں پر

یہ خوں بچوں کا اور ماؤں کا خوں ہے
پڑا ہے جو سروں کی چادروں پر
خوش و خرم نشہ و شہزادگاں ہیں
ہر آفت ٹوٹتی ہے بے زروں پر
ثنا خواں اب بھی ہیں جو قاتلوں کے
خدایا رحم ان دانشوروں پر

❋

خطرے میں اسلام نہیں

خطرہ ہے زرداروں کو
گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو
خطرہ میں اسلام نہیں

ساری زمیں کو گھیرے ہوئے ہیں آخر چند گھرانے کیوں
نام نبی کا لینے والے الفت سے بیگانے کیوں

خطرہ ہے خونخواروں کو
رنگ برنگی کاروں کو
امریکہ کے پیاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں

آج ہمارے نعروں سے لرزہ ہے بپا ایوانوں میں
بک نہ سکیں گے حسرت و ارماں اونچی سجی دکانوں میں

خطرہ ہے بٹ ماروں کو
مغرب کے بازاروں کو
چوروں کو مکاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں

امن کا پرچم لے کر اٹھو ہر انساں سے پیار کرو
اپنا تو منشور ہے جالب سارے جہاں سے پیار کرو

خطرہ ہے درباروں کو
شاہوں کے غمخواروں کو
نوابوں غداروں کو
خطرے میں اسلام نہیں

دادا امیر حیدر

نہیں ہے کوئی بھی داغِ سجدہ تری جبیں پر
ڈٹا رہا عرصۂ وفا میں تُو زندگی بھر
کھڑے ہیں ساحل پہ ہم سمندر کا تُو شناور
میں اپنی عزت بڑھا رہا ہوں ترے لئے چند شعر کہہ کر
عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

عذاب ہے اپنی سادہ لوحی
لبوں پہ رہتی ہے بات دِل کی
زمانہ کہتا ہے اُس کو مانوں
نہیں جھلک جس میں کوئی تیری
منافقوں میں گھِرا ہوا ہوں
کدھر سے نکلوں میں ان سے بچ کر
عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

زبان و دِل مختلف نہیں ہیں
کہا جو تُو نے وہی کیا ہے
کہاں کوئی اِس طرح جیا ہے
کہاں کوئی باضمیر تجھ سا
تُو وہ نوا ہے دبا نہ پایا
جسے جہاں میں کوئی ستمگر
عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

*

داستانِ دلِ دو نیم

اک حسیں گاؤں تھا کنارِ آب
کتنا شاداب تھا دیارِ آب

کیا عجب بے نیاز بستی تھی
مفلسی میں بھی ایک مستی تھی

کتنے دلدار تھے ہمارے دوست
وہ بچارے وہ بے سہارے دوست

اپنا اک دائرہ تھا دھرتی تھی
زندگی چین سے گذرتی تھی

قصہ جب یوسف و زلیخا کا
میٹھے میٹھے سُروں میں چھڑتا تھا

قصر شاہوں کے ہلنے لگتے تھے
چاک سینوں کے سلنے لگتے تھے

گیت سنتے تھے گیت گاتے تھے
ڈوب کر سُر میں دن بِتاتے تھے

یوں بھڑک اٹھی نفرتوں کی آگ
زندگی میں رہے وہ رنگ نہ راگ

دیکھنے کیا لگے سہانے خواب
ہو گئے اپنے آشیانے خواب

یہ بجا زیست پا پیادہ تھی
دھوپ سے چھاؤں تو زیادہ تھی

شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے ہوئے
دربدر اُس گلی سے آ کے ہوئے

اجنبی لوگ اجنبی راہیں
لب پہ آباد ہو گئیں آہیں

ہوئے آقا فرنگیوں کے غلام
شبِ آلام ہو سکی نہ تمام

ہو گئے حکمراں کمینے لوگ
خاک میں مل گئے نگینے لوگ

ہر محبِ وطن ذلیل ہوا
رات کا فاصلہ طویل ہوا

بے حیائی کو جس نے اپنایا
وہی عزت مآب کہلایا

آمروں کے جو گیت گاتے رہے
وہی انعام و داد پاتے رہے

رہزنوں نے جو رہزنی کی تھی
رہبروں نے بھی کیا کمی کی تھی

ایک بار اور ہم ہوئے تقسیم
ایک بار اور دل ہوا دو نیم

ہو گئے دور راہبر کیا کیا
چھن گئے ہائے ہم سفر کیا کیا

یہ فسانہ ہے پاسبانوں کا
چاق و چوبند نوجوانوں کا

سرحدوں کی نہ پاسبانی کی
ہم سے ہی داد لی جوانی کی

اس زمانے کی کیا لکھوں روداد
خوف، مہنگائی، جبر و استبداد

اب کمشنر زکوٰۃ دیتے ہیں
اور ٹی۔ وی پہ داد لیتے ہیں

بھیک سے ملک بھی چلے ہیں کبھی
زندہ قوموں کا یہ شعار نہیں

اک نظر اپنی زندگی پر ڈال
اک نظر اپنے اردلی پر ڈال

فاصلہ خود ہی کر ذرا محسوس
یوں نہ اسلام کا نکال جلوس

یہ زمیں تو حسین ہے بے حد
حکمرانوں کی نیتیں ہیں بد

حکمراں جب تلک ہیں یہ بے درد
اس زمیں کا رہے گا چہرہ زرد

یہ زمیں جب تلک نہ لیں گے ہم
اس سے اُگتے رہیں گے یونہی غم

بے گھری کو کریں گے ہم ہی دور
ہم ہی دیں گے دلوں کو پیار کا نور

خلق صدیوں کے ظلم کی ماری
یوں نہ حیراں پھرے گی بے چاری

روٹی کپڑا مکان ہم دیں گے
اہلِ محنت کو شان ہم دیں گے

اس خزاں کو مٹائیں گے ہم ہی
فصلِ گل لے کے آئیں گے ہم ہی

❋

دستور

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لیکر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے، تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے، تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے، تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو، ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمھارا فسوں
چارہ گر میں تمھیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے، مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

رخصتی کا گیت

جب تو جائے گی گھر اپنے
یاد آئیں گے سندر سپنے
دھڑکن لگ جائے گی جپنے
بیتی برساتوں کی مالا
جادوگر راتوں کی مالا

بیٹھے بیٹھے کھو جائے گی
خاموشی کے صحراؤں میں
اک ہلچل سی مچ جائے گی
سہمی سہمی آشاؤں میں

ناتھ آئیں گے پیار جتانے
روٹھی ہوئی رادھا کو منانے
دل کا درد کوئی کیا جانے

سونے کی دنیا میں رہ کر
پیلی پیلی ہو جائے گی
بھیگی بھیگی سی آنکھوں میں
پل چھن سرسوں لہرائے گی

پیڑوں کی وہ ٹھنڈی چھاؤں
سندر سکھیاں پنگھٹ گاؤں
چھن چھن پائل ننگے پاؤں

❋

رخشندہ زوبا سے

(۱۳ اپریل [illegible] جیل کی ایک ملاقات پر)

کہہ نہیں سکتی پر کہتی ہے
مجھ سے میری ننھی بچی
ابو گھر چل
ابو گھر چل
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
کیوں زنداں میں رہ جاتا ہوں
کیوں نہیں ساتھ میں اُس کے چلتا
کیسے ننھی کو سمجھاؤں
گھر بھی تو زنداں کی طرح ہے

(کوٹ لکھپت جیل)

رخصتی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

وہ سلگتا دیا تو سحر کی کرن
سوچتا ہوں یہی کیسے بہلے گا من
دھڑکنوں کو سکوں کیسے بخشے گا دھن
لوگ تجھ کو کہیں گے نصیبوں جلی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سحر
اب کہاں کہکشاں وہ حسیں رہگزر
شامِ غم چھائی ہے دیکھتا ہوں جدھر
کتنی ویران ہے آج تیری گلی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

❋

روئے بھگت کبیر

*پوچھ نہ کیا لاہور میں دیکھا ہم نے میاں نظیر
پہنیں سوٹ انگریزی بولیں اور کہلائیں میر
چودھریوں کی مٹھی میں ہے شاعر کی تقدیر
روئے بھگت کبیر

اک دوجے کو جاہل سمجھیں نٹ کھٹ بدھی وان
میٹرو میں جو چائے پلائے بس وہ باپ سمان
سب سے اچھا شاعر وہ ہے جس کا یار مدیر
روئے بھگت کبیر

سڑکوں پر بھوکے پھرتے ہیں شاعر موسیقار
ایکٹرسوں کے باپ لیے پھرتے ہیں موٹر کار
فلم نگر تک آ پہنچے ہیں سید پیر فقیر
روئے بھگت کبیر

لال دین کی کوٹھی دیکھی رنگ بھی جس کا لال
شہر میں رہ کر خوب اڑائے دہقانوں کا مال
اور کہے اجداد نے بخشی مجھ کو یہ جاگیر
روئے بھگت کبیر

جس کو دیکھو لیڈر ہے اور جس سے ملو وکیل
کسی طرح بھرتا ہی نہیں ہے پیٹ ان کا جھیل
مجبوراً سننا پڑتی ہے ان سب کی تقریر
روئے بھگت کبیر

حلقے میں اتوار منایا
ان کا ہے انداز پرانا*
نئی ادائیں نیا زمانا
منٹو کا سننے افسانا اکثر پہنے نیکر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

ناک پہ چشمہ سا اٹکائے
گردن میں ٹائی لٹکائے
انگلش لٹریچر کو کھائے
اردو لٹریچر پر ہائے کالج دینے لیکچر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے
محفل سے جو اٹھ کر جائے کہلائے وہ بور
اپنی مسجد کی تعریفیں باقی جوتے چور
اپنا جھنگ بھلا ہے پیارے جہاں ہماری ہیر
روئے بھگت کبیر

❋

ریفرینڈم

شہر میں ہُو کا عالم تھا
جن تھا یا ریفرینڈم تھا

قید تھے دیواروں میں لوگ
باہر شور بہت کم تھا

کچھ بارش سے چہرے تھے
اور ایمان کا ماتم تھا

مرحومین شریک ہوئے
سچائی کا چہلم تھا

دن اُنیس دسمبر کا
بے معنی بے ہنگم تھا

یا وعدہ تھا حاکم کا
یا اخباری کالم تھا

❋

ریگن

ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا
رہبر ہے یہ دنیا کے ہر رہزن کا

اسرائیل کی پُشت پہ بھی ہے ہاتھ یہی
بانٹتا پھرتا ہے جنگی آلات یہی
سکھ لُوٹا ہے اس نے آنگن آنگن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا

روشنیوں سے لڑنا اس کی عادت ہے
ظلم سے اس کو پیار ہے پیار سے نفرت ہے
اس کو کھیل پسند ہے آتش و آہن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا

ہوش کا دامن کب تک چھوڑے رکھو گے
موت سے کب تک ناطہ جوڑے رکھو گے
آؤ دکھاؤں تم کو رستہ جیون کا
رہبر ہے یہ دنیا کے ہر رہزن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا

❋

سفید بنیا

قرض دے کر غریب ملکوں کو
چھین لیتا ہے روحِ آزادی
آج زیرِ عتاب ہے اس کے
ہر بڑا شہر ہر حسیں وادی

مدتوں سر اٹھا کے چل نہ سکا
اس کے کھاتے میں جس کا نام آیا
صاف دامن بچا گیا ہم سے
جب بھی مشکل کوئی مقام آیا

بحرِ ہند آج تیری موجیں بھی
اس کی توپوں کے سائے میں ہیں خموش
کوئی طوفان کیوں نہیں اٹھتا
کیا ہوا آج تیرا جوش و خروش

"سرِ مقتل" کی ضبطی پر

مرے ہاتھ میں قلم ہے مرے ذہن میں اُجالا
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا

مجھے فکرِ امنِ عالم تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

سلام لوگو!

سلام اے دل فگار لوگو
سلام اے اشکبار لوگو

تمہی نے اپنا وطن بچایا   تمہی نے باطل کا سر جھکایا
بجھا کے شمعِ حیات اپنی   وفا کی راہوں کو جگمگایا
مگر یہ دل رو کے کہہ رہا ہے   لہو تمہارا نہ رنگ لایا

وہی ہے شب کا حصار لوگو
سلام اے اشکبار لوگو

گلوں کی وادی لہو لہو ہے   فغاں کی آواز چار سُو ہے
ہیں اس قدر تشنہ کام میکش   ہر ایک لب پر سبُو سبُو ہے
نشانِ منزل ہے کھویا کھویا   لُٹا لُٹا شہرِ آرزو ہے

بجھے بجھے ہیں دیار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو!

تمہارے دم سے ہری زمینیں   خوشی سے دامن بھری مشینیں
ہیں اس کے باوصف بھیگی بھیگی   تمہاری اشکوں سے آستینیں
میں سوچتا ہوں رہیں گی کب تک   ستم کے آگے جھکی جبینیں

اُٹھا دو سر سوگوار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو!

❋

سو جا

سو گیا شہر تو بھی اب سو جا
آپ ڈھل جائے گی یہ شب سو جا
سو گئے خامشی بتاتی ہے
جاگنے والے سب کے سب سو جا

❋

شبِ الم کا سفر

کیا ہے صرف بہر گام خونِ قلب و جگر
بُھلا سکے گی نہ ہم کو طلب کی راہ گزر

کہاں تمام ہوا ہے شبِ الم کا سفر
ابھی تو دور بہت دور ہے طلوعِ سحر

نہ اپنے لب پہ فغاں ہے نہ اپنی آنکھ ہی تر
ہمارے درد کی پھر بھی ہے اک جہاں کو خبر

اسے بجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغِ سحر

جگر کا خون ہوا دل بھی ہو گیا چھلنی
مگر ملال نہیں ہے ذرا بھی چہرے پر

ضرور ان کے قدم لیں گی منزلیں اک دن
کہ ایک عمر سے اہلِ جنوں ہیں محوِ سفر

وہی ہوئے ہیں سرافراز دہر میں اے دوست
کٹا گئے ہیں رہِ عشق میں جو اپنے سر

سلام دیس کے جمہوریت پسندوں کو
جو سب کے حق کے لیے لڑ رہے ہیں شام و سحر

ق

ہیں انقلاب کے ذاکر بہت زمانے میں
حکایتیں نہ سنا عیشِ گفتگو سے گزر

نظر اُٹھا کے جہاں کو بھی دیکھ اے جالب
عمل کی سمت بھی آ شعر و شاعری ہی نہ کر

❋

شکوہ نہ کر

کیا ہے عشق تو شکوہ نہ کر زمانے کا
بیاں ہوا تو گیا حسن اس فسانے کا

سزا کے طور پہ ہم کو ملا قفس جالب
بہت تھا شوق ہمیں آشیاں بنانے کا

❋

سچ ہی لکھتے جانا

دینا پڑے کچھ بھی ہرجانہ سچ ہی لکھتے جانا
مت گھبرانا مت ڈر جانا، سچ ہی لکھتے جانا

باطل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی بجھ پائیں
وہ شمعیں روشن کر جانا سچ ہی لکھتے جانا

پل دو پل کے عیش کی خاطر کیا دبنا کیا جھکنا
آخر سب کو ہے مرجانا سچ ہی لکھتے جانا

لوحِ جہاں پر نام تمھارا لکھا رہے گا یونہی
جالبؔ سچ کا دم بھر جانا سچ ہی لکھتے جانا

❀

شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں

اے نظامِ کہن کے فرزندو
اے شبِ تار کے جگر بندو

یہ شبِ تار جاوداں تو نہیں
یہ شبِ تار جانے والی ہے
تابکے تیرگی کے افسانے
صبحِ نو مسکرانے والی ہے

اے شبِ تار کے جگر گوشو
اے سحر دشمنو ستم کوشو

صبح کا آفتاب چمکے گا
ٹوٹ جائے گا جہل کا جادو
پھیل جائے گی ان دیاروں میں
علم و دانش کی روشنی ہر سو

اے شبِ تار کے نگہبانو
شمعِ عہدِ زیاں کے پروانو
شہرِ ظلمات کے ثنا خوانو
شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں
اور کچھ دیر صبح پر ہنس لو
اور کچھ دیر کوئی بات نہیں

❀

صحافی سے

قوم کی بہتری کا چھوڑ خیال
فکرِ تعمیرِ ملک دل سے نکال،
تیرا پرچم ہے تیرا دستِ سوال
بے ضمیری کا اور کیا ہو مآل،
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

تنگ کر دے غریب پر یہ زمیں
خم ہی رکھ آستانِ زر پہ جبیں
عیب کا دور ہے ہُنر کا نہیں
آج حُسنِ کمال کو ہے زوال،
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

کیوں یہاں صبحِ نو کی بات چلے
کیوں ستم کی سیاہ رات ڈھلے
سب برابر ہیں آسماں کے تلے
سب کو رجعت پسند کہہ کر ٹال،
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

نام سے پیشتر لگا کے امیر
ہر مسلمان کو بنا کے فقیر
قصر و ایواں میں ہو قیام پذیر
اور خطبوں میں دے عمرؓ کی مثال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال،

آمریت کی ہم نوائی میں
تیرا ہمسر نہیں خدائی میں
بادشاہوں کی رہنمائی میں،
روز اسلام کا جلوس نکال،

لاکھ ہونٹوں پہ دم ہمارا ہو
اور دِل صبح کا ستارا ہو
سامنے موت کا نظارا ہو
لکھ یہی ٹھیک ہے مریض کا حال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

❋

طلبہ کے نام

افسوس تمہیں کار کے شیشے کا ہوا ہے
پروا نہیں اک ماں کا جو دل ٹوٹ گیا ہے
ہوتا ہے اثر تم پہ کہاں نالۂ غم کا
برہم جو ہوئی بزمِ طرب اس کا گلا ہے
فرعون بھی نمرود بھی گزرے ہیں جہاں میں
رہتا ہے یہاں کون یہاں کون رہا ہے
تم ظلم کہاں تک تہِ افلاک کرو گے
یہ بات نہ بھولو کہ ہمارا بھی خدا ہے
آزادیٔ انساں کے وہیں پھول کھلیں گے
جس جا پہ ظہیرؔ* آج ترا خون گرا ہے
تا چند رہے گی یہ شبِ غم کی سیاہی
رستہ کوئی سورج کا کہیں روک سکا ہے
تو آج کا شاعر ہے تو کر میری طرح بات
جیسے مرے ہونٹوں پہ مرے دل کی صدا ہے

* دورِ ایوبی میں شہید ہونے والا ایک طالب علم

گھیراؤ

صدیوں سے گھیراؤ میں ہم تھے ہمیں بچانے کوئی نہ آیا
کچھ دن ہم نے گھیرا ڈالا، ہر ظالم نے شور مچایا
پھر ہم نے زنجیریں پہنیں ہر سُو پھیلا چپ کا سایا

پھر توڑیں گے ہم زنجیریں ہر لب کو آزاد کرینگے
جان پہ اپنی کھیل کے پھر ہم شہرِ وفا آباد کرینگے
آخر کب تک چند گھرانے لوگوں پر بیداد کرینگے

صدا تو دے

زمیں پہ ہیں کہ سرِ آسماں ہیں اے دنیا
ہمارا ذکر بھی کر ہم کہاں ہیں اے دنیا

تو مسکرائے سدا چین سے رہے آباد
ترے سکوں کے لیے ہی رواں ہیں اے دنیا

ترے چمن کی بہاروں کے ہم محافظ ہیں
ہمیں نہ بھول ترے پاسباں ہیں اے دنیا

ہے تجھ پہ چھائی ہوئی موت کی خموشی کیوں
صدا تو دے تیرا نام و نشاں ہیں اے دنیا

❋

صدرؔ امریکہ نہ جا

ایک ہی نعرہ ہے سب کا ایک ہی سب کی صدا
صدرؔ امریکہ نہ جا اے صدرؔ امریکہ نہ جا

سودا بازوں، سود خواروں سے ہماری دوستی
کس قدر توہین ہے یہ لفظِ پاکستان کی

موت سے بدتر ہے ہم کو بھیک کی یہ زندگی
پاؤں پر اپنے کھڑا ہو وقت ہے پیارے یہی

جانسن کی اب نہ سن اے جان اپنا کر بھلا
صدرؔ امریکہ نہ جا اے صدر امریکہ نہ جا

❋

ضابطہ

یہ ضابطہ ہے کہ باطل کو مت کہوں باطل
یہ ضابطہ ہے کہ گرداب کو کہوں ساحل

یہ ضابطہ ہے بنوں دست و بازوئے قاتل
یہ ضابطہ ہے دھڑکنا بھی چھوڑ دے یہ دل

یہ ضابطہ ہے کہ غم کو نہ غم کہا جائے
یہ ضابطہ ہے ستم کو کرم کہا جائے

بیاں کروں نہ کبھی اپنے دل کی حالت کو
نہ لاؤں لب پہ کبھی شکوہ و شکایت کو

کمال حسن کہوں عیب کو جہالت کو
کبھی جگاؤں نہ سوئی ہوئی عدالت کو

یہ ضابطہ ہے حقیقت کو اک فسانہ کہوں
یہ ضابطہ ہے قفس کو بھی آشیانہ کہوں

یہ ضابطہ ہے کہوں دشت کو گلستاں زار
خزاں کے روپ کو لکھوں فروغِ حسنِ بہار

ہر ایک دشمنِ جاں کو کہوں میں ہمدم و یار
جو کاٹتی ہے سرِ حق وہ چوم لوں تلوار

خطا و جُرم کہوں اپنی بے گناہی کو
سحر کا نور لکھوں رات کی سیاہی کو

جو مٹنے والے ہیں ان کے لیے دوام لکھوں
ثنا یزید کی اور شمر پر سلام لکھوں

جو ڈس رہا ہے وطن کو نہ اس کا نام لکھوں
سمجھ سکیں نہ جسے لوگ وہ کلام لکھوں

دروغ گوئی کو سچائی کا پیام کہوں
جو راہزن ہے اسے رہبرِ عوام کہوں

مرے جنوں کو نہ پہنا سکو گے تم زنجیر
نہ ہو سکے گا کبھی تم سے میرا ذہن اسیر

جو دیکھتا ہوں، جو سچ ہے کروں گا وہ تحریر
متاعِ ہر دو جہاں بھی نہیں بہائے ضمیر

نہ دے سکے گی سہارا تمھیں کوئی تدبیر
فنا تمھارا مقدر، بقا مری تقدیر

❋

عورت

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا
دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے چنوایا

دیوار کو آ توڑیں، بازار کو آ ڈھائیں
انصاف کی خاطر ہم سڑکوں پہ نکل آئیں
مجبور کے سر پہ ہے شاہی کا ابھی سایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

تقدیر کے قدموں پر سر رکھ کے پڑے رہنا
تائیدِ ستم گر ہے چپ رہ کے ستم سہنا
حق جس نے نہیں چھینا حق اُس نے کہاں پایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

کٹیا میں ترا پیچھا غربت نے نہیں چھوڑا
اور محل سرا میں بھی زردار نے دل توڑا
اُف تجھ پہ زمانے نے کیا کیا نہ ستم ڈھایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

تو آگ میں اے عورت زندہ بھی جلی برسوں
سانچے میں ہر اک غم کے چپ چاپ ڈھلی برسوں
تجھ کو کبھی جلوایا تجھ کو کبھی گڑوایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

علمائے سو کے نام

امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے
نہیں ہے دیں فروشو! ہم پہ یہ کوئی نیا فتوے

سفینہ اہلِ زر کا ڈوبنے والا ہے شب زادو
کوئی فتویٰ بچا سکتا نہیں جاگیرداروں کو
بہت خوں پی چکے ہو اپنا بھی انجام اب دیکھو

تمھاری حیثیت کیا، کون ہو تم اور کیا فتوے
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

رضائے ایزدی تم نے کہا دینِ الٰہی کو
نہیں مٹنے دیا تم نے نظامِ کجکلاہی کو
دیا تم نے سہارا ہر قدم پر زارِ شاہی کو

مگر انسانیت سب کے سامنے کس کا چلا فتوے
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

کہا تم نے کہ جائز ہے فرنگی کی وفاداری
بنایا تم نے ہر اک عہد میں مذہب کو سرکاری
لئے پرمٹ دیئے فتوے رکھی ایوب سے یاری

دکاں کھولو نئی، جاؤ پرانا ہو چکا فتوے
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

❋

عورتوں کا ترانہ

جہاں میں محبوس اب بھی ہم وہ حرم سرائیں نہیں رہینگی
لرزتے ہونٹوں پہ اب ہمارے فقط دعائیں نہیں رہینگی

غصب شدہ حق پہ چپ رہنا ہمارا منشور ہو گیا ہے
اٹھے گا اب شور ہر ستم پر دبی صدائیں نہیں رہینگی

ہمارے عزمِ جواں کے آگے ہمارے سیلِ رواں کے آگے
پرانے ظالم نہیں ٹکیں گے نئی بلائیں نہیں رہینگی

ہیں قتل گاہیں یہ عدل گاہیں انہیں بھلا کسطرح سراہیں
غلام عادل نہیں رہیں گے غلط سزائیں نہیں رہینگی

بنے ہیں جو خادمانِ ملت وہ کرنا سیکھیں ہماری عزت
وگرنہ ان کے تنوں پہ بھی یہ سجی قبائیں نہیں رہینگی

❋

عہدِ سزا

یہ ایک عہدِ سزا ہے جزا کی بات نہ کر
دعا سے ہاتھ اٹھا رکھ دوا کی بات نہ کر

خدا کے نام پہ ظالم نہیں یہ ظلم روا
مجھے جو چاہے سزا دے خدا کی بات نہ کر

حیات اب تو انہی محبسوں میں گزرے گی
ستم گروں سے کوئی التجا کی بات نہ کر

انہی کے ہاتھ میں پتھر ہیں جن کو پیار کیا
یہ دیکھ حشر ہمارا وفا کی بات نہ کر

ابھی تو پائی ہے میں نے رہائی رہزن سے
بھٹک نہ جاؤں میں پھر رہنما کی بات نہ کر
بجھا دیا ہے ہوا نے ہر اک دیا کا دیا
نہ ڈھونڈ اہلِ کرم کو دیا کی بات نہ کر

نزولِ حبس ہوا ہے فلک سے اے جالب
گھٹا گھٹا ہی سہی دم گھٹا کی بات نہ کر

❋

فلسطین

روشنیوں کی راہ میں جو دیوار بنے گا
نہیں رہے گا
غاصب کو غاصب جو کھل کر نہیں کہے گا
نہیں رہے گا
شاہی ہے صدیوں کی سیاہی چھٹ جائیگی
کٹ جائے گی درد کی منزل کٹ جائے گی
جو خونخوار لٹیروں کے ہمراہ چلے گا
نہیں رہے گا
گرتی ہوئی دیوار سے ناطہ توڑو بھی
خوش فہمو! اب سامراج کو چھوڑو بھی
وقت کی جو آواز کو اب بھی نہیں سنے گا
نہیں رہے گا

غاصبوں کے ساتھیو!

یہ جو لمحہ جارہا ہے
چھوڑتا جاتا ہے تم کو کتنا پیچھے بے حسو!
اور بزعم خود بہت ایماندارو بزدلو!
امن و ایماں سے ہیں بڑھ کر تم کو اپنے تخت و تاج
غاصبوں کے ساتھیو اور قاتلوں کے دوستو!

یہ سمجھ میں آچکا ہے
امن اور انسانیت کے تم بھی ہو دشمن تمام
فتح یا ستراصل میں ہے مرگ کا تم کو پیام
اپنے آقاؤں کے آگے کس طرح آنکھیں اٹھاؤ
زندگی سے ہے انہی کی بادشاہت کا نظام

تم بھی ہو گھیراؤ میں اب
تم کو بھی ہونا ہے غارت غاصبوں کے ساتھ ساتھ
چاہتے ہو زندگی تو مان لوگوں کی بات
فتح ہے جس کا مقدر آؤ اس لشکر میں آؤ
آؤ انسانوں کی جانب مت بنو شیطاں صفات

قصہ خوانی کے شہیدوں کی نذر

گولیاں تم پہ چلانے والے اب تک زندہ ہیں
قصہ خوانی کے شہیدو، تم سے ہم شرمندہ ہیں

ہے خزاں کی دسترس میں صحنِ گلشن آج بھی
اور کانٹوں سے بھرا ہے اپنا دامن آج بھی
کل بھی تھے جو صاحبِ اقبال چشمِ غیر سے
اُن کی قسمت کے ستارے آج بھی تابندہ ہیں
قصہ خوانی کے شہیدو تم سے ہم شرمندہ ہیں

سر نہیں تم نے جھکایا اپنا سر کٹوا لیا
جان دے دی اور حیاتِ جاوداں کو پا لیا
ہم غلاموں کی بھی کوئی زندگی ہے دہر میں
نقش جو چھوڑے ہیں تم نے بس وہی پائندہ ہیں
قصہ خوانی کے شہیدو تم سے ہم شرمندہ ہیں

٭

کافی ہاؤس

دن بھر کافی ہاؤس میں بیٹھے کچھ دُبلے پتلے نقاد
بحث یہی کرتے رہتے ہیں سست ادب کی ہے رفتار
صرف ادب کے غم میں غلطاں چلنے پھرنے سے لاچار
چہروں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے برسوں کے بیمار

اردو ادب میں ڈھائی ہیں شاعر میر و غالب آدھا جوش
یا اک آدھ کسی کا مصرعہ یا اقبال کے چند اشعار
یا پھر نظم ہے اک چھجے پر حامد مدنی کا شہکار
کوئی نہیں ہے اچھا شاعر کوئی نہیں افسانہ نگار

منٹو کرشن ندیم اور بیدی ان میں جان تو ہے لیکن
عیب یہ ہے ان کے ہاتھوں میں کند زباں کی ہے تلوار
عالی افسر انشا بابو ناصر میر کے برخوردار
فیض نے جو اب تک لکھا ہے کیا لکھا ہے سب بیکار

ان کو ادب کی صحت کا غم مجھ کو ان کی صحت کا
یہ بے چارے دکھ کے مارے جینے سے ہیں کیوں بیزار
حسن سے وحشت عشق سے نفرت اپنی ہی صورت سے پیار
خندۂ گل پر ایک تبسم گریۂ شبنم سے انکار

٭

کراچی میں جب صاحبِ جاہ نے جھونپڑے جلائے

نشیمنوں کو جلا کر کیا چراغاں خوب
سنوارتے ہیں یونہی چہرۂ گلستاں خوب

کھلا کے شاخِ دل و جاں پہ پھول زخموں کے
مسرتوں کو کیا آپ نے نمایاں خوب

لہو اُچھال کے اہلِ وفا کا راہوں میں
قدم قدم پہ کیا پاسِ دلفگاراں خوب

مچی ہے چاروں طرف آپ کے کرم کی دھوم
نبھائے آپ نے الفت کے عہد و پیماں خوب

ہر ایک بجھتا ہوا دیپ کہہ رہا ہے یہی
تمام رات رہا جشنِ نو بہاراں خوب

❋

کہنے کی بات

شاعر بھی زنجیر بپا ہے گائک بھی آزاد نہیں
ہر دل پر ہیں خوف کے سائے کون ہے جو ناشاد نہیں

اونچ نیچ کی گرد نہ پڑنے دو سوچوں کے دامن پر
یہی کہا تھا ہم نے یارو اور ہمیں کچھ یاد نہیں

جو کہنے کی بات تھی کہہ کر دار و رسن تک آئے ہیں
ہونٹوں پر ہے گیت وفا کا آہ نہیں فریاد نہیں

لاکھ دھڑکتا ہو پہلو میں پتھر ہی کہلائے گا
انسانوں کے درد سے جو دل اے جالب آباد نہیں

❋

کوٹ لکھپت جیل

قصوری قید اسلم قید خورشید و عمر قیدی
مری جاں اس خراب آباد میں ہے ہر بشر قیدی

سلاخوں میں اُدھر ہے طاہرہ اور اس طرف مظہر
بنا رکھا ہے اِک بیداد گر نے گھر کا گھر قیدی

حمید اختر بھی ہے رحمٰن بھی ہے اور مُغل بھی ہے
مقدّر سے مِلے ہیں واہ کیا کیا دیدہ ور قیدی

جہالت پھر رہی ہے شہر میں آزاد و آوارہ
رضا کاظم، بشیر راؤ، منت اور ظفر قیدی

علی سا خوبرو فنکار بھی قیدِ قفس میں ہے
بہت مسرور ہوتے ہیں اسے سب دیکھ کر قیدی

شعیب ہاشمی زنداں میں پہلی بار آیا ہے
وطن میں رہ چکا ہے مُدتوں اُس کا خُسر قیدی

میں آیا ہوں تو اپنے ساتھ نوحہ گر بھی لایا ہوں
مری صورت ہے اس زنداں میں میرا پبلشر قیدی

ملک ہیرا رؤف احسان مہدی چودھری اصغر
یہ ساتھی ہوں تو رہ سکتا ہے انساں عمر بھر قیدی

یہ اُبھریں گے یہ چمکیں گے یہ ظلمت کو مٹا دیں گے
زیادہ دیر رہ سکتے نہیں شمس و قمر قیدی

ہمارے ساتھ عبداللہ[1] بھی ہیں اور اِک جج[2] بھی
رہے ہیں جنکے کیا کیا اہلِ دل اہلِ نظر قیدی

ولی یعقوب استقلال تاج الدین اور عابد
یہ کر لیتے ہیں دل بس میں بڑے ہیں جادوگر قیدی

بہت کمیاب ہیں فیاض سے انساں دنیا میں
ثنا خواں ان کا زنداں میں ہے میری جان ہر قیدی

کہاں ملتے ہیں صبح و شام زندانوں میں اے ہمدم
رشید و صفدر و مشتاق ایسے باخبر قیدی

یہ سب رونق ہے پاہٹ[3] ہی کے دم سے کوٹ لکھپت میں
نہ ہو یہ تو نکل جائیں سلاخیں توڑ کر قیدی

[1] عبداللہ ملک اور [2] ملک سعید حسن   [3] داروغہ جیل

لگا ہے کوٹ لکھپت جیل میں میلہ چراغاں کا
• کہاں ہے قیدِ تنہائی اِدھر قیدی اُدھر قیدی

نہ کچھ ارشاد فرمایا نہ کوئی راہ دکھلائی
ادھر ٹوپی کبھی سر پر ہوئے بس ہم ادھر قیدی

وہ آیا لے کے ہونٹوں پہ ہنسی خان اے حمید آیا
وہ آیا میرے پچھڑے دیس کا نورِ نظر قیدی

میاں معراج و اصغر خاں کا بس اتنا فسانہ ہے
پڑا ہے کوئی زنداں میں تو کوئی اپنے گھر قیدی

ضرورت ڈاکٹر بنگش کی تھی لو وہ بھی آپہنچا
کرے گا دیکھ بھال اب قیدیوں کی ڈاکٹر قیدی

اٹھائے لاکھ دیواریں مقابل مہر تاباں کے
ستم گر ہو بھی سکتی ہے کبھی شب کی سحر قیدی

بڑا انساں ہے اپنے وقت کا یہ بھی قلندر ہے
قفس میں پھر رہا ہے جو منڈائے اپنا سر قیدی

یہ قیصر مصطفےٰ اسرار یہ انور رشید اپنے
سلاخوں میں پڑے ہیں دیکھ کیا کیا شیر نر قیدی

کنیز فاطمہ، محمود، منٹو، اعتزاز احسن
یہ قیدی ہیں کہ ہے اک علم و دانش کا نگر قیدی

میں دیکھوں تو کسے دیکھوں میں روؤں تو کسے روؤں
مرے قلب و نظر قیدی مرے جان و جگر قیدی

بشیر[1] و حامد[1] و محمود[1] ہیں بکھرے ہوئے موتی
کوئی قیدی کدھر ہے اور ہے کوئی کدھر قیدی

کسی کی کچھ خبر ملتی نہیں ہے اس زمانے میں
نجانے اور کتنے ہیں ہمارے ہم سفر قیدی

یہ قاسم اور قاضی جی تو قیدی پرانے تھے
بنے ہیں خواجہ خیرالدین ڈھاکہ چھوڑ کر قیدی

نہیں پرساں کوئی اُن کا پڑے ہیں جیل خانوں میں
ہوا کرتے تھے ہم سے لوگ جن کے حکم پر قیدی

ملک قاسم بھی اصغر خان بھی ہیں ملک کے دشمن
میاں ہم کیا ہیں خیرالدین بھی ہیں اہلِ شر[2] قیدی

نہ یہ زنداں رہیں باقی نہ یہ ظلم و ستم جالبؔ
اکٹھے ہو کے دھاوا بول دیں سارے اگر قیدی

❋

[1] بشیر ظفر، میاں محمود احمد، حامد محمود مرحوم [2] اشارہ نوابزادہ نصراللہ خاں کی طرف ہے

بہت سے دکھ سہے ہیں اور سہہ جا
یہ فرصت پھر کہاں، کچھ شعر کہہ جا
وفا کی راہ میں خود کو مٹا کے
زمانے کو ہمیشہ یاد رہ جا
بہت مشکل مری پہچان ہوگی
بدل ڈالوں اگر میں اپنا لہجا

دل کی کچھ پروا نہیں زخمِ جگر کا غم نہیں
غم اگر ہے تو وطن کا، ہم کو گھر کا غم نہیں
اس جہادِ زندگی میں ہم تو سمجھے ہیں یہی
وہ بشر ہی کیا جسے نوعِ بشر کا غم نہیں

گناہِ عشق پہ کیونکر نہ ہو یہ دل نازاں
لگا رہا ہے کنارے ہمیں یہی طوفاں
اب اور جاکے کہیں اپنا سر کھپا ناصح
یہی نا کوچۂ محبوب میں ہے جاں کا زیاں

لبنان چلو

لبنان چلو

شیطان جہاں ہے برق فشاں
انسان جہاں ہے نوحہ کناں
خطرے میں جہاں ہے امن جہاں
کہتا ہے وہیں ایمان چلو
لبنان چلو لبنان چلو

کشتی کو بچانے طوفاں سے
انساں کو چھڑانے شیطاں سے
بیگن کو بھگانے میداں سے
کہتا ہے یہ دل ہر آن چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

اے اہل عرب اے اہل عجم
کرنا ہے تکبر کا سر خم
غاصب کو مٹا کر لینا ہے دم
پیارو ہو کر یک جان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

قاتل سے کہاں جاں چھوٹی ہے
ہر دل پہ قیامت ٹوٹی ہے
خونخوار عدو نے لوٹی ہے
بچوں کی جہاں مسکان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

یاسر کے بہادر جیالوں پر
ظلمت کے مٹانے والوں پر
خورشید سحر کے اجالوں پر
ہونے کے لیے قربان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

دم اہل جنوں کا بھرنے کو
جاں حق پہ نچھاور کرنے کو
رستے میں وفا کے مرنے کو
انساں کی بڑھانے شان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

یہ جنگ ہے امن عالم کی
یہ جنگ ہے ہر اہل غم کی
یہ جنگ ہے نسل آدم کی
سر لے کے سر میدان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

❀

ماتم شہر کراچی

ہمدم مرے پیارے افضل

صورتِ حال سے دل ہے بے کل
تیری گلیوں پہ لگی ہیں نظریں
اور ترے شہر کا غم ہے ہر پل
در و دیوار ہیں سہمے سہمے
چہرۂ زیست ہے اوجھل اوجھل
بادِ باراں بھی ہے زخمی زخمی
اشک آلود ہے آنچل آنچل
کوئی منظر نہیں اچھا لگتا
دل جلاتے ہیں گذرتے بادل
ہم نے شاداب فضا مانگی تھی !
اور ملی رنج و الم کی دلدل

قاتلِ امن و سکوں چین سے ہے
اپنے سینے میں مچی ہے ہلچل
آج اندازہ نہیں ہے ہم کو
آفتیں ڈھائے گی ہم پر کیا کل
ہم پہ چڑھ دوڑیں گے جیالے بلوان
ماند پڑ جائیں گے اپنے کس بل
بیٹھ جائیں گے دُبک کر سارے
یوں نکل جائے گا اپنا ہر بل
ٹینک اذہان پہ چھا جائیں گے
اور کہیں گے ہمیں پاگل پاگل

۱۱ستمبر ۱۹۸۷ء

لمبی نہیں ہے ظلم کی عمر

ہم اور اپنوں کے کیا پاس چھوڑ آئے ہیں
یہی کہ دہشت و افلاس چھوڑ آئے ہیں

ہماری قید سے لمبی نہیں ہے ظلم کی عمر
یہی حسین سا احساس چھوڑ آئے ہیں

کسی بھی شام نہ آئے گی مے کی یاد ہمیں
درِ قفس سے اُدھر پیاس چھوڑ آئے ہیں

ہمارے ذکر سے خالی نہ ہوگی بزم کوئی
ہم اپنے ذہن کی وہ باس چھوڑ آئے ہیں

چلے تھے جب تو نہ تھا رنگِ یاس چہروں پر
دلوں میں ایک عجب آس چھوڑ آئے ہیں

مادرِ ملّت

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

دیکھنے کو تو ہزاروں ہیں مگر کتنے ہیں
ظلم کے آگے کبھی سر نہ جھکانے والے

مر کے بھی مرتے ہیں کب مادرِ ملّت کی طرح
شمع تاریک فضاؤں میں جلانے والے

مادرِ ملت

آواز سے ایوان لرز اٹھے ہیں
لوگ جاگے ہیں تو سلطان لرز اٹھے ہیں

آمدِ صبحِ بہاراں کی خبر سنتے ہی
ظلمتِ شب کے نگہبان لرز اٹھے ہیں

دیکھ کے لہر مرے دیس میں آزادی کی
قصرِ افرنگ کے دربان لرز اٹھے ہیں

مشعلیں لے کے نکل آئے ہیں مظلوم عوام
غم و اندوہ میں ڈوبی ہے محلات کی شام

یاس کا دور گیا خوف کی زنجیر کٹی
آج سہمے ہوئے لوگوں کو ملا اذنِ کلام

راہ میں لاکھ صداقت کے مخالف آئے
قوم نے سُن ہی لیا مادرِ ملت کا پیام

ماں کے قدموں ہی میں جنت ہے ادھر آجاؤ
ایک بے لوث محبت ہے ادھر آجاؤ

وہ پھر آئی ہیں ہمیں ملک دلانے کے لیے
ان کی یہ ہم پہ عنایت ہے ادھر آجاؤ

اُس طرف ظلم ہے بیداد ہے حق تلفی ہے
اس طرف پیار ہے الفت ہے ادھر آجاؤ

مادرِ ملت کی پہلی برسی پر

بجا کہ دار و رسن ہیں صلہ صداقت کا
نہ رُک سکے گا مگر قافلہ صداقت کا
نہ ختم ہوگا کبھی سلسلہ صداقت کا
کہ آگ میں بھی گلستاں کھلا صداقت کا
ہو دل شکستہ نہ ہوگی کبھی اصولوں کو
بقا ملی ہے سدا امن کے رسولوں کو

ہے آج سارے وطن کی زباں پہ نام اُس کا
وہ مرگئی ہے مگر زندہ ہے پیام اُس کا
یونہی رہے گا ہر اک دل میں احترام اُس کا
بلند رکھیں گے پرچم سدا عوام اُس کا
نشاں تمہارا نہ ہوگا ذرا مڑو تو سہی
فرازِ جاہ سے نیچے قدم دھرو تو سہی

وہ نقشِ قائدِ اعظم اُبھارنے آئی
وہ رنگ روئے گلستاں نکھارنے آئی
مقدرِ اہلِ وطن کا سنوارنے آئی
وہ اپنی جان غریبوں پہ وارنے آئی
اُسے نہ جاہ و زر و مال کی ضرورت تھی
فقط عوام کے اقبال کی ضرورت تھی

اُٹھی عوام کو ہر گام پر جگاتی ہوئی
ہر اک نگاہ میں شمعِ یقیں جلاتی ہوئی
غرورِ کج کُلہاں خاک میں ملاتی ہوئی
پیام سب کو مساوات کا سناتی ہوئی
تھا اُس کا نعرہ کہ ہے ذات سے وطن پہلے
صدا یہ گونج اُٹھی آمروں کے دل دہلے

وطن کے حاکمِ اعلیٰ ہیں دس کروڑ انساں
یہ کہہ کے بخش دی اُس نے خموشیوں کو زباں
دل و نگاہ میں عزم و عمل کا تھا طوفاں
علم اُٹھا کے نکل آئے راہ [illegible]

ادھر ... ایک ...
کٹی ہیں ... ہیں مزدور زنجیریں

ملوں کے مالکو اے افسرو زمیندارو
ہماری راہِ ترقی میں کالی دیوارو
کرو گے ہم پہ ستم کب تلک ستم گارو
ہو چند روز ہی تم سیم و زر کے بیمارو
نشاں یزید کا باقی ہے اور نہ زار کا ہے
یہ دور اصل میں انسان کے وقار کا ہے

غلام ہم کو بنائے رہو گے تم کب تک
ہمارے سر کو جھکائے رہو گے تم کب تک
ہمارے حق کو دبائے رہو گے تم کب تک
وطن کو سُولی چڑھائے رہو گے تم کب تک
اندھیرا ظلم و ستم کا مٹا کے چھوڑیں گے
چراغِ مادرِ ملت جلا کے چھوڑیں گے

❁

ماں

بچوں پہ چلی گولی
ماں دیکھ کے یہ بولی
یہ دل کے مرے ٹکڑے
یوں روئیں مرے ہوتے
میں دور کھڑی دیکھوں
یہ مجھ سے نہیں ہوگا

میں دور کھڑی دیکھوں
اور اہلِ ستم کھیلیں
خوں سے مرے بچوں کے
دن رات یہاں ہولی
بچوں پہ چلی گولی
ماں دیکھ کے یہ بولی

یہ دل کے مرے ٹکڑے
یوں روئیں مرے ہوتے
میں دور کھڑی دیکھوں
یہ مجھ سے نہیں ہوگا

میداں میں نکل آئی
اک برق سی لہرائی
ہر دستِ ستم کانپا
بندوق بھی تھرائی
ہر سمت صدا گونجی
میں آتی ہوں میں آئی
میں آتی ہوں، میں آئی

ہر ظلم ہوا باطل
اور سہم گئے قاتل
جب اس نے زباں کھولی
بچوں پہ چلی گولی

اس نے کہا خونخوارو!
دولت کے پرستارو
دھرتی ہے یہ ہم سب کی
اس دھرتی کو نادانو!
انگریز کے دربانو!
صاحب کی عطا کردہ
جاگیر نہ تم جانو
اس ظلم سے باز آؤ
بیرک میں چلے جاؤ
کیوں چند لٹیروں کی
پھرتے ہو لیے ٹولی
بچوں پہ چلی گولی

❋

متاعِ غیر

آخرِ کار یہ ساعت بھی قریب آ پہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کل تلک میرا مقدر تھی تری زلف کی شام
کیا تعجب ہے کہ تو غیر کی کہلائے گی
میرے غم خانے میں تو اب کبھی آئیگی

تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عینِ خوشی کے ہنگام
تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا
میری دم ساز زمانے سے چلی آتی ہیں
رہنِ غم وقفِ الم سادہ دلوں کی آنکھیں
یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پر
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رولیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں ❋

مرثیہ خاک نشیناں

جو اوجڑی میں مارا گیا بس وہ مر گیا
خاکی تھا اور خاک کی صورت بکھر گیا

منشائے ایزدی کے مطابق گزر گیا
ہر بے گنہ کا خون مقدّر کے سر گیا

چنگیز خاں شہید ہلاکو شہید ہے
آیا جو اس زمین پہ ڈاکو شہید ہے
جو اس نگر میں کر کے مرا کو شہید ہے

کاذب کے واسطے ہے ہر اک روز روزِ عید
کیا کیا نہ اہلِ صدق کی مٹی ہوئی پلید
نیچے شُنید ان کی نہ اوپر ہی کچھ شُنید
جو مر رہے ہیں سندھ میں ہرگز نہیں شہید

کہیے یہی یقین سے شیطاں عظیم ہے
جو بھی ہے اس کے تابعِ فرماں عظیم ہے
یہ ایک واہمہ ہے کہ انساں عظیم ہے

❋

مستقبل

تیرے لیے میں کیا کیا صدمے سہتا ہوں
سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھول بھی ہیں
تیری خاطر کانٹے چنتا رہتا ہوں
تو آئے گا۔ اسی آس پر جھوم رہا ہے دل
دیکھ اے مستقبل

اک اک کر کے سارے ساتھی چھوڑ گئے
مجھ سے میرے رہبر بھی منہ موڑ گئے
سوچتا ہوں بے کار گلہ ہے غیروں کا
اپنے ہی جب پیار کا ناتا توڑ گئے
تیرے بھی دشمن ہیں میرے خوابوں کے قاتل
دیکھ اے مستقبل

جہل کے آگے سر جھکایا میں نے کبھی
سفلوں کو اپنا نہ بنایا میں نے کبھی
دولت اور عہدوں کے بل پر جو اینٹھیں
ان لوگوں کو منہ نہ لگایا میں نے کبھی
میں نے چور کہا چوروں کو کھل کے سرِ محفل
دیکھ اے مستقبل

❋

مشاعرہ

ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اڑاتی ہوئی
یہی وہ کار تھی جس میں وہ لوگ آئے تھے
حضور آپ ہی جالبؔ ہیں آپ کی خاطر
تمام شہر میں دیوانہ وار گھومے ہیں
کسی طرح سے کہیں آپ کا سراغ ملے
حضور ہم نے بگولوں کے پاؤں چومے ہیں
ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اڑاتی ہوئی
مشاعرے میں اسی کار سے گیا تھا میں

❋

مشروط رہائی

دوستو جگ ہنسائی نہ مانگو
موت مانگو، رہائی نہ مانگو

عمر بھر سر جھکاتے پھروگے
سب سے نظریں بچاتے پھروگے

مل رہا ہے جو بارِ ندامت
دل پہ کیسے اٹھاتے پھروگے

اپنے حق میں برائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

ہم ہیں جن کے ستم کا نشانہ
مت کہو ان سے غم کا فسانہ

پھر کہاں جگمگاتا یہ میسر
بن گیا ہے قفس آشیانہ

اب قفس سے جدائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

رات سے روشنی مانگنا کیا
موت سے زندگی مانگنا کیا

ظلم کی ظلمتوں سے مری جاں
جرأت انصاف کی مانگنا کیا

غاصبوں سے بھلائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

❋

مشیر

میں نے اُس سے یہ کہا
یہ جو دس کروڑ ہیں
جہل کا نچوڑ ہیں
ان کی فکر سو گئی
ہر امید کی کرن
ظلمتوں میں کھو گئی
یہ خبر درست ہے
ان کی موت ہو گئی
بے شعور لوگ ہیں
زندگی کا روگ ہیں
اور تیرے پاس ہے
ان کے درد کی دوا
میں نے اُس سے یہ کہا
تو خدا کا نور ہے
عقل ہے شعور ہے
قوم تیرے ساتھ ہے
تیرے ہی وجود سے
ملک کی نجات ہے
تو ہے مہرِ صبحِ نو
تیرے بعد رات ہے
بولتے جو چند ہیں
سب یہ شر پسند ہیں
ان کی کھینچ لے زباں
ان کا گھونٹ دے گلا
میں نے اس سے یہ کہا
جن کو تھا زباں پہ ناز
چُپ ہیں وہ زباں دراز
چین ہے سماج میں
بے مثال فرق ہے
کل میں اور آج میں
اپنے خرچ پر ہیں قید

لوگ تیرے راج میں
پڑھ کے ان کو ہر کوئی

آدمی ہے وہ بڑا
کہہ رہا ہے مرحبا

در پہ جو رہے پڑا
میں نے اس سے یہ کہا

جو پناہ مانگ لے
چین اپنا یار ہے

اُس کی بخشش دے خطا
اس پہ جاں نثار ہے

میں نے اس سے یہ کہا
پر وہاں ہے جو نظام

ہر وزیر ہے سفیر
اس طرف نہ جائیو

بے نظیر ہے مشیر
اس کو دور سے سلام

واہ کیا جواب ہے
دس کروڑ یہ گدھے

تیرے ذہن کی قسم
جن کا نام ہے عوام

خوب انتخاب ہے
کب بنیں گے حکمراں

جاگتی ہے افسری
تُو یقیں ہے یہ گماں

قوم محوِ خواب ہے
اپنی تو دعا ہے یہ

یہ ترا وزیر خاں
صدر تو رہے سدا

دے رہا ہے جو بیاں
میں نے اُس سے یہ کہا

ملاقات

جو ہو نہ سکی بات وہ چہروں سے عیاں تھی
حالات کا ماتم تھا ملاقات کہاں تھی

اس نے نہ ٹھہرنے دیا پہروں مرے دل کو
جو تیری نگاہوں میں شکایت مری جاں تھی

گھر میں بھی کہاں چین سے سوئے تھے کبھی ہم
جو رات ہے زنداں میں وہی رات وہاں تھی

یکساں ہیں مری جان قفس اور نشیمن
انسان کی توقیر یہاں ہے نہ وہاں تھی

شاہوں سے جو کچھ ربط نہ قائم ہوا اپنا
عادت کا بھی کچھ جبر تھا کچھ اپنی زباں تھی

صیاد نے یونہی تو قفس میں نہیں ڈالا
مشہور گلستاں میں بہت میری فغاں تھی

تو ایک حقیقت ہے مری جاں مری ہمدم
جو تھی مری غزلوں میں وہ اک وہم و گماں تھی

محسوس کیا میں نے ترے غم سے غم دہر
ورنہ مرے اشعار میں یہ بات کہاں تھی

مُمتاز

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہُوا، لاڑکانے چلو
ورنہ تھانے چلو

اپنے ہونٹوں کی خوشبو لُٹانے چلو، گیت گانے چلو
ورنہ تھانے چلو

منتظر ہیں تمہارے شکاری وہاں، کیف کا ہے سماں
اپنے جلووں سے محفل سجانے چلو، مُسکرانے چلو
ورنہ تھانے چلو

حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو، ذہن پر چھائی ہو
جسم کی لَو سے شمعیں جلانے چلو، غم بھلانے چلو
ورنہ تھانے چلو

❋

منشور

دے دیا سامراج نے منشور
رہیو بس اقتصادیات سے دور
بات پچھلی بڑھائیو آگے
دائرے سے نہ جائیو آگے

❋

مولانا

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تقریر مولانا
مگر بدلی نہیں اب تک مری تقدیر مولانا
خدارا شکر کی تلقین اپنے پاس ہی رکھیں
یہ لگتی ہے مرے سینے پہ بن کر تیر مولانا
نہیں میں بول سکتا جھوٹ اس درجہ ڈھٹائی سے
یہی ہے جرم میرا اور یہی تقصیر مولانا
حقیقت کیا ہے یہ تو آپ جانیں یا خدا جانے
سنا ہے جمی کارٹر آپ کا ہے پیر مولانا
زمینیں ہوں وڈیروں کی مشینیں ہوں لٹیروں کی
خدا نے لکھ کے دی ہے یہ تمھیں تحریر مولانا
کروڑوں کیوں نہیں مل کر فلسطیں کے لیے لڑتے
دعا ہی سے فقط کٹتی نہیں زنجیر مولانا

❋

میری بچی

میری بچی میں آ ؤں نہ آ ؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا
تیرے ننھے سے دل کو دکھوں نے
میں نے مانا کہ ہے آج گھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

تیری آشا کی بگیا کھلے گی
چاند کی بچہ کو گڑیا ملے گی
تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہوگا ستم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

درد کی رات ہے کوئی دم کی
ٹوٹ جائے گی زنجیر غم کی
مسکرائے گی ہر آس تیری
لے کے آئے گا خوشیاں سویرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

سچ کی راہوں میں جو مر گئے ہیں
فاصلے مختصر کر گئے ہیں
دکھ نہ جھیلیں گے ہم منہ چھپا کے
سکھ نہ لوٹے گا کوئی لٹیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

❋

ناداں نہیں ہیں یار

جن کو جہاں کا غم ہے وہ معذودے چند ہیں
ورنہ تمام اپنی ترقی پسند ہیں

دشتِ وفا میں ساتھ ہمارے وہ کیوں چلیں
ناداں نہیں ہیں یار بڑے ہوشمند ہیں

❋

نام کیا لوں

ایک عورت جو میرے لیے مدتوں
شمع کی طرح آنسو بہاتی رہی
میری خاطر زمانے سے منہ موڑ کر
میرے ہی پیار کے گیت گاتی رہی
میرے غم کو مقدر بنائے ہوئے
مسکراتی رہی

اس کے غم کی کبھی میں نے پرواہ کی
اس نے ہر حال میں نام میرا لیا
چھین کر اس کے ہونٹوں کی میں نے ہنسی
تیری دہلیز پر اپنا سر رکھ دیا
تو نے میری طرح میرا دل توڑ کر
مجھ پہ احساں کیا

❋

نذرِ شہداء

بنائے ہیں سلطانِ فرنگی کے درباں
بہت خوب کی قدرِ خونِ شہیداں

رہِ حق میں جاں اپنی دے کے مری جاں
بہت کر گئے ہمسفروں کو وہ آساں

مناتے ہیں چھپ چھپ کے ہم ان کی یادیں
جو باطل شکن تھے جو تھے مردِ میداں

رُخ زندگی پر جو کچھ زندگی ہے
اُنہی کا کرم ہے اُنہی کا ہے احساں

وہ آزادیوں کے تھے خورشید جالبؔ
اُنہی کے لہو سے کھلے ہیں گلستاں

❋

ننھی جا سو جا

جب دیکھو تو پاس کھڑی ہے ننھی جا سو جا
تجھے بلاتی ہے سپنوں کی نگری جا سو جا
غصّے سے کیوں گھور رہی ہے میں آ جاؤں گا
کہہ جو دیا ہے تیرے لیئے اک گڑیا لاؤں گا
گئی نہ ضد کرنے کی عادت تیری جا سو جا
ننھی جا سو جا

ان کالے دروازوں سے مت لگ کر دیکھ مجھے
اُڑ جاتی ہے نیند آنکھوں سے پاکر پاس تجھے
مجھ کو بھی سونے دے میری پیاری جا سو جا
ننھی جا سو جا

کیوں اپنوں اور بیگانوں کے شکوے کرتی ہے
کیوں آنکھوں میں آنسو لاکر آہیں بھرتی ہے
رونے سے کب رات کٹی ہے دکھ کی جا سو جا
ننھی جا سو جا

*

نہتّی لڑکی

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمّت کے اُجالے ایک نہتی لڑکی سے

ڈرے ہوئے ہیں مرے ہوئے ہیں لرزیدہ لرزیدہ ہیں
مُلّا، تاجر، جنرل جیالے، ایک نہتی لڑکی سے

آزادی کی بات نہ کر لوگوں سے نہ مِل، یہ کہتے ہیں
بے حِس، ظالم، دِل کے کالے ایک نہتی لڑکی سے

دیکھ کے اِس صورت کو جالب ساری دنیا ہنستی ہے
بلوانوں کے پڑے ہیں پالے ایک نہتی لڑکی سے

*

نیلو

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیونکر
سایۂ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے؟

اہلِ ثروت کی یہ تجویز ہے سرکش لڑکی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے نچایا جائے
ناچتے ناچتے ہو جائے جو پائل خاموش
پھر نہ تا زیست تجھے ہوش میں لایا جائے

لوگ اس منظرِ جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوتِ شاہی کا جلال
تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہوگی
سر اٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال

طبعِ شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں انھیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے
تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

وطن کو کچھ نہیں خطرہ

وطن کو کچھ نہیں خطرہ نظامِ زر ہے خطرے میں
حقیقت میں جو رہزن ہے وہی رہبر ہے خطرے میں

جو بیٹھا ہے صفِ ماتم بچھائے مرگِ ظلمت پر
وہ نوحہ گر ہے خطرے میں، وہ دانشور ہے خطرے میں

اگر تشویش لاحق ہے تو سلطانوں کو لاحق ہے
نہ تیرا گھر ہے خطرے میں نہ میرا گھر ہے خطرے میں

جہاں اقبال بھی نذرِ خطِ تنسیخ ہو جائے
وہاں تجھ کو شکایت ہے ترا جوہر ہے خطرے میں

نہیں بدلتے ہم

ہجوم دیکھ کے رستہ نہیں بدلتے ہم
کسی کے ڈر سے تقاضا نہیں بدلتے ہم

ہزار زیرِ قدم راستہ ہو خاروں کا
جو چل پڑیں تو ارادہ نہیں بدلتے ہم

اسی لئے تو نہیں معتبر زمانے میں
کہ رنگِ صورتِ دنیا نہیں بدلتے ہم

خیال میں وہی رہتے ہیں بام و در وہی لوگ
یہی تو حسن ہے اپنا نہیں بدلتے ہم

ہوا کو دیکھ کے جالبؔ مثالِ ہمعصراں
بجا یہ زعم ہمارا نہیں بدلتے ہم

نئی پود

ریستوراں میں بیٹھو اور کانٹے سے کھانا کھاؤ
اچھے اچھے شعر کہو ذہنوں کو خوب الجھاؤ
میرؔ کے مصرعے آگے رکھ کر غزلیں کہتے جاؤ
خود کو پورا میرؔ کو آدھا ہی شاعر بتلاؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

ٹیبل پر جو بات کرو بس لکھتے جاؤ یارو
اور پھر اس کو ماہِ نو کے ماتھے پر دے مارو
سب تم کو فن کار کہیں تم روپ کچھ ایسا دھارو
مکتب کے لڑکوں کو اپنی نظمیں یاد کراؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

ولی خاں

مرے کارواں میں شامل کوئی کم نظر نہیں ہے
جو نہ مٹ سکے وطن پر مرا ہمسفر نہیں ہے
درِ غیر پر ہمیشہ تمہیں سر جھکائے دیکھا
کوئی ایسا داغِ سجدہ مرے نام پر نہیں ہے
کسی سنگدل کے در پر مرا سر نہ جھک سکے گا
مرا سر نہیں رہے گا مجھے اس کا ڈر نہیں ہے

❋

وہ ہو گئے وزیر

وہ ہو گئے وزیر شبِ غم گذر گئی
غربت زدہ عوام کی قسمت سنور گئی
اب اُن کی گفتگو میں تحمّل کی لہر ہے
جالبؔ اب اُن کے جوش کی ندّی اُتر گئی

❋

ہتھکڑی

اُس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی

یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے

کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کل کا اشارا ملا

❋

ہم دیکھتے ہیں

وہی عالم ہے جو تم دیکھتے ہو
نہیں کچھ مختلف عالم ہمارا
جلائے ہم نے پلکوں پر دیے بھی
نہ چمکا پھر بھی قسمت کا ستارا
وہی ہے وقت کا بے نور دھارا

وہی سر پر مسلط ہے شبِ غم
اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے ہیں
نہیں ملتی خوشی کی اک کرن بھی
مہ و خورشید گہنائے ہوئے ہیں
یہ کس بستی میں ہم آئے ہوئے ہیں

شکایت ہے تمھیں آنکھوں سے اپنی
یہاں آنکھیں کہاں روشن رفیقو
کلی کی آنکھ نم، روتی ہے شبنم
سلگتے ہیں گلوں کے تن رفیقو
نظر آتے ہیں گلشن بن رفیقو

جنھیں ہم شعر میں کہتے ہیں جادو
اُن آنکھوں کو یہاں نم دیکھتے ہیں
لبوں پر آہ اور زلفیں پریشاں
غزل کو وقفِ ماتم دیکھتے ہیں
ستم کیا کم ہے یہ ہم دیکھتے ہیں

۱۲ر جون ۱۹۸۵ کو لاہور میں نابیناؤں کی امدادی انجمن کے مشاعرے میں پڑھی گئی۔

*

یوری گیگرین

موت کے بیاباں سے زندگی گزر آئی
ظلمتوں کے صحرا میں روشنی نظر آئی

آدمی کی راہوں میں گرد ہیں مہ و انجم
ماورائے امکاں سے ہم کو یہ خبر آئی

صبح و شام لرزاں تھے سامنے نگاہوں کے
اہل دل کی منزل میں وہ بھی رہ گزر آئی

جب سے دکھ زمانے کے ہمسفر بنائے ہیں
چھب مرے خیالوں کی اور بھی نکھر آئی

*

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی
اٹھائے ہاتھوں میں اپنے حسینیت کا علم
ادیبو، شاعرو، دانشورو، سخن دانو
کرو حکایتِ بیروت خونِ دل سے رقم
شکستِ جہل کو ہوگی شعور جیتے گا
کرے گا جہل کہاں تک سرِ شعور قلم

چلی ہے وہ ہوائے زہر آگیں
کہ بجھ کر رہ گئی ہے شمعِ تمکیں
دعا گویانِ عالم کو خبر کیا
کہ کس عالم میں ہیں اہلِ فلسطیں
ہوا لبنان میں وہ حشر برپا
زمیں خونِ شہیداں سے ہے رنگیں

شیوخ و شاہ کو سمجھو نہ پاسبانِ حرم
یہ بندگانِ زر و سیم ہیں خدا کی قسم
شیوخ و شاہ تو ہیں خود شریکِ ظلم و ستم
شیوخ و شاہ سے رکھو نہ کچھ امیدِ کرم
امیر کیسے نہ واشنگٹن کے ساتھ رہیں

انہی کے دم سے ہیں ساری امارتیں ہمدم
یہ مانگتے ہیں دعائیں برائے اسرائیل
کہ اسرائیل سے ہیں بادشاہتیں قائم
غرض انھیں تو فقط اپنے تخت و تاج سے ہے
انھیں شہید فلسطینیوں کا کیوں ہو غم

گماشتے ہیں یہ سب سامراج کے یارو
عدو کے ساتھ ہی کرنا ہے انکا بھی سر خم

فلک پہ ہے تکبر کرگسوں کا
مگر منقار زیرِ پر ہیں شاہیں
بہ اندازِ دگر دشمن ہیں یہ بھی
امیدیں کب شیوخ و شاہ سے تھیں
ہماری جنگ آخر کیوں لڑیں وہ
عزیز از دیں جنھیں ہیں قصرِ زریں

❀

یومِ آزادیٔ صحافت پر

داستانِ غم کی تم کو خبر ہے
خون ہمارا تمہارے ہی سر ہے

پھر سے کہرام آج گھر گھر ہے
پھر وطن کی فضا مکدر ہے

ہر تباہی میں ہے تمہارا ہاتھ
تم نے پیدا کیے ہیں یہ حالات

خوب وعدے نبھائے ہیں تم نے
شہر مقتل بنائے ہیں تم نے

ہم کو یہ دن دکھائے ہیں تم نے
جھونپڑے ہی جلائے ہیں تم نے

کون سا قصر تم نے ڈھایا ہے
بے کسوں ہی کا خوں بہایا ہے

عزتِ نفس کے ہو تم قاتل
گالیاں دیتے ہو سرِ محفل

ہے تمہارا مشیر ہر جاہل
تم سے امیدِ خیر لاحاصل

بے ضمیری جسے گوارا ہو
بس وہی ہم سفر تمہارا ہو

ضبط کرتے ہو روز تم اخبار
یہ ہے آزادیٔ لبِ اظہار

مفلس و اہلِ دانش و زردار
آج ہیں تم سے سب کے سب بیزار

سچ نہ بولا نہ بول سکتے ہو
جانے کیا کیا جنوں میں بکتے ہو

تالیاں قہقہے کرو تقریر
کوئی کچھ بھی کہے کرو تقریر

ملک کشتا رہے کرو تقریر
خون بہتا بہے کرو تقریر

سب ہیں خوشحال ہاتھ اٹھواؤ
یوں تماشا جہاں کو دکھلاؤ

دل تمہارے ہیں نفرتوں سے بھرے
کون اب تم پہ اعتبار کرے
جو بھی تم سے ملائے ہاتھ ڈرے
مرگئے اچھے لوگ تم نہ مرے

قاتلو اب خدا سے کچھ تو ڈرو
باقی ماندہ وطن پہ رحم کرو

❋

یومِ اقبال پر

لوگ اُٹھتے ہیں جب تیرے غریبوں کو جگانے
سب شہر کے زردار پہنچ جاتے ہیں تھانے

کہتے ہیں یہ دولت ہمیں بخشی ہے خُدا نے
فرسُودہ بہانے وہی افسانے پُرانے

اے شاعرِ مشرق! یہی جھوٹے یہی بدذات
پیتے ہیں لہُو بندۂ مزدُور کا دِن رات

یومِ مئی

صدا آرہی ہے مرے دل سے پیہم
کہ ہوگا ہر اک دشمنِ جاں کا سر خم

نہیں ہے نظامِ ہلاکت میں کچھ دم
ضرورت ہے انسان کی امن عالم

فضاؤں میں لہرائے گا سُرخ پرچم
صدا آرہی ہے مرے دل سے پیہم

نہ ذلت کے سائے میں بچے پلیں گے
نہ ہاتھ اپنے قسمت کے ہاتھوں ملیں گے

مساوات کے دیپ گھر گھر جلیں گے
سب اہلِ وطن سر اٹھا کر چلیں گے

نہ ہوگی کبھی زندگی وقفِ ماتم
فضاؤں میں لہرائے گا سُرخ پرچم

یہ وزیرانِ کرام

کوئی ممنونِ فرنگی کوئی ڈالر کا غلام
ہر کہیں محکوم ان کی لب پہ آزادی کا نام
ان کو کیا معلوم کس حالت میں رہتے ہیں عوام
یہ وزیرانِ کرام

ان کو فرصت ہے بہت اونچے امیروں کے لیے
ان کے ٹیلیفون قائم ہیں سفیروں کے لیے
وقت ان کے پاس کب ہے ہم فقیروں کے لیے
چھو نہیں سکتے انھیں ہم ان کا اونچا ہے مقام
یہ وزیرانِ کرام

صبح چائے ہے یہاں تو شام کھانا ہے وہاں
کیوں نہ ہوں مغرور چلتی ہے میاں ان کی دکاں
جب یہ چاہیں ریڈیو پر جھاڑ سکتے ہیں بیاں
ہم ہیں پیدل، کار پہ یہ کس طرح ہوں ہم کلام
یہ وزیرانِ کرام

قوم کی خاطر اسمبلی میں یہ مرجاتے بھی ہیں
قوت بازو سے اپنی بات منواتے بھی ہیں
گالیاں دیتے بھی ہیں اور گالیاں کھاتے بھی ہیں
یہ وطن کی آبرو ہیں، کیجیے ان کو سلام
یہ وزیرانِ کرام

ان کی محبوبہ وزارت داشتائیں کرسیاں
جان جاتی ہے تو جائے پر نہ جائیں کرسیاں
دیکھیے یہ کب تلک یوں ہی چلائیں کرسیاں
عارضی ان کی حکومت عارضی ان کا قیام
یہ وزیرانِ کرام

کتابوں کی دنیا میں ایک ابھرتا ہوا نام
پبلشرز
اینڈ
ایڈورٹائزرز
Pub Ad
پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے۔۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

دیباچے
پیش لفظ

چودہ پندرہ برس کی بات ہے کیلے فورنیا میں ایک اپاہج، گونگا اور نابینا بچہ پیدا ہوا ایک خاتون نے اس لاوارث بچے کو گود لے لیا اور پھر وہ بچہ اس کی کائنات بن گیا دن رات وہ اسی میں مگن رہتی اسی سے باتیں کرتی "لیزلی (LESLIE) آج تم بڑے چپ چپ سے ہو" " آج تمارے پاؤں میں کچھ جنبش سی ہے "۔ سال گذرتے گئے بچہ گم سم پڑا رہا۔ ایک صبح لیزلی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ ہولے ہولے رونے لگا، ماں کا یہ حال تھا کہ محلے والوں کو بلا بلا کر دکھا رہی تھی کہ لیزلی رونے لگا ہے، دو چار سال اور گذر گئے۔ رات کے سناٹے میں پیانو کی آواز آرہی تھی کہ ماں کی آنکھ کھل گئی، اس نے سوچا کہ شاید اس کا میاں سونے سے پہلے ٹی وی بند کرنا بھول گیا ہو۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی اور جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ لیزلی اسٹول پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس کی انگلیاں بجلی کی طرح پیانو کے سروں پر لہرا رہی تھی۔ لیزلی جو نوالہ تک نہ اٹھا سکتا تھا یوں پیانو بجا رہا تھا جیسے اس کی ساری روح اس کی انگلیوں میں اتر آئی ہو۔ حکماء اور نفسیات کے ماہرین نے بڑی کھوج کے بعد یہ راز نکالا کہ لیزلی کے ذہن کا کوئی حصہ فالج کی زد سے بچ نکلا تھا بالکل ایسے ہی جیسے اتھاہ سمندر سے مٹی کا کوئی تودہ ابھر آئے اور رفتہ رفتہ ایک خوش نما جزیرہ بن جائے، وہ جزیرہ اب لیزلی کی تخلیقی قوتوں کی ناقابل تسخیر آماجگاہ بن گیا تھا۔

حبیب جالب یا وہ بچہ ہے جسے معاشرے نے اپاہج کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اس کی نظر دھندلانے اور گویائی سلب کرنے کے سب حربے آزما ڈالے یا وہ ماں ہے جس نے تمام آزمائشوں اور مصائب کے باوجود تخلیق کے ایسے منور اور تابندہ جزیرے کی حفاظت کی جس پر ہر سمت سے ظلمت کی یلغار تھی۔

حبیب جالب کی پچاسویں سالگرہ منائی گئی تو اہل نظر نے اپنی ادب نوازی کا حق ادا کیا۔ سبط حسن نے کہا جالب نے مظلوم کی حمایت کی سیاست کو اپنا دین بنایا اور خود ہی اپنے

اصولوں کی فصل کاٹی ۔ احمد ندیم قاسمی نے جالب کو آزادی اظہار اور جرات کی علامت قرار دیا ۔ وزیر آغا نے کہا جالب ایک مجسمہ ہے جو اندر اور باہر ایک ہے ۔ عبادت بریلوی کو جالب کے شعروں میں جہاد اور فارغ بخاری کو سوشلزم کے سراغ ملے ۔ انتظار حسین نے دریافت کیا کہ جالب کی شاعری کو پہلے قبول عام حاصل ہوا ' پھر خواص نے چار و ناچار انہیں قبول کیا ۔ محمد خالد اختر نے لکھا " سبحان اللہ کیا شخ تھے ' بھولے بھالے معصوم ' حقیقت میں مادر زاد ولی تھے ۔ حرف صادق القولی کے لئے ہزارہا نعمت دنیائے دوں پر لات ماری تھی اور گوشہ نشینی اختیار کی تھی ' اگرچہ تعلقات ظاہری بہت سوں سے تھے لیکن ایسی ہی بے تعلقی بھی حاصل تھی' باہر ہے ہم سے کچھ آگے قدم رکھا تھا ۔ "

یہ سب باتیں مناسب مگر اصل بات انکار اور احتجاج کی ہے جس نے جالب کے شعر کو لازوال بنادیا ہے ۔ انسان صدیوں سے ایک ایسے معاشرے کی جستجو میں ہے جو اس کی مادی ضروریات کا کفیل اور اس کی فکری اور تخلیقی قوتوں کی ترویج و تکمیل کا ضامن اور معاون ہو ۔ اب تک جتنے بھی معاشرتی نظام وضع ہوئے ہیں ان میں جبر و استبداد ' اور عدم مساوات کی قوتیں برسراقتدار رہی ہیں گو ان کی شدت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے ۔ عام آدمی اپنی مصلحتوں کی وجہ سے ان قوتوں سے مفاہمت کرلیتا ہے اور نظام استبداد کو تسلیم کرلینے ہی میں اپنی نجات سمجھتا ہے ' اگر وہ کبھی سر اٹھاتا ہے تو جبر کی ایڑی اسے وہیں کچل دیتی ہے ۔ زمیندارانہ اور جاگیرانہ نظام جس کی بنیاد ہی انسان کی تحقیر اور تذلیل پر ہے آج بھی کئی ملکوں میں بڑے طمطراق سے چل رہا ہے اور ننگی پیٹھوں پر تازیانے آج بھی اسی کروفر سے لگ رہے ہیں جیسے آج سے پانچ سو برس پہلے ۔

جو اقتصادی نظام اور طریق زرستانی ان ملکوں پر مسلط ہے جنہیں " آزاد دنیا " کا لقب دیا جاتا ہے وہاں حالت یہ ہے کہ چار میں سے تین آدمی مجبور و محکوم ' نادار و قلاش ہیں ایک طرف اناج کے ذخیرے اگر یکجا کر دیئے جائیں تو آسمان کو چھونے لگیں اور دودھ کی نہریں اگر بہادی جائے تو سطح سمندر پر سفیدی کی چادر بچھ جائے اور دوسری طرف لاکھوں انسان بھوک کا شکار ہیں اور موت کے انتظار کے علاوہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ۔

آج کی مہذب دنیا میں جہاں انسانی حقوق کے چارٹر اور کنونشن بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد قرار پاچکے ہیں ۔ جنوبی افریقہ میں ایک ایسا غیر انسانی طریق حکومت رائج ہے جہاں محض رنگ کی بنا پر ملک کی اکثریتی آبادی کو ہر انسانی حق سے محروم کردیا گیا ہے ۔ ریورنڈ ایلن بوساک (REVEREND ALAN BOESAK) جو کالوں کے حریت پرست لیڈر ہیں ایک ملاقات میں کہنے لگے " ہم لوگ ' ہمارے ماں باپ ' ہمارے بھائی بہن اور ہمارے بچے

ہ سمجھ گئے ہیں کہ ہمیں ایک ہی حق حاصل ہے اور وہ مرجانے کا حق ' اب ہم نے طے کیا ہے کہ یہ حق ہم خود استعمال کریں گے ' جب چاہیں گے اور جس طرح چاہیں گے ۔ "

صیہونی نظام کی بربریت مشرق وسطیٰ میں تباہی و بربادی کا سامان بنی ہوئی ہے ' فلسطین سے جبری طور پر نکالے ہوئے لاکھوں لوگ کیمپوں میں پناہ گزین ہیں اور انہیں وطن جانے اور وہاں دوبارہ اپنے گھر بسانے اور خود اپنا ملک بنانے کا حق حاصل نہیں ۔ کیمپوں میں فلسطینی بچے اور اسرائیلی سرحدوں کے قریب اجڑے ہوئے گھروں میں بیٹھے ہوئے بوڑھے مرد اور عورتیں اسرائیلی بندوقوں اور توپوں کی زد میں ہیں اور اگر آپ لندن میں یہ کہیں کہ پی ایل او حریت پسندوں کی جماعت ہے اور اس کے سربراہ یاسر عرفات ایک حریت پسند لیڈر ہیں تو امریکہ اور یورپ میں یہودی تنظیمیں آپ پر سام دشمنی کا ٹھپہ لگا کر آپ کو بدنام کرنے لگتی ہیں ۔

ایسی ہی وحشت اور بربریت کی فضا میں احتجاج کی آواز ابھرتی ہے ' شروع میں ایک فرد ور پھر عوام کی آواز بن جاتی ہے اور قصر استبداد لرزنے لگتے ہیں ۔ یہ آواز کبھی صوفی کی کبھی مفکر کی اور کبھی شاعر کی آواز بن کر گونجتی ہے مگر اس کا ہدف ہر صورت میں جبر ' نارسائی اور ناانصافی کا معاشرتی نظام ہوتا ہے ۔

منصور حلاج نے ایک ہی نعرے سے سارے معاشرے کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ' اس نے کہا اصل طواف تو کعبہ دل کا ہے تو سلطنت عباسیہ پر ' جو حرمین شریف کی محافظ بنی بیٹھی تھی رعشہ طاری ہوگیا ۔ اس نے کہا مجھے مار ڈالو کہ میری اور میرے خالق کی روح ایک ہے اور یوں مل چکی ہے جیسے مشک اور عنبر ایک دوسرے میں جذب ہوجاتے ہیں خلیفہ وقت اور اس کے وزیروں نے فیصلہ دیا کہ اس احتجاج کی آواز کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا جائے ۔ درباری فقیہہ اور منصف سب نے سر جھکادیئے اور منصور حلاج سورۃ شوریٰ کی یہ آیت پڑھتا ہوا " ان ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے وہ عذاب ان پر اس وقت آئے گا جب وہ اپنے کئے کے انجام سے ڈر رہے ہوں " آخری سانس کے ساتھ وہی ایک صدا نکلی " اناالحق " اور منصور ہمیشہ کے لئے سربلند ہوگیا اور احتجاج کی آواز زمان و مکان کی ہر قید سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہوگئی ۔

وہ نیلسن منڈیلا ہو یا یاسر عرفات سب منصور حلاج کی سنت پر عمل کررہے ہیں ' سب کا ایک ہی ایمان ہے کہ ظالم کا انجام بالآخر دردناک عذاب ہے ۔

اردو شاعری میں احتجاج کی تحریک نظیر اکبر آبادی سے حسرت موہانی اور ظفر علی خان تک پہنچی ' اقبال کے کلام میں اس آواز میں ایک عظمت پیدا ہوئی اور فیض نے اسے ایک

عمومی رنگ دیا ۔ آج حبیب جالب کے شعر میں منصور حلاج کی آواز گونجتی ہے ' وہ احتجاج کا علم اٹھائے گاؤں گاؤں پھرتا ہے دنیا کی خلعتیں ' عہدے ' رتبے اور آسائشیں اس نے اپنے لئے حرام کرلی ہیں ۔ دنیا سے بے تعلقی احتجاج کی راہ میں پہلا اور سنگین ترین قدم ہے یہ قدم ایک بار اٹھ جائے تو راہ آسان ہوجاتی ہیں ۔ اقبال نے کہا " یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند ' بتان وہم گماں لاالہ الا اللہ " اس قطع تعلق کی ایک عظیم مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے جب یروشلم کی یہودی عبادت گاہ میں انہوں نے حضرت مریم علیہ السلام سے کہا " عورت چلی جا ۔ میں نہیں جانتا تو کون ہے " ۔

احتجاج کا شاعر جب دنیا سے قطع تعلق کرلیتا ہے تو پھر وہ اپنی دنیا خود تخلیق کرتا ہے اس کی ذات میں ایک پوری کائنات ابھرنے اور سانس لینے لگتی ہے ' اور اس کائنات کے سب اجزاء اس کی روح اور فکر کے عکاس بن جاتے ہیں ۔ انگریزی میں کائنات کا متبادل لفظ COSMOS ہے جس کے ابتدائی معنی دنیا کے نظام کے حسن ترتیب کے تھے ' مگر COSMOS سے حسن ترتیب اگر غائب ہوجائے تو دنیا ظلم اور جبر کا ایک بھیانک سا ڈھانچہ ہوکر رہ جاتی ہے ۔ شاعر اپنی کائنات میں وہ حسن ترتیب جو دراصل مقصد حیات ہے دوبارہ پیدا کرتا ہے ۔ غالب کی کائنات میں اس کے اپنے شب و روز ہیں جہاں شہود و شاہد ومشہود کی کوئی تفریق نہیں اور جہاں سر پھوڑنے کی رسم کسی سنگ آستاں کی محتاج نہیں اور جہاں قطرہ ساز انا البحر ہے ۔

احتجاجی شاعر کی دنیا کے اپنے شہر ' اپنے گاؤں ' اپنے رستے ہیں اس دنیا میں لفظ بستے ہیں اور ان کی صدا صبح و شام گونجتی ہے ' یہاں لفظ خود اپنی حرمت کے امین ہیں اور اپنے حقوق کے ضامن ۔ اس دنیا کے شہری ناقابل فنا ہیں اس لئے کہ لفظ دائم اور ابدی ہے ۔ یہ صاحب کائنات شاعر صاحب دیوان شعراء کی صف میں نہیں آتا اس لئے کہ ان کا ہر لفظ ' ہر بول اپنا ہوتا ہے اس میں کسی اور کا رنگ یا جھلک نہیں ہوتی ' ان کا ہر لفظ اعلان کرتا ہے کہ میں غالب کے محلے کا ہوں نہ اقبال کے گاؤں کا ہوں ۔

شیکسپیئر کے بارے میں ایک نقاد نے لکھا کہ وہ لفظ استعمال ہی نہیں کرتا ان پر اپنا نام بھی لکھوا دیتا ہے ' اس نے ایک سانیٹ سے مثال دی ۔

I SUMMON UPWHEN TO THE SESSIONS OF SWEET
REMEMBRANCES OF THINGS PAST SILENT THOUGHTS

اس کے بعد جہاں کہیں بھی SESSION کا لفظ آئے گا اس پر شیکسپیئر کی مہر لگی ہوگی بالکل ایسے ہی جیسے رگ سنگ پر غالب کا نام لکھا ہے اور ذوق تن آسانی پر اقبال کی مہر لگی

ہے۔

جالب کی زبان ' جالب کا شعر ' جالب کا بیان سب اس کی اپنی دنیا کے شہری ہیں اور ان کی اپنی پہچان ہے اور ان کی اپنی آواز ہے۔ " ہم آوارہ " جس طرح جالب کے دل کی گہرائیوں سے نکلا اور ہمارے دلوں کی گہرائیوں تک اتر گیا اس کی مثال نہیں اس لئے کہ یہ کوئی فنی کمال نہیں آوارگی تو جالب کی دنیا کا مرکزی نقطہ ہے۔ آوارگی ہی کا شوق اسے اڑتے پتوں کے پیچھے لئے پھرتا ہے ' وہ سارے جہاں کی خاک اڑاتا پھرتا ہے کو فلک دشمن جان ' زمین غیر ہے کوئی اپنا نہیں۔ اور یہ حسن آوارگی ہی کا اعجاز ہے کہ وہ جہاں جاتا ہے ایک داستان چھوڑ آتا ہے۔

جالب کے جو نقاد یہ کہتے ہیں کہ جالب کی شاعری عارضی اور وقتی موضوعات پر مبنی ہے وہ بعض شخصیتوں اور بعض مخصوص واقعات میں اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ جالب کی دنیا تک پہنچ نہیں پاتے ' جالب نے جب یہ کہا کہ " ایسے دستور کو صبح بے نور کو ' میں نہیں مانتا ' میں نہیں مانتا " تو اس انکار کا تعلق ایک مخصوص آئین سے تو تھا ہی اور اس کی ضرب براہ راست اس آئین کے خالق پر پڑی مگر جالب کا موضوع ایک دائمی موضوع تھا وہ انکار تھا جبر کے ہر نظام سے وہ احتجاج تھا ظلم کی ہر دستاویز کے خلاف ابھی کل کی بات ہے کہ منیلا MANILA کے بازاروں میں یہی نعرہ گونج رہا تھا اور آج بھی جب جالب یہ کہتا ہے ——— ظلم کی بات کو ' جہل کی رات کو میں نہیں مانتا ' میں نہیں مانتا

تو اس کے اپنے شہر ہی میں نہیں جوہانسبرگ JOHANESS BERG کے زندانوں میں قیدی زنجیر بدست رقص کرنے لگتے ہیں۔

فقیہ اور فلسفی آج تک یہ طے نہ کرسکے کہ منصور حلاج کو " رد " کیا جائے یا " قبول " اور بہت سے اب بھی " توقف " فرما رہے ہیں مگر منصور کی رسم احتجاج تمام دنیا کی معتبر ترین رسم بن چکی ہے جالب کہتا ہے " کاٹ دو میرا سر ' کاٹ دو میرا سر " اور اعلان کرتا ہے۔

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے

جالب اگر شاعر نہ ہوتا تو ایک شعلہ ہوتا جو عمر بھر لپکتا رہتا ' جالب اگر شاعر نہ ہوتا تو ایک نعرہ ہوتا جس کی گونج سے اقتدار کے مسند لرزتے ' جالب اگر شاعر نہ ہوتا تو ایک سنگ تراش ہوتا جو جبر استبداد کے مہیب مجسموں کو پاش پاش کرتا اور پھر ان کے ٹکڑوں سے محبت اور سکون کی رنگین مورتیاں بناتا ' آج یہ مورتیاں ' یہ انکار کے شعلوں کی لپک یہ احتجاج کے نعروں کی گونج جالب کی کلیات حرف سردار کے ہر صفحے پر بکھری ہوئی ہیں۔

امین مغل

انسان دوست

اس نے برگ آوارہ ' سے اپنا شعری سفر شروع کیا ۔ وہ سرِ مقتل پر رکا اور اس نے اپنے مخالفوں کو نبرد آزمائی کی دعوت دی ۔ آج وہ ہمارے سامنے اس ملک کے عہدِ ستم کی داستان پیش کررہا ہے ۔ ہمارے پچھلے دس بارہ سال جس جذباتی اتار چڑھاؤ سے گزرے ہیں حبیب جالب کی شاعری اس کا لسانی خاکہ ہے ۔ عام لوگوں کی آہوں کی تصویریں ' محرومیوں کے نقشے اور پھر ان سب کے سیاہ گہرے رنگوں کو کاٹتا ہوا حوصلوں کے اظہار کا آتشیں خونیں رنگ ' ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز غریبوں کی بے چارگی کا فنا آشنا کرنے والی للکار ۔ حبیب جالب کی شاعری کا حسن ہیں ۔ اسکے کلام میں اس ملک کے لوگوں کے لئے پیار ہے اور ان کی بے حسی پر جھلاہٹ بھی ' ان کی مخفی بے پناہ بے کراں توانائیوں سے آگہی بھی ۔ ان کے بیدار ہونے پر خوشی کا اظہار بھی اور ان کے لئے مستقبل کی تابندگی کا پیغام بھی ۔ ہمتوں کی سرخوشی اور ولولوں کی مہک بھی ۔

انسان دوستی کی روایت نے زندگی گزارنے کے جو طریقے دریافت کئے ' ان میں ایک قلندری بھی ہے ۔ قلندری کی روش حبیب جالب کی زندگی ہے اور اس کی شاعری کی روح بھی ' قلندری ' شاعر کو یا صوفی بنا دیتی ہے یا مجاہد ' حبیب جالب کی قلندری مبارزت کی لذتوں کو سموئے ہوئے ہے ' اس کی عملی زندگی کا لمحہ لمحہ شعر بن کر ہماری تاریخ کا تابناک حصہ بن گیا ہے ۔

سیدھے سیدھے لفظ ' عام بول چال کا محاورہ ' وہ لفظوں کو لیتا ہے اور ان کو اس ڈھب سے ترتیب دیتا ہے کہ موسیقی چھلک پڑتی ہے ۔ لوگوں کی ثقافتی عصبیتوں کو لفظوں کی گرفت میں لے کر وہ ان کو مثبت جہت بخش دیتا ہے اور اس طرح ثقافتی عصبیتیں ایک مادی ہتھیار بن جاتی ہیں جس کو وہ نہایت چابکدستی سے روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے استعمال

کرتا ہے ۔ " پاکستان کا مطلب کیا ؟ لا الہ الااللہ " کا نعرہ آسمانی اور ارضی مفاہیم کا خزینہ بن کر ابھر آتا ہے ۔

حبیب جالب کو ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر حکمرانی پسند نہیں ۔ ہماری پچھلے دس بارہ سال کی سیاسی زندگی آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد کا مرقع ہے جس کسی نے اس عرصہ میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں ذی حس ہونے کا ثبوت دیا ہے اسے معلوم ہوگا کہ اس کے دل کی خلش کا اظہار جس بھرپور انداز میں حبیب جالب کی شاعری میں ہوا ہے وہ کسی اور ہم عصر شاعر کے ہاں نہیں ملتا ۔ خواہ جالب ۔ قائد اعظم کے حضور میں ہے یا صدر ستم گر کے دربار کے باہر ' وہ عوام کی حکمرانی کی بات کرتا ہے ' وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ

کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ

لیکن اس کی جمہوریت پسندی ایک تجریدی تصور نہیں بلکہ وہ اس حقیقت سے ابھرتی ہے کہ جمہوریت سے ہی انسانی برابری کی کونپلیں پھوٹتی ہیں ۔ ایسی برابری جو صرف سیاسی نعرے بازی کی بات نہیں بلکہ معاشی انصاف کی طرف بھی پہلا قدم ہے ۔ اسی لئے وہ صدر ستم گر کے سامنے محنت کشوں کی حکمرانی کی بات کرتا ہے ۔ قائد اعظم کے حضور وہ تیس روپیہ من آٹے کا شکوہ کرتا ہے ۔ پاکستان کے مطلب میں ایک عنصر وہ روٹی ' کپڑے اور دوا کا بھی شامل کرتا ہے ۔

حبیب جالب کی شاعری جھگیوں کی شاعری ہے ۔ چمنیوں کا دھواں اس میں تحسین پاتا ہے ۔ کسانوں کا پسینہ اسکی تازگی کا باعث ہے جھونپڑی اس کی پارٹی کا انتخابی نشان ہی نہیں اس کے خوابوں میں سے ایک خواب ہے ۔ ابھرتی ہوئی نوجوان نسل جو علم حاصل کرنے جاتی ہے اور جس کا گولیوں اور لاٹھیوں سے استقبال ہوتا ہے 'ور جس کی جان کی قیمت سے زیادہ کار کے شیشے کی قیمت پڑتی ہے اس کے نزدیک ہماری قوم کا سرمایہ ہے ' حبیب جالب محنت کرنے والوں کے گیت گاتا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے والٹ وٹ مین جمہوری آدمی کی ثناء گاتا ہے ۔

ایک طرف اس کو ان محنت کرنے والوں کے دکھوں کا احساس ہے تو دوسری طرف وہ ان کو آگے طرف بڑھتا ہوا انقلابی طبقہ بھی سمجھتا ہے ۔ ایسا طبقہ جس کو اقتدار حاصل کرنے میں بے شمار کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا ۔ ایسے میں وہ کندن لعل کا استعارہ تخلیق کرتا ہے جس کو پانچ کوڑے پانچ پانچ ماہ کی سزا محنت کش عوام کے راستے میں حائل مشکلات کا نشان بن جاتی ہے ۔

حبیب جالب کے ہاں لوٹ کھسوٹ کرنے والوں سے نفرت اس عظیم انسانی جذبے سے ابھرتی ہے جو تمام انسانیت کو ایک اکائی سمجھتا ہے جس میں رنگ نسل، عقیدے اور جنس کی قید نہیں، جغرافیائی حد بندیوں سے بے نیاز ہے۔

حبیب جالب اس بات سے آشنا ہے کہ اس کے سماج میں لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے ساتھی اور پشت پناہ اس ملک کی سرحدوں سے کہیں دور بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس ملک کو لوٹنے والوں کے پیچھے پوشیدہ سامراجی اور سرمایہ دار دیکھتا ہے۔ وہ غارت گر ایماں نکسن کی پاکستان آمد پر شور مچاتا ہے۔ عالمی سامراج سے دشمنی حبیب جالب کو ان حریت پسندوں کی یاد دلاتی ہے جو آج کرہ ارض پر ہر جگہ خوشحالی، امن، انصاف اور آزادی کے لئے جنگ لڑرہے ہیں اور وہ ہم سب کو نگاہ ہوچی منہ سے زندگی لینے کی تلقین کرتا ہے۔ شرق الاوسط کے المیہ میں صدر ناصر کی ذات اس کے لئے روح انسانی کی عظمت کا اشارہ بن جاتی ہے۔

اور پھر حبیب جالب یہ دیکھتا ہے کہ آج جبکہ اس کے اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں نت کش عوام اپنے حکمرانوں اور ان سامراجی آقاؤں کے خلاف جو جدوجہد کررہے ہیں ان میں ان کے معاون وہ سوشلسٹ ممالک ہیں۔ جہاں آج محنت کش عوام اپنے اقتدار کے پھول کھلا چکے ہیں۔ وہ سوشلزم کے خواب کو عملی شکل بخشنے والے لینن، اس کے عظیم وطن اور ساتھی ملکوں کو سلام کرتا ہے۔

حبیب جالب اپنے دشمنوں سے لڑتا ہے اور اس میں کسی رو رعایت کا روا دار نہیں۔ لیکن اس کی دشمنی اس شدید اور عظیم انسانی جذبے سے ابھرتی ہے جو تمام دنیا میں امن خوشحالی اور پیار کا دور دورہ دیکھنا چاہتا ہے تاکہ نسلِ انسانی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے حسن کے ان گنت شاہکار تخلیق کرسکے اور پھر تخلیق کرتی رہے اسی لئے اس کا منشور سارے جہاں سے پیار سکھاتا ہے۔ اس کے قلم کی امن دوستی سے ظلم بھی ڈرتا ہے۔

حبیب جالب کی شاعری پر جو گمنام قلم اٹھے گا وہ خود اس کی شاعری کے پارس سے چھو کر چمک اٹھے گا۔

سعیدہ گزدر

شوقِ آوارگی

آج اس شہر میں
کل نئے شہر میں
بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا
شوق آوارگی
اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے
فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا، مسکراتا رہا
شوق آوارگی
کوئی ہنس کے ملے
غنچہ جاں کھلے
چاک دل کا سلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا
شوق آوارگی

شوق آوارگی کا یہ سلسلہ نہیں رکا، بڑھتا گیا، پھیلتا گیا۔ بہت گہرا اور با معنی ہوتا گیا۔ جالب نے جو راستہ اپنی شاعری، اپنی سیاست اور اپنی زندگی کے لئے پہلے روز سے اختیار کیا اس میں کہیں تبدیلی نہیں آئی۔ لوگ آتے جاتے رہے ملتے اور جدا ہوتے رہے جالب کو دکھ دیتے رہے۔ سچائی اور سیاست کے ناطے ساتھ رہنے والے بہت سے، ساتھ

چھوڑ گئے ۔ مگر جالب نہیں بدلا ۔ راستے سے ہٹنے والوں کے بارے میں اس نے کہا

نہ سمجھیں گے انہیں اب اپنی منزل
جئیں گے اب نہ خوابوں کے سہارے
ہمارے واسطے ان کے افق میں
نہ سورج تھا نہ روشن چاند تارے
ہمارے خوں سے آلودہ ہیں جو ہاتھ
وہ ہاتھ ان کو بہت لگتے ہیں پیارے
کیا ہے جن میں جالب ذکر ان کا
بھلا دو تم بھی وہ اشعار سارے

اور آج جالب کے ساتھ ساتھ عوام بھی انہیں بھلا چکے ہیں ۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ جالب پر صرف شاعری کے حوالے سے بات کروں مگر یہ ناممکن ہے ۔ اس نے خود بھی تو شاعری کو اپنا ہتھیار بنایا ہے ۔ ظلم اور جبر کے خلاف ' غلامی اور بے بسی کے خلاف ' جہالت اور تنگ نظری کے خلاف ایک مسلسل جہاد ' خود اعتمادی اور سرشاری سے بھرپور کیفیت کا مکمل اظہار ۔

جالب کے بارے میں بڑے پہنچے ہوئے اور رتبے والے نقاد کہتے ہیں کہ وہ مشاعروں اور جلسوں کا شاعر ہے ۔ وقتی شاعری کرتا ہے اور بعض تو اس حد تک جھنجھلا جاتے ہیں کہ اس کی شاعری کو تک بندی اور اشتہار بازی قرار دیتے ہیں ۔ کیا حال سے بڑھ کر کوئی لمحہ اہمیت رکھتا ہے ؟ جو اپنے حالات اور گرد و پیش سے متاثر ہونے اسے سمجھنے اور اس پر سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔ وہ فنکار تو کیا انسان بھی نہیں ہیں فقط مٹی کے مادھو ہیں جن کی زبان اور قلم سے نکلے ہوئی الفاظ روشنائی خشک ہونے سے پہلے ہی دھواں بن کر اڑ جاتے ہیں ۔ جالب کی بے پناہ مقبولیت اس طرح کے حکم لگانے والے ادبی اور ثقافتی ' تخت نشینوں کی رہین منت کبھی نہیں رہی وہ زندگی کا شاعر ہے ۔ اس کی شاعری کو سن کر اور پڑھ کر ایک امید بندھتی ہے ۔ سچائی اور آزادی کے حصول پر یقین تازہ ہوتا ہے ۔

سرکاری قسم کے وظیفہ خوار ادیب اور دانشور جب جالب کی شاعری کو سیاسی شاعری اور اسی طرح کے باعزت ناموں سے نوازتے ہوئے اسے شاعر ماننے سے انکار کردیتے ہیں تو یہ جالب کے لئے بڑی عظیم بات بن جاتی ہے کیونکہ جالب کا ہاتھ تو مجمع کے دل تک پہنچتا ہے

اور وہ وہاں سے جذبات کی شدت ' محرومیوں اور مایوسیوں کی داستانیں اور امید اور حوصلے کا جوش کھینچ کر ہم تک پہنچاتا ہے ۔ وہ اپنے شدید ذاتی غم کو بھی اجتماعی بنا دیتا ہے ۔ جواں سال بیٹے کی موت پر اس کا دل خون کے آنسو روتا ہے ۔

پونچھ لے آنسو مری جاں
اے مری ہمدم نہ رو
اپنا بچہ ہوگیا بیمار آخر مرگیا
وہ بھی بچہ ہے جسے قاتل اٹھا کر لے گئے
جو نہ آنکھوں سے کبھی چھلکے وہ آنسو دے گئے
پھول کتنے ہی یہاں بوٹوں تلے روندے گئے
غم کا لشکر کتنے آنگن آنسوؤں سے بھر گیا
مل گئے ہیں خاک میں کتنی ہی ماؤں کے جگر
جانے والا تو فقط گھر کو ہی سونا کرگیا
اپنا بچہ ہوگیا بیمار آخر مرگیا

بہت بڑا دل چاہئے اپنے ذاتی غم کو ایسے ہمہ گیر اور آفاقی جذبے میں ڈھالنے کے لئے ۔

جالب کی شاعری میں روایتی حسن اور نزاکت کے ساتھ ساتھ آج کی دکھی زندگی کا پر آشوب درد شامل ہے اور آنے والے خوبصورت زمانے پر یقین بھی ۔ بے شمار تکلیف دہ مسائل میں گھرے رہنے کے باوجود وہ ہر لحہ خطرے کو للکارنے پر تلا رہتا ہے اور وہیں پر ستر ستر اسی اسی برس کے بوڑھے جنہیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ مرچکے ہیں اپنے آپ کو سینت سینت کر نہ جانے کس دن کے لئے بچا رہے ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ کو سچ بنانے پر تلے ہوئے ہیں جس کا اندازہ اسلام آباد میں ہونے والی ادیبوں کی سرکاری کانفرنس کو ٹیلیویژن پر دیکھ کر ہوتا ہے ۔

جالب کا فن تنہائی ' بے چارگی ' بے بسی اور بے گانگی کے احساس کو نہ صرف ختم کرتا ہے بلکہ انہیں شکست دیتا ہے ۔ قید خانے میں جب وہ اپنی بچی کو یاد کرتا ہے تو وہ ننھی سی معصوم بچی خود بخود اس بہت بڑے مظلوم طبقے کی بچی بن جاتی ہے جو آج مستقبل کی آس میں زندہ ہے ۔

میری بچی میں آؤں نہ آؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا

تیرے ننھے سے دل کو دکھوں نے
میں نے مانا کہ ہے آج گھیرا
تیری آشا کی بگیا کھلے گی
چاند کی تجھ کو گڑیا ملے گی
تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہوگا ستم کا اندھیرا
سچ کی راہوں میں جو مر گئے ہیں
فاصلے مختصر کر گئے ہیں
دکھ نہ جھیلیں گے ہم منہ چھپا کر
سکھ نہ لوٹے گا کوئی لٹیرا
میری بچی میں آؤں نہ آؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا

جالب کی شاندار نظمیں ان نقادوں کو بڑا شاعرانہ اور منہ توڑ جواب ہیں جو ادب کو سیاسی جدوجہد سے الگ دیکھنا چاہتی ہیں جبکہ بقول شوکت صدیقی سیاست تو آج ہماری خواب گاہوں میں داخل ہو چکی ہے۔ پھر بھلا کوئی حساس اور باشعور فنکار سیاست اور سیاسی کیفیت سے کس طرح منہ موڑ سکتا ہے۔ سیاسی صورتحال سے الگ تھلگ رہنے والا شاعر اور ادیب دراصل ایک پتھر ہے۔ سرمایہ دارانہ اور استحصالی نظام کا حامی اور پروردہ۔

ایک بہت بڑے اور بزرگ نقاد نے پاکستان کی موجودہ ذہنی، سیاسی اور جذباتی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ ایک ایسے کمرے میں بند ہیں جو کہ چاروں طرف مضبوط دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور ان دیواروں میں کہیں کوئی دروازہ، کھڑکی اور روشندان نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم سب ایک کھوکھلی قبر میں دفن ہیں۔ میں یہ پوچھونگی کہ پھر کیا ہم سب اس قبر میں بند رہیں؟ اور جالب کے پاس اس سوال کا جواب ہے۔ وہ کہتا ہے آؤ ہم مل کر ان دیواروں کو توڑ دیں، انہیں ڈھادیں اور ان کی جگہ ہمت، بہادری اور جوانمردی کی دیواریں کھڑی کردیں۔

روشنیوں کی راہ میں جو دیوار بنے گا۔
نہیں رہے گا
غاصب کو غاصب جو کھل کر نہیں کہے گا

نہیں رہے گا
گرتی ہوئی دیوار سے ناطہ توڑو بھی
خوش فہمو اب سامراج کو چھوڑو بھی
وقت کی جو آواز کو اب بھی نہیں سنے گا
نہیں رہے گا

آج جو نہیں لڑ رہا وہ بزدل ہے ۔ ہمارے کتنے ہی شاعر اور ادیب پیدائشی بوڑھے ہیں کیونکہ وہ شروع کرتے ہی شاعری برائے شاعری اور ادب برائے ادب کی بات کرنے لگتے ہیں ۔ تکنیک اور زبان کی نزاکتوں کے بہانے اس جذبے کو ہمیشہ کے لئے گنوا بیٹھتے ہیں جو سچائی اور حقیقت پسندی کی دین ہے ۔ یہ وقت ماضی کی خواب گاہوں میں رہنے کا نہیں بلکہ خوابوں کی تعبیر کا زمانہ ہے ایک طرف ہمارے سامنے انسانی عظمت اور وقار کی شاندار مثالیں ہیں اور دوسری جانب ہم ہیں غریب ملکوں کے عوام جن کی عزت کا مسئلہ بھیک کے چند نوالوں اور درآمدشدہ آسائشوں سے حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ ہماری تعلیم ، ہماری زندگی اور ہمارا ماحول سب کے سب ہمیں ادھورا ، ناکمل ، ذہنی طور پر مفلوج اور مغرب کی بھڑکیلی دولت پرست طاقتوں کا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں ۔ جالب اس ذہنی اور معاشرتی پسماندگی کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اس کی شاعری دراصل وضاحت ہے ۔ ہماری بیس سالہ تاریخ کی اس لحاظ سے اگر کسی فنکار نے اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو باخبر رکھا ہے ، جھنجھوڑا اور جگایا ہے تو وہ صرف جالب ہے ۔

انھیں کہ نہ انھیں یہ رضا ان کی ہے جالب
لوگوں کو سر دار نظر آ تو گئے ہم

وطن اور مملکت سے وفاداری کا ڈھونگ پیٹنے والے بنگلہ دیش میں فوجی کارروائی کے وقت خاموش تھے یا حکومت کی شان میں قصیدے اور ترانے لکھ رہے تھے ۔ جبکہ ہمیشہ غدار اور ملک دشمن کہلانے والا جالب کہہ رہا تھا ۔

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے

جیسے جیسے پاکستان میں طبقاتی تضاد ، سیاسی پابندیاں اور سختیاں بڑھی ہیں ویسے ویسے جالب کی شاعری بھی زیادہ مقبول ہوئی ہے ۔ لوگوں نے اسے دل و جان سے اپنایا ہے پھر

بھلا جالب کی شاعری کو وقتی شاعری کیسے کہا جاسکتا ہے ؟ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ موقع پرست نہیں ہے ' ایک آبرو مندانہ زندگی کی آرزو اور اس کے حصول کے لئے سب کچھ داؤ پر لگا دینا جالب کا شیوہ ہے ۔ اس سرفروشی کی سزا اسے بار بار بھگتنا پڑی ہے ۔ مگر وہ کیا کرے کہ اس کا خمیر ہی ان جذبوں سے اٹھا ہے جو نیکی ' دردمندی اور جاں بازی سے لبریز ہیں ۔ جالب نے اپنی شاعری اور بے پناہ شہرت کو عام رواج کے مطابق اپنا کیریئر نہیں بنایا

بہت مشکل میری پہچان ہوگی
بدل ڈالوں اگر میں اپنا لہجہ

اسلامی کھیل ' اسلامی بینک ' اسلامی کلچر ' اسلامی قانون ' اسلامی تاریخ اور مسلم خواتین کے بعد اب ادیبوں ' شاعروں اور صحافیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ وہ اسلام کے لئے لکھیں ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس ادیب اور شاعر نے اسلام کے خلاف کچھ کہا اور لکھا ہے ؟ ہاں جو شاعر اور ادیب اس جنون اور کٹر پن کا شکار نہیں بننا چاہتے ہیں ان کے خلاف فتوے صادر کئے جاتے ہیں ۔ ایسے حملوں کی زد میں جالب کا آنا قدرتی ت ہے ' مگر وہ ان حملوں کی پروا ہی کب کرتا ہے ۔ اس کا اسلام تیل والوں کا اسلام نہیں ہے ۔ یہ محبت ' شرافت ' درد مندی اور سب کے لئے یکساں خوشحالی کا اسلام ہے ۔

خطرہ ہے زرداروں کو
گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو
خطرے میں اسلام نہیں

، فاشزم کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے پالتو لوگوں کو کتابوں اور کلچر سے متنفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ' پھر وہ مقصدی ادب کا مذاق اڑاتے ہیں ' گھٹیا باتیں بامقصد ادب کو نیچا دکھانے کے لئے کی جاتی ہیں ' لکھی جاتی ہیں ۔ کمیٹڈ شاعر اور ادیب کی حیثیت کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ انہیں جالب پر اعتراض کرنے کا ایک اور نکتہ مل جاتا وہ کہتے ہیں کہ جالب اپنی آواز کے سبب مقبول ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ جالب کو اس کی آواز سے الگ کرنا ناممکن ہے اس کی نرم ' سلجھی ہوئی اور پر درد آواز جب جلسہ گاہوں اور مشاعروں میں گونجتی ہے تو نہ جانے کتنی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ' ہزاروں دل کچھ کر گزرنے ' کچھ سہ جانے کے لئے تڑپ اٹھتے ہیں ۔

مشہور شاعر پابلو نرودا سے چلی کے آمر اس لئے خائف تھے کہ اس کی دکھ بھری آواز

لاطینی امریکہ کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی، کچلے ہوئے اور درماندہ عوام کی آواز! سی آئی اے کے ایجنٹ اور شکاری کتے، نرودا کا پیچھا کرتے تھے کہ کسی طرح وہ ہاتھ آئے اور اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیں۔ آج جالب کی آواز سے بھی اقتدار پر قابض لوگ خائف ہیں۔

انہیں معلوم ہے کہ سچائی جالب کی مجبوری ہے وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا۔ جب لوگوں کے بیچ میں جاتا ہے تو نتائج کی پروا کئے بغیر دل کھول کر سچ بولتا ہے اسی لئے اس پر ملک سے باہر جانے کے دروازے بند ہیں۔ نرودا سے اس کے ہتھیار بند دشمن بے پناہ خائف تھے کیونکہ وہ ساری دنیا میں بغیر کسی خوف کے ان کے مظالم اور منافقوں کے پول کھولتا پھرتا تھا۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں جب وہ جلا وطن رہا تب بھی برابر اپنے ملک میں غریب اور دکھی عوام کے لئے کام کرتا رہا۔ آج کون ہے جو اس کی شاعری کی عظمت کو اس کی سیاست سے دور کر سکتا ہے۔ بے معنی اور مطمئن زندگی کو وہ اپنے اور اپنے فن کے لئے موت سمجھتا تھا۔ جالب نے بھی ابھی تک ہمیشہ اپنے عمل اور شاعری کے ذریعے اسی اصول کا پرچار کیا ہے۔

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے
بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سر گلستاں چھوڑ آئے
تیرے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

جمہوری تحریکوں کے حوالے سے جالب پر لکھتے ہوئے اس کے کام کے تسلسل پر خود بخود نظریں ٹھہر جاتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی اور سیاسی سلسلہ جس نے ہر عہد کی محرومیوں اور تحریکوں کو شاعرانہ لب و لہجہ عطا کیا۔ کئی سال پہلے جالب نے لکھا تھا۔

جمہوری تحریک ہے یہ اب روکے سے نہیں رکتی
کسی بھی آمر کے آگے نہیں گردن اپنی جھکتی

اور آج جب وہ کہتا ہے کہ

دینا پڑے کچھ بھی ہرجانہ سچ ہی لکھتے جانا
مت گھبرانا ' مت ڈر جانا ' سچ ہی لکھتے جانا
باطل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی بجھ پائیں
وہ شمعیں روشن کرجانا سچ ہی لکھتے جانا
پل دو پل کے عیش کی خاطر کیا دینا کیا جھکنا
آخر سب کو ہے مرجانا سچ ہی لکھتے جانا

تو یہ بڑا تکلیف دہ انکشاف ہے جمہوریت اور آزادی سے ہماری مسلسل محرومی کا۔ لوگوں کی ایک دوسرے سے دوری آمریت کی کامیابی ہے۔ آج ہمیں ایک دوسرے سے بے گانہ کرنے ' احساس تنہائی اور شک و شبہ کی کیفیت میں مبتلا رکھنے اور ایک دوسرے کی سوچ اور درد و غم سے آشنا رکھنے کے لئے سنسر شپ اور طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے جارہے ہیں اور اسی لئے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے ہمدردی کی آج جتنی شدید ضرورت ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ جالب کو سرکاری اہمیت ملنے کی توقع ہے نہ خواہش ' اسے عام لوگوں نے ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ آج جب کہ بہترین اور مخلص کارکن صحافی ڈائجسٹوں اور ایسے ہی بے تکے پرچوں میں کام کرکے اپنی صلاحیتوں کا خون کرنے پر مجبور ہیں ' پریس کلب کی یہ شام ایک بہت بڑی ضرورت اور کمی کو پورا کررہی ہے۔ اور میں جالب سے یہی کہوں گی کہ اس ملک کے بہترین لوگ ان کے ساتھ ہیں۔

کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

(یہ مضمون جالب کو تاحیات رکنیت دینے کی تقریب کے موقع پر ۲۵ دسمبر ۱۹۸۰ء کو کراچی پریس کلب میں پڑھا گیا۔)

(حرفِ حق کا پیش لفظ)

عندلیب شادانی

برگِ آوارہ

ایک سال ہونے کو آیا دہلی کی بزم سخن میں پاکستان کے ایک جواں سال شاعر حبیب جالب کو دیکھا اس کا کلام اس کی زبان سے سنا۔ اب تک اس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے اور اس کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں نامرادیوں کی ترجمان ' کتنا درد ' کتنا سوز کتنی کسک تھی اس کی آواز میں۔ کتنی تڑپ ' کتنا گداز ' کتنی دلاویزی تھی اس کے اشعار میں ' کانوں تک پہنچتے ہی دل میں اتر جاتے اور سننے والے کو بے اختیار شاعر کی زندگی کے غم کدوں میں لے جاتے۔ اس کی روئیداد حیات کے منتشر اجزاء میں نے اس کے اشعار سے جمع کئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا۔

پچھلے چند سال میں طوفان حوادث نے کتنی پر سکون بستیوں کو انقلاب کا گہوارہ بنا دیا ' اور کتنے امن پسند انسانوں کو وطن آوارہ کر دیا۔ خدا جانے کن حالات کی چیرہ دستیوں نے اس جواں سال شاعر کو اس کے وطن سے اٹھا کر غربت میں پھینک دیا۔ جوان دل کی ساری امنگیں ' سارے ولولے سسک سسک کر موت کی گود میں جا سوئے۔ گزری ہوئی دلنواز ساعتوں کی جاں گداز یادوں کے سوا اب کچھ بھی اس کے پاس باقی نہیں رہا۔

مولانا غنیمت نے پنجاب کو "حسن آباد اور انتخاب ہفت کشور" کہا تھا۔ لاہور اسی حسن آباد اور انتخاب ہفت کشور کا دل ہے۔ تہذیب و تمدن کا مرکز ' حسن و جمال کا گہوارہ۔ نئی اصطلاح کے مطابق "شہر نگاراں" اور "روشنیوں کا شہر" یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک خوش ذوق انسان تمنا کر سکتا ہے۔ یہ حرماں نصیب شاعر بھی اسی رومانی بستی میں کہیں بستا ہے۔ مگر یہاں کی سب کچھ بھلا دینے والی نشہ آور زندگی ' چھوٹ جانے والے دیس کی محبوب یادیں اس سے نہ چھین سکی۔ اس کی زبان سے اس سرزمین کا تذکرہ سنئے تو دل بے اختیار اس طرف کھنچنے لگتا ہے۔ فطرت کے دل کشا مناظر کا ایک طویل سلسلہ

آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے اور گوناگوں جذبات کا سمندر موجیں مارنے لگتا ہے ۔

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دل نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ وہ دریا وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے
حسین پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رت وہ سماں چھوڑ آئے
وہ حسین پھول ' وہ سبزہ ' وہ نسوں ساز دیار
وہ مدھر گیت محبت بھرے دریاؤں کے

وہ سرسبز و شاداب وادی ' وہ گاتی گنگناتی ہوئی ندیاں ' وہ گھنیرے درخت ' وہ ہرے بھرے کھیت ' وہ گل پوش سبزہ زار اور وہ فضا میں گونجنے والے الہڑ البیلی معصوم دوشیزاؤں کے مدھر گیت ایسی رومانی فضا میں سانس لینے والے انسان سے اگر حوادث روزگار ' یہ روح پرور ماحول چھین لیں تو اس کے دل میں کس طرح نشتر نہ ٹوٹیں گے ۔ درحقیقت صرف ندیوں کے گیت اور گل پوش وادی ہی اس سے نہیں چھوٹی بلکہ وہ متاع عزیز بھی اس سے چھن گئی جسے وہ غزل ' کبھی جان غزل ' کبھی مہتاب ' کبھی نزہت مہتاب اور کبھی نازش خورشید کہتا ہے ۔

لوگ کہتے ہیں ترا نام نہ لوں
میں تجھے مہتاب کہہ لوں گا
اے نزہت مہتاب ترا غم ہے مری زیست
اے نازش خورشید ترا غم ہے مری جاں

یہی سبب ہے کہ جب وہ اپنے دیس کو کہ وہی دیار محبوب بھی ہے یاد کرتا ہے تو اس کا لفظ لفظ حسرت و نامرادی کی تفسیر بلکہ تصویر بن جاتا ہے ۔ اس کی روئیداد حیات ایک سیدھا سادہ المیہ ہے ۔ کوئی غیر معمولی ' نادر یا عظیم سانحہ نہیں ۔ ہماری سوسائٹی میں اس قسم کی الم انگیز داستانیں خدا جانے ہر روز کتنی بار دہرائی جاتی ہیں ۔

اس کے دل میں احساس محبت جاگ اٹھا ہے اور نیاز حریم ناز تک جا پہنچتا ہے ۔ تمنا کی پذیرائی لطف و کرم سے ہو رہی ہے ۔ محبت کا جواب محبت سے مل رہا ہے ۔ چھپ چھپ کر

ملاقاتیں ہوتی ہیں - لوگوں کو پتہ لگ گیا ہے اور وہ اس سلسلے کو منقطع کر دینا چاہتے ہیں شاعران دراز اندازوں کی اور ان کے اس طرز عمل کی مذمت کرتا ہے - ہر چند لوگ سد راہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ خطروں میں پڑ کر اور نگہبانوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنی محبوبہ تک پہنچ ہی جاتا ہے -

تو رنگ ہے ' غبار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پھول ہے شرار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو رونق حیات ہے ' تو حسن کائنات
اجڑا ہوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پیکر وفا ہے مجسم خلوص ہے
بدنام روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ
پھر جارہا ہوں تیرے تبسم کو لوٹ کر
ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

محبت کی ناقابل فہم زود رنجیاں کہاں نہیں ہوتیں - محبت کرنے والوں کے درمیان کبھی کبھی بے بات کی بات پر آزردگی پیدا ہو جاتی ہے - پھر آپ ہی آپ صلح ہو جاتی ہے نہ اس کی کوئی معقول وجہ ہوتی ہے نہ اس کی - غالبا اسی قسم کی کوئی بات ہوئی کہ اس نے کوئے محبوب میں جانا چھوڑ دیا - یہ کھنچے تو وہ کیوں جھکیں - کہلا بھیجا کہ ہم ایسے ہی برے ہیں اور ہمارے یہاں آنا آپ کے لئے ننگ و عار ہے تو پھر اس شہر ہی کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے نہ آپ یہاں ہوں گے نہ ملنے کا سوال پیدا ہوگا - اس نے جواب دیا :

یہ اور بات ' تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مگر پھر آزردگی کچھ اور بڑھ گئی اور بالاخر اس نے کہہ دیا کہ اچھا اگر تمہاری ایسی ہی خوشی ہے کہ ہم اس شہر سے چلے جائیں تو ہمیں اس میں بھی کوئی عذر نہیں - تمہاری یاد تو بہرحال ساتھ جائے گی اور ساتھ رہے گی - مگر جانے سے پہلے ایک تمنا ہے ' وہ پوری کر دو بس آخری بار ایک غزل سن لو - زندگی میں پھر ایسا موقع کا ہے کو آئے گا -

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے

دور افتادہ بستیوں میں کہیں
تری یادوں سے لو لگائیں گے
شمع ماہ و نجوم گل کر کے
آنسوؤں کے دیئے جلائیں گے
آخری بار اک غزل سن لو
آخری بار ہم سنائیں گے

غرض ناز و نیاز کے یہ سلسلے ایک مدت تک اسی طرح چلتے رہے اور بالآخر وہ وقت آپہنچا کہ ایک بیگانے کی دولت و امارت ان کی محبت کے درمیان حائل ہو گئی۔ والدین کو لڑکی کی شادی کی فکر ہوئی۔ دولت نے حسن کو خرید لیا۔ محبت محروم رہ گئی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نامراد چاہنے والا دھک دھک کرنے والے دل کو سنبھالے۔ اس جاں گسل ساعت کا منتظر ہے۔ محبوب کو پا لینے کے تمام امکانات تھوڑی دیر میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت اس کا دماغ کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے

آخر کار یہ ساعت بھی قریب آپہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کل تلک میرا مقدر تھی تری زلف کی شام
کیا قیامت ہے کہ اب غیر کی کہلائے گی
میرے غم خانے میں اب تو نہ کبھی آئے گی
تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب! کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عین خوشی کے ہنگام
تری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا

تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا
میری دم ساز! زمانے سے چلی آئی ہیں
رہن غم، وقف الم سادہ دلوں کی آنکھیں
یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پر
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رو لیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

یہ نظم فقط شاعر کے ذاتی تاثرات کا اظہار ہی نہیں بلکہ سماج کی دھاندلی پر ایک دل نشین اور دھیمی طنز بھی ہے جو غیر محسوس طریقے پر قاری کو متاثر کرتی اور اسے سماج کی اس زبردستی کے خلاف بغاوت پر اکساتی ہے

آخر شادی ہو گئی۔ دلہن رخصت ہو رہی ہے۔ شاعر کی نظروں میں دنیا اندھیر ہے ایک طرف محبوب کی الم نصیبی کا احساس اس کا کلیجہ شق ہو رہا ہے۔ ہائے اس ناز پروردہ کا نازک دل کیوں کر اس غم و اندوہ کا متحمل ہوگا۔ دوسری طرف خود اپنے دل سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اپنی نامرادی کا تصور جاں گسل اور روح فرسا ہے۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آرہے ہیں اور اشعار میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔

رخصتی

تو کلی، نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہر گل، سوئے صحرا چلی
وہ سلگتا دیا، تو سحر کی کرن
سوچتا ہوں یہی، کیسے بہلے گا من
دھڑکنوں کو سکوں کیسے بخشے گا دھن
لوگ تجھ کو کہیں گے نصیبوں جلی
تو کلی، نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہر گل سوئے صحرا چلی
تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سحر
اب کہاں کہکشاں وہ حسیں رہگزر
شام غم چھائی ہے دیکھتا ہوں جدھر
کتنی ویران ہے آج تیری گلی
تو کلی، نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہر گل سوئے صحرا چلی

کتنی سادہ کتنی لطیف اور کتنی حسین ہے یہ نظم کتنی رواں دواں اور خوش آہنگ اور پھر کتنی پر تاثیر، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے قلم کو اپنے دل کے خون میں ڈبو کر لکھا ہے۔

اس سانحے کے بعد شاعر کی زندگی کا ایک دور تمام ہو جاتا ہے۔ اب تک صرف غم جاناں سے سابقہ تھا۔ اس کے بعد غم دوراں سے مقابلہ ہے۔ ایک غریب الدیار انسان، بیگانے دیس میں، محبت سے محروم، رفاقت کا بھوکا، کسی سہارے کی تلاش میں سرگرداں ہے اور کوئی سہارا نہیں ملتا۔ اس کی نغمہ سنجی، نوحہ گری میں تبدیل ہو گئی ہے۔ خوش نصیب لوگ مسرور ہیں کہ حوادث روزگار نے ایک نئے اور خوش آئند دور کا آغاز کیا ہے۔ مگر شاعر کا حساس دل اور حقیقت نگر آنکھیں خوشی کو ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں:

گلشن کی فضا دھواں ہے کہتے ہیں بہار کا سماں ہے
بکھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
ٹوٹی ہوئی شاخ آشیاں ہے
جس دل سے ابل رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے
ہم ہی نہیں پائمال تنہا
اے دوست تباہ اک جہاں ہے
ماہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محو تماشائے سر راہگزر ہیں
حسرت سی برستی ہے در و بام پہ ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

مگر شاعر کی خود داری اور غیرت مندی، ہر حالت میں اپنی عزت نفس کی محافظ ہے۔ اسے دولت کے بوجھ سے نہیں جھکایا جا سکتا محبت کے زور سے رام کیا جاسکتا ہے۔

بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سر بازار
ہم یوسف کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں
ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہت مہتاب ہیں، ہم نور سحر ہیں

اسی عالم میں بیتے ہوئے دنوں کی یادیں اکثر اسے گھیر لیتی ہیں اور اس کا دل حسرتوں میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ وہ مجبور آزادیاں، وہ محبوب کی پرستاریاں، وہ نشاط آگیں خلوتیں، وہ شعر و سخن کی صحبتیں، ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ مگر یہ حسرتیں

' یہ نامرادیاں ہر روز اس کی صلاحیتوں کو نکھار نکھار کے اسے ایک بہترین فنکار بناتی جارہی ہیں :

لوک گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا
جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گلِ تر یاد آیا
ہم زمانے کے ستم بھول گئے
جب ترا لطف نظر یاد آیا
تم بھی مسحور تھے اس شب سر بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا
پھر ہوا درد تمنا بیدار
پھر دل خاک بسر یاد آیا
ہم جسے بھول گئے تھے جالب
پھر وہی راہ گزر یاد آیا

اور یہ تاثرات آہستہ آہستہ اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ دل بے اختیار دیار محبوب کی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ ہر چند کہ محبوب سے ملنے کا کوئی امکان نہیں ' کوئی امید نہیں ' پھر بھی ایک ناموہوم کشش ' تمام خطرات سے بے نیاز کر کے "ادھر" چلنے پر مجبور کرتی ہے :

پھر دل سے آرہی ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتا ' اس گلی میں چل
وہ بام و در ' وہ لوگ ' وہ رسوائیوں کے زخم
ہیں سب کے سب عزیز جدا ' اس گلی میں چل
اس پھول کے بغیر بہت جی اداس ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کے ذرا اس گلی میں چل
جالب پکارتی ہیں وہ شعلہ نوائیاں
یہ سرد رت ' یہ سرد ہوا اس گلی میں چل

جالب کے اشعار کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جالب کی

روئیداد حیات اس کے دماغ کی ایجاد نہیں بلکہ حالات کی پیداوار ہے ۔ اس نے سوچ سوچ کر دماغ سے مضامین پیدا نہیں کئے بلکہ اپنے محسوسات اور واقعات کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے ۔ اس کے اشعار میں تاثیر اور سوز و گداز کا بڑا سبب اس کے جذبات کا خلوص اور صداقت ہے ۔ حسن بیان کی دلآویزی نے اس میں اور بھی چار چاند لگادیئے ہیں ۔ اس کی تشبیہات میں تازگی اور استعاروں میں ندرت ہے ۔ مصرعوں کی چستی ' روانی اور خوش آہنگی پڑھنے والے پر ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے ۔ سادگی و پرکاری کے کرشمے جا بجا نظر آتے ہیں ۔ بحریں عموماً ایسی اختیار کی ہیں جو مترنم ہونے کے ساتھ غم آگیں خیالات و حالات کے اظہار کے لئے نہایت موزوں ہیں اور شدت تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں ۔ حسین ترکیبیں اور ان کا اچھوتا پن قدم قدم پر دامن نظر کو تھام لیتا ہے ۔ مطالعے کے دوران یہ نابناکیاں اہل نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں ۔ اس لئے میں ان کی نشاندہی ضروری نہیں سمجھتا ۔ اس زمانے میں جب کہ صحت زبان کی طرف سے عام طور پر بے اعتنائی برتی جاتی ہے ' یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ "برگ آوارہ" شروع سے آخر تک زبان کی اغلاط سے پاک ہے ۔ پوری کتاب میں دو شعر ایسے نظر آئے جو قواعد زبان کی رو سے محل نظر ہیں ۔

"برگ آوارہ" کا اغلاط زبان سے پاک ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ لکھنے والا زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہے اور اس کے صحیح استعمال پر پوری قدرت رکھتا ہے ۔ "برگ آوارہ" کو جالب کی "آپ بیتی" کہنا یقیناً درست ہے ۔ جہاں سے کھولیئے ' جہاں سے پڑھیئے ' اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ سامنے آجاتا ہے ۔ اب میں "برگ آوارہ" سے چند اشعار نقل کرتا ہوں اور ارباب ذوق کو دعوت فکر و نظر دیتا ہوں

شاید بجید زیست وہ ساعت نہ آسکے
تم داستان شوق سنو اور سنائیں ہم

بہار آکے چلی بھی گئی مگر جالب
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں

اس گلی میں کیا کھویا ' اس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے ' تشنہ کام لوٹ آئے

پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج تیرتے ہوئے سائے

اک عمر رہے منتظر عہد بہاراں
اک عمر بہ اندیشۂ خام رہے ہم

اس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب
اس پھول کو چھونے میں بھی ناکام رہے ہم

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غم جہاں تونے یہ بھی دن دکھائے ہیں

تیرے بام و در سے دور تیری رہگزر سے دور
رات کی سیاہی ہے ' تیرگی کے سائے ہیں

اس نگاہ سے جالب رسم و راہ کی خاطر

میرے نزدیک جالب اساسًا غزل کا شاعر ہے ۔ اس لئے میں نے اپنے تاثرات کے اظہار کو صرف اس کی غزل تک محدود رکھا ہے ۔ جالب کی غزل کے متعلق دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کے یہاں انفرادیت نمایاں ہے ۔ مضامین و خیالات میں بھی اور طرز ادا میں بھی ۔ اور اس انفرادیت کی وجہ وہی ہے کہ اس کے یہاں جو کچھ ہے حال ہے قال نہیں ہے اور ہے بھی تو برائے نام ۔ اس کے اشعار اس کی منظوم آپ بیتی ہیں ۔ انفرادیت لچر اور پوچ قسم کی بھی ہو سکتی ہے ۔ لیکن جالب کی انفرادیت مستحسن ہے ' مذموم نہیں ۔ آج اردو غزل گو شعراء کا شمار مشکل ہے ۔ ان سب کے کلام میں یکسانی پائی جاتی ہے اور اس یکسانی کا سبب یہ ہے کہ وہ اکثر رسمی اور تقلیدی غزل کہتے ہیں ۔ نہ خیالات ان کے اپنے ہوتے ہیں نہ طرز ادا مقررہ مضامین کو مقررہ سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک قالب یہ سانچے سے جو چیزیں نکلیں گی وہ لازمًا یکساں ہوں گی ۔ خصوصًا جب کہ وہ ایک ہی مادے سے تیار کی گئی ہوں ۔ جالب کا مواد بھی اپنا ہے اور مواد کی مناسبت سے سانچا بھی اپنا ۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں انفرادیت جلوہ گر ہوتی ہے ۔

دوسرے یہ کہ جالب نے اپنی غزل کو داخلی واردات کے بیان تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے دور کے سماجی اور سیاسی حالات کو بھی موضوع سخن بنایا ہے ۔ ان موضوعات پر اس کی طنزیہ نظمیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ۔ ان نظموں میں بھی جالب کا اپنا انفرادی رنگ نمایاں ہے ۔ میں اس مضمون کو "برگ آوارہ" کی سب سے پہلی غزل پر تمام کرتا ہوں ۔

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ ، موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسوں بہتے ہیں
ایک ہمیں آوارہ کہنا ، کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں
جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کے لئے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں
وہ جو ابھی اس رہگزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں
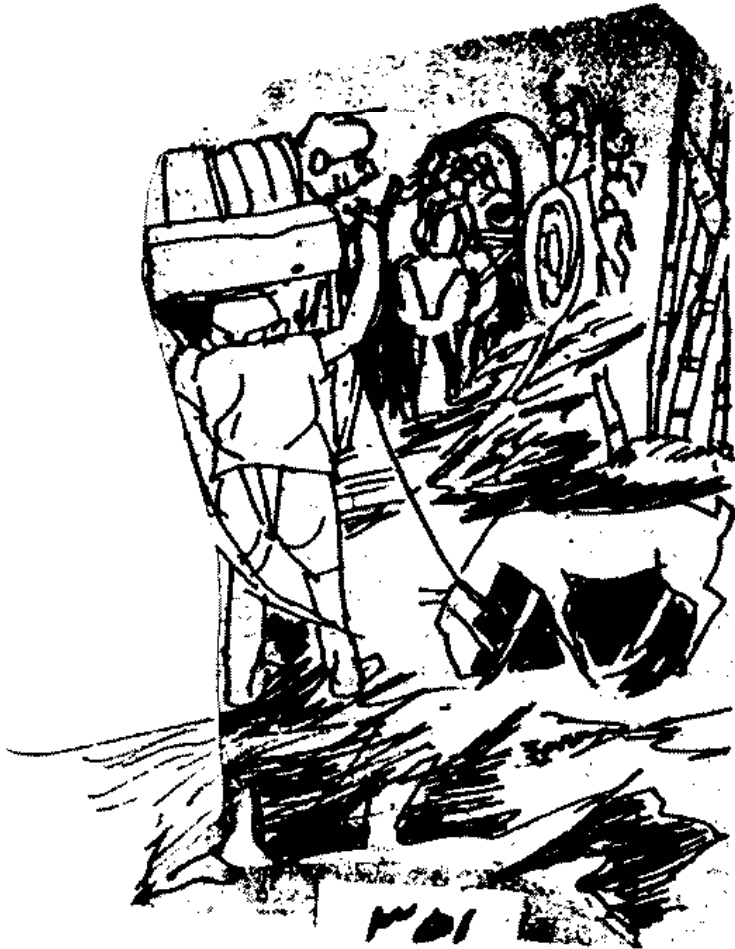
قسور گردیزی

قفس در قفس

ایک روایت ہے کہ حیدر آباد سنٹرل جیل ہو ۔ اس میں مقدمہ سازش چل رہا ہو سیاسی ملزمان میں سے ایک سیاستدان ملک کا کوئی نامور شاعر ہو وہ جیل میں کوئی کلام مرتب کرے تو جیل کے کسی ساتھی کو ہی اس کا پیش لفظ لکھنا ہوگا ۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب میں کھڑا اپنے سیل نمبر ۱۹ کی صفائی کررہا تھا تو جب جالب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ان کے نئے مجموعہ کلام "گوشے میں قفس کے" کا پیش لفظ لکھنا ہوگا ۔ جالب صاحب کو انکار کرنا ممکن نہ تھا ۔ کیونکہ وہ دوستی کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوئے ہیں میں نے اپنی بے چارگی کو چھپاتے ہوئے اس پر بے پایاں مسرت کا اظہار کیا مگر مٹھیاں بھینچنے کے باوجود ایک ایک کرکے میرے ہاتھوں کے سب چھوٹے بڑے طوطے اڑ گئے کیونکہ مشاعرے میں اٹھ اٹھ کر کسی شعر کی داد دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ داد دینے والا محض واجبی سا شعر کہتا ہے اور مجمع بحر منجمد شمالی کی طرح پرسکون اور سنسان ہوتا ہے تو سامعین میں سے کسی "صاحب ذوق" کی پسلی پھڑک اٹھتی ہے اور وہ اٹھ کر داد دینا شروع کردیتے ہیں ۔ مگر پھر چار سو ہو کا عالم دیکھ کر کچھ کھسیانے بھی ہوتے ہیں اور کپڑے جھاڑ کر پھر اپنی نشست پر لڑھک جاتے ہیں ادب عالیہ کے متعلق اپنا بھی کچھ یہی عالم ہے ۔ خیر جالب صاحب تو حکم فرما کر واپس اپنے سیل میں چلے گئے اور میں اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے اس کام کی انجام دہی کے لئے کبھی ایسے موزوں آدمی کی تلاش میں رہا جس پر جالب صاحب بھی متفق ہوجائیں ۔

ہم لوگوں کو ۳۰ ر اپریل ۱۹۷۶ء کی صبح کو ملک کے مختلف حصوں سے گرفتار کیا گیا تھا ۔

میں اسلام آباد میں اپنے کسی عزیز کی بچی کی شادی سے فارغ ہوکر صبح گاڑی میں سامان رکھ کر گورنمنٹ ہوسٹل میں سینٹ کے لیڈر آف اپوزیشن جناب محمد ہاشم خان غلزئی کو الوداع

کہنے گیا تھا ۔ غلزئی صاحب اسمبلی کے لئے تیاری فرما رہے تھے ۔ اور ساتھ ہی اپنے چند قدردانوں کے سامنے حالات حاضرہ پر سیر حاصل تبصرہ کر رہے تھے کہ ایف آئی اے کے ایک آفیسر صاحب سفید کپڑوں میں نمودار ہوئے ۔ میں نے معاملہ کی نوعیت کا اندازہ کرلیا در مسکرا کر ان کا استقبال کیا ۔ وہ بھی جواباً مسکرادیئے اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئے غلزئی صاحب نے بکمال شفقت انہیں سمجھانا شروع کردیا کہ وہ آج اسمبلی میں ایسا ریزولیوشن پیش کریں گے کہ سرکاری بینچوں کے پاس جواب ہی نہیں ہوگا ۔ آفیسر صاحب نے سرگوشی میں مجھے کہا کہ میں انہیں ان کی آمد کے مقصد سے آگاہ کردوں ۔ میں نے عرض کیا' غلزئی صاحب آپ آج اپنا ریزولیشن پیش نہیں کرسکیں گے ۔ ہاں بھئی دیر ہورہی ہے اور مجھے ابھی نہانا بھی ہے' یہ کہہ کر وہ پلنگ سے اٹھنے لگے ۔ میں نے عرض کیا ۔ حضور آپ زیر حراست ہیں ۔ انہوں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسا کہ میں کوئی پولیس آفیسر ہوں اور آج تک ان سے اس بات کو چھپائے ہوئے ہوں ۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں اور سینیٹر سید حسین شاہ صاحب بھی زیر حراست ہیں اور یہ کہ میں کوئی سلطانی گواہ نہیں ہوں۔ پولیس آفیسر نے اٹھ کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے مشن سے آگاہ کیا ۔ دوسری صبح ہم جیٹ پر سوار کراچی کی طرف روانگی کے لئے تیار تھے کہ خان عبدالولی خان سالہ سے اپنی گارڈ سمیت آن پہنچے اور ہمراہ ہوگئے ۔ عین اس وقت جب ہمیں گرفتار کیا گیا ۔ حبیب جالب لاہور میں اپنے گھر میں صف ماتم بچھائے اپنے بچے کی رسم سوئم پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دھر لئے گئے اور کراچی ایئرپورٹ پر ہم سے پہلے حاجی غلام احمد بلور ؟ امیر زادہ خان سمیت موجود تھے ۔ جب سب حیدر آباد سنٹرل جیل کے گیٹ پر پہنچے تو دروازہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام قیدی بیک وقت پہنچے ہیں ۔ افراتفری کا عالم تھا ، بیشتر حضرات دیگر جیلوں سے لائے گئے تھے ۔ نوجوان قیدی انقلابی نعرے لگا رہے تھے ۔ زندانیوں کو سیل الاٹ کئے جارہے تھے' دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ادھر ادھر تقسیم کیا جارہا تھا ۔ ارشاد ہوا کہ جالب اور گردیزی صاحب کو پھانسی کی کوٹھڑیوں کی طرف لے جاؤ ۔ اپنا تو خیر اڑنے سے پیشتر ہی رنگ زرد تھا ۔ جالب صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ پھانسی کے معاملے میں آخر عجلت کیوں کی جارہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا ۔ ہم جب احاطے میں پہنچے تو کراچی کے نامور بیرسٹر عزیز اللہ شیخ پہلے ہی کھلے آسمان تلے بیٹھے انجم شماری میں مصروف تھے ۔ انہوں نے پرجوش استقبال کیا ۔ کچھ دیر بعد جناب شیر محمد مری بھی اپنے ساتھیوں سمیت آپہنچے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے احاطہ کھچا کھچ بھر گیا اور پھانسی

کی ان کوٹھڑیوں پر ایک ہوسٹل کا گمان ہونے لگا - حقیقت میں ان کوٹھڑیوں کا حلیہ بدل دیا گیا تھا اور وہاں عوام کی سہولت کا خاص خیال رکھا گیا تھا - روشنی اور ہوا کی حد تک تو ہم لوگ مطمئن تھے - البتہ دیواریں خاصی اونچی تھیں - قیدی تین احاطوں میں بند تھے مگر شام تک ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت تھی - قیدیوں میں سے میر غوث بخش بزنجو اور نواب خیر بخش مری پہلے ہی موجود تھے - سردار عطاء اللہ کراچی سے لائے گئے اور باقی ماندہ ملک کی مختلف جیلوں اور شہروں سے لائے گئے تھے - دوسری صبح جیل کے اندر ہی تمام ملزمان کو اسپیشل کورٹ کے سامنے پیش کردیا گیا جس کی سماعت تاحال جاری ہے جیل میں دو اڑھائی ماہ گزر چکے تھے - جب حبیب جالب نے مجھے پیش لفظ لکھنے کا حکم دیا - جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے میں کسی موزوں آدمی کی تلاش میں تھا - ارباب سکندر خان خلیل اور محمد افضل خان صاحب شاعری سے زیادہ بیڈ منٹن میں دلچسپی لیتے تھے - کرنل سلطان احمد صاحب کے سامنے اگر شعر پڑھا جائے تو وہ شیروں کے شکار کی داستان بیان فرما دیتے - میر گل خان نصیر کسی ترجمہ کے سلسلے میں موزوں الفاظ کی جستجو میں رہتے - جناب شیر محمد مری تو خیر خود ہی شیر تھے ان سے گوریلا جنگ پر تو بات کی جا سکتی تھی شاعری میں ان کی دلچسپی محدود تھی - ہمارے سیلوں کی قطار میں پنجاب کے بہادر سپوت کرنل لطیف افغانی تھے - جو سری نگر کے محاذ پر اپنا لوہا منوا چکے تھے مگر بدقسمتی سے اردو پر انہیں اتنا ہی عبور حاصل تھا جتنا مجھے اور قارئین کرام کو لاطینی زبان پر ہو سکتا ہے - بمبئی میں تعلیم پائی اور پنجابی زبان بھی بھول گئے - اگلے سیل میں جناب عزیز اللہ شیخ تھے - سندھی ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا ' باقی تمام زبانوں پر انہوں نے جیل کے تین ماہ ہی میں عبور حاصل کیا - قرآن کریم مع تفاسیر پڑھ لیا اور میں بھی ان سے مستفیض ہوتا رہا - اس کے علاوہ ڈیڑھ گھنٹہ فی کتاب کے حساب سے پڑھتے دیوان غالب اور کلام اقبال پر ایسا عبور حاصل کیا کہ جب غالب کے شعر پڑھتے تو دل دھل جاتا - کوئی شعر بھی ایسا نہیں تھا جس کی انہوں نے تصحیح نہ فرما دی ہو - غالب کو تو خیر چھوڑیئے مگر اقبال کا ایک تصحیح شدہ شعر آپ بھی سن لیجئے -

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا خود بندے سے آکر پوچھے کہ میاں اب تو بتا یہاں تیری رضا کیا ہے - میں تو خیر ان کا مداح تھا - انہیں داد دے ہی دیتا مگر جالب صاحب قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے - میں ایک میزبان اور قیدی ہونے کی حیثیت سے کہاں جاتا - ظاہر

سے سینے پر ہاتھ مار کر داد دیتا رہتا۔ ایک مرتبہ جالب صاحب میرے سیل میں بیٹھے ایک مصرع موزوں کررہے تھے۔ زمین کچھ اس قسم کی تھی۔ سردار آگئے' وغیرہ شامت اعمال کہ شیخ صاحب آگئے اور انہوں نے سن لیا۔ انکسار سے فرمایا۔ جالب صاحب اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں چند جملے تجویز کرتا ہوں اگر آپ ان میں سے کوئی موزوں کرلیں تو شعر حسین ہوجائے گا۔ دراصل آپ انقلابی شاعر ہیں۔ اور یوں بغیر کسی مزاحمت کے سردار آجانا اچھا نہیں لگتا اور پھر جالب صاحب سے جواب موصول ہوئے بغیر فرمایا۔ دار پر رسی پکڑ کر چڑھ گئے اور دوسری طرف سے کود گئے۔ "یا" دار پر سپاہی کو دھکا دے کر علاقہ مجسٹریٹ کو تھپڑ مار کر بھاگ گئے۔ اور کہنے ہی والے تھے۔ کہ جالب صاحب دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر دروازے سے باہر نکل گئے۔ میں بھی تو دل کا مریض تھا۔ میں نے ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھ کر رحم کی اپیل کی۔ شیخ صاحب نے ہنسنا شروع کردیا۔ بھئی ادب پر کسی کی اجارہ داری تو نہیں۔ یہ کہہ کر چلنے لگے اور اتنے ہنسے کہ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ مگر اس کے بعد ادب پر ان نئے تجربات کو انہوں نے اپنے سیل تک محدود رکھا۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ہی جالب صاحب کے حکم کی اپنی بساط کے مطابق تعمیل کروں گا۔ ہمارے گروہ میں اہل علم و دانش کی کمی نہ تھی۔ مگر زبان کا مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر کے ' حسیات کا دیباچہ لکھنا سعادت سے کم نہیں جو انسانی عظمت اور سربلندی کے لئے کوچہ یار کو خیرباد کہہ کر سوئے دار خوشی خوشی جائے اور اسے خون دل سے منور رکھے۔ جالب کی مجبوریاں ناتمامیاں اور اس پر یہ حوصلہ' اسے اپنے دور کے شعراء میں یقیناً ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ کوئی جالب کو معمولی آدمی سمجھے تو شوق سے مگر وہ انمول ہے۔ جالب کو دور جدید کی ڈپلومیسی سے چڑ ہے وہ جو کہتا ہے۔ برملا کہتا ہے۔ جالب کے کلام میں اشارہ یا کنایہ کم ہے۔ اگر کہیں اشارہ ~~ہے تو وہ~~ سنگ میل کی طرح واضح منزل کا پتہ دیتا ہے۔ جالب عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا طرز کلام اتنا سادہ اور آسان ہے کہ زبان زد خاص و عام ہے۔ جالب کے کلام کو خالصتاً ادبی معیار پر تو کوئی ادیب ہی پرکھ سکتا ہے مگر میں ایک ادنیٰ سیاسی کارکن ہونے کی حیثیت سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مستقبل کے مورخ کو وطن عزیز کی سیاسی تاریخ مرتب کرنے کے لئے جالب کے کلام سے جتنا مواد میسر آئے گا وہ شاید اس دور کے معدودے چند نامور دیبوں کے حصے میں آئے ۔ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا کہ سیاسی جلسوں میں جالب کو اسٹیج کے قریب پاکر لاکھوں عوام کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ کسی لیڈر کو دیکھ کر نصیب نہیں

ہوتی - شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے بتایا گیا کہ جب کسی صاحب نے فیض احمد فیض سے شکایت کی کہ جالب اپنے آپ کو بڑا عوامی شاعر کہتا ہے اور آپ پر بھی فقرے کسنے سے باز نہیں آتا تو وہ مسکرا دیئے اور کہا کہ "بھئی کیا حرج ہے اسے بات کرنے کا حق تو دینا چاہئے - ولی دکنی سے لے کر مجھ تک کسی بھی شاعر کو سامعین کا اتنا مجمع میسر نہیں آیا جتنا جالب کو میسر آیا ہے - فراق گورکھپوری نے ایک عرصہ ہوا کلکتہ کے مشاعرے میں جالب کی ایک غزل سے متاثر ہوکر سامعین کے سامنے داد دیتے ہوئے فرمایا - میرا بائی کا سوز اور سورداس کا نغمہ جب یکجا ہوجائے تو اسے جالب کہتے ہیں -

جالب کی ابتدائی زندگی کے متعلق بہت کم مواد ریکارڈ پر ہے - مناسب ہوگا کہ ذرا اس دور کی بات کریں جب جالب ایک غیر اہم بچہ تھا - جالب کا خاندان غزنوی دور میں ہندوستان میں وارد ہوا - سلاطین غزنی آتے جاتے رہے - مگر پٹھانوں کا یہ قبیلہ ہندوستان کی وسیع اور عریض وسعتوں میں کھو گیا اور بے شمار دیگر فوجی قبائل کی طرح یہیں کا ہوگیا - فروری ۱۹۲۸ء میں جالب ضلع ہوشیار پور کی تحصیل دسوہہ میں میانی افغان میں پیدا ہوئے اور وہیں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی - ان کے بڑے بھائی جو شاعر بھی تھے - دہلی جاکر ملازم ہوگئے اور اس دوران جالب کا تمام خاندان دہلی منتقل ہوگیا - جالب صاحب میٹرک تک اینگلو عربیک اسکول اجمیری گیٹ میں تعلیم حاصل کرتے رہے - دہلی میں لڑکپن ہی میں اپنے بھائی کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور داد سخن دیتے اور دہلی کے شعراء کے کلام سے متاثر ہوتے رہے - پندرہ برس کی عمر میں کلاس روم میں استاد نے طالب علموں سے جب وقتِ سحر کو محاورہ میں استعمال کرنے کے لئے کہا تو جالب نے فی البدیہہ ایک شعر کہہ دیا - -

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور ہم
وعدہ شکن کو دیکھتے وقتِ سحر ہوا

استاد چونک پڑے اور جالب کو دل کھول کر داد دی -

مدتیں ہوگئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے

یہ شعر بھی اس ابتدائی دور کی پیداوار ہے - جالب جگر مراد آبادی سے بے حد متاثر ہوئے - جگر مراد آبادی کی شاعری اور ان کی درویشانہ ہیئت کذائی میں جالب کے لئے اتنی جاذبیت تھی کہ ایک طویل مدت تک وہ ان سے مسحور رہے - تقسیم ہند کے بعد جالب

خاندان سمیت کراچی میں آباد ہوئے ۔ اگرچہ کراچی ایک عرصہ تک اردو شعرا کا مرکز رہا ۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کی فضا ان کو راس نہ آئی اور وہ اکیلے لاہور کی جانب روانہ ہوئے لاہور میں زلف آوارہ بے آسرا بے یار و مددگار جالب کو ہر شب نیا میزبان میسر آتا مگر بعض اوقات کوئی بھی اس کی پذیرائی نہ کرتا اور غالباً اس دور نے ان کے ذہن پر احساس محرومی کا ایک مستقل نقش چھوڑا اور طبیعت معاشرے سے بغاوت پر مائل ہوئی۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہے ۔ ان دنوں ایک مشاعرے کا اہتمام ہوا ۔ جگر مراد آبادی بھی تشریف لائے ہوئے تھے ۔ مشاعرہ عروج پر تھا ۔ جالب کو اسٹیج پر بلایا گیا ۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل پڑھی ۔

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

سامعین نے کھڑے ہوکر داد دی ۔ اس مشاعرے میں جگر مراد آبادی صاحب سے تعارف ہوا اور انہوں نے جالب کو گلے لگالیا ۔ لائل پور کے ایک مشاعرے میں جگر صاحب نے جالب کی ایک غزل سن کر جالب سے مخاطب ہوکر کہا کہ اگر میرا شراب خوری والا دور ہوتا تو میں مشاعرے میں رقص کرنا شروع کردیتا ۔ کراچی میں قیام کے دوران جالب متعدد شعراء سے متعارف ہوئے جن کی صحبت میں وہ نکھرے مگر پاکستان میں جالب آزادی ' خوشحالی کے متلاشی تھے جو انہیں کہیں نظر نہ آئی اور آہستہ آہستہ ان کے سب سہانے خواب بکھر گئے اور وہ بکھر گئے اور وہ سب کچھ تیاگ کر باغی ہوگئے ۔ انہیں کہیں سکون میسر نہیں آیا ۔ اس دوران ان کی سندھ کے مشہور کسان رہنما حیدر بخش جتوئی مرحوم سے ملاقات ہوئی ۔ وہ کچھ عرصہ ان کی رہنمائی میں سندھ ہاری تحریک میں کام کرتے رہے ۔ مگر یہاں بھی انہیں کسانوں میں غربت افلاس اور مجبوریوں نے جھنجھوڑا اور وہ پھر لاہور آگئے ۔ چند روز کی بے سرو سامانی کے بعد انہیں روزنامہ آفاق میں جناب سید نور احمد صاحب نے پچھتر روپے ماہوار پر پروف ریڈر کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا ۔ جالب کو اس حقیر معاوضے کے لئے تقریباً بارہ گھنٹے روزانہ دفتر میں کام کرنا پڑتا تھا ۔ لاہور کے معزز بزرگ سید اولاد علی شاہ صاحب گیلانی مرحوم نے جالب کو ایک مستقل مہمان کی حیثیت سے گھر میں رکھ لیا اور کمال شفقت سے اپنے صاحبزادے سید کاظم شاہ صاحب کی طرح دیکھ بھال کرتے رہے ۔ جالب اس خاندان کا جس عقیدت سے ذکر کرتے ہیں ۔ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا ۔ اتفاق کی بات ہے کہ شاہ صاحب کا قیام اپنے مورث اعلیٰ کے مزار کے قریب تھا ۔

جہاں وہ اکیلے قیام پذیر تھے یا کاظم شاہ صاحب آکر رہتے تھے ۔ اس مکان کا راستہ شاہی محلے سے گزر کر جاتا تھا ۔ جالب ہر شب اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو بجے مکان پر جاتے اور عام طور پر پولیس کا کوئی مستعد اہل کار انہیں دھر لیتا اور شاہ صاحب ان کی صفائی پیش کرتے رہتے ۔ ۵۰ ' ۵۲ کا زمانہ تھا ۔ ملازمت کے بعد آپ نے سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ بھی لے لیا ہے ۔ کم تنخواہ تعلیم اور ملازمت کے بوجھ نے جالب کو ہرادیا ۔ ایک روز شاہ صاحب نے جالب سے دریافت کیا کہ بیٹا کوئی ایسی ملازمت نہیں مل سکتی جو دن ہی کو ختم ہو جائے اور ہر رات کی اس پریشانی سے نجات مل سکے ۔ حساس جالب دل برداشتہ ہو گیا اور چند دن بعد تعلیم اور ملازمت کو چھوڑ کر رخت سفر باندھ کر لاہور کو خیرباد کہہ کر پھر کراچی پہنچ گیا ۔

اتنی تو خبر ہے کہ پریشان تھا جالب
کس شہر گیا چھوڑ کے لاہور کہیں کیا

خدا جانے شہر لاہور کی شاہراہوں ' گلیوں اور کوچوں میں کیا کشش ہے کہ جالب صاحب کراچی میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور ۱۹۵۶ء میں کراچی سے لاہور آکر مستقلاً آباد ہو گئے ۔ اگرچہ ملتان کی ایک کشادہ سڑک اور صاف آبادی میں ان کے خاندان کا ایک مکان ہے مگر ملتان کے احباب کے تقاضوں کے باوجود جالب لاہور کی ایک گلی میں کرایہ کے ایک مکان میں قیام پذیر رہے ۔ ایک رات نصف شب کے بعد میں نے حیدر آباد سنٹرل جیل میں ان کے سیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ جالب جاگ رہے ہیں ۔ میں نے یونہی ان کے اندھیرے سیل میں جھانکا ۔ انہوں نے مجھے آواز دی ۔ معذرت کر کے آگے بڑھ گیا ۔ دوسری صبح جالب ناشتے پر مجھے اپنی غزل سنا رہے تھے ۔ ۔

کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں
بیتے ہوئے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں
محسوس یہ ہوتا ہے ابھی جاگ رہے ہیں
لاہور کے سب یار بھی سوجائیں تو سوئیں

جالب صاحب نے لاہور پہنچتے ہی سیاست کی وادی خار زار میں قدم رکھا ۔ ان کی شاعری کا انداز بدلتا گیا ۔ فلموں کے لئے گیت لکھنے اور سرکاری کنٹرول کے اخبارات کا ایک ایک دروازہ ان پر بند ہوتا گیا ۔ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن کے موقع پر جب ان

کی فاقہ مستی عروج پر تھی اور گھپ اندھیری رات میں جب آمریت کے تند و تیز بگولے طوفان کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ جالب جمہوریت کا چراغ لئے عوام کو گلی گلی پہنچ کر طلوع سحر کی نوید سنا رہے تھے۔ ایسے دور میں ان کو جو مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ایوبی آمریت دور اپنی تمام تر وحشت اور بربریت کے ساتھ پاکستان کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ مری کا ایک مشاعرہ تھا۔ صوبائی اسمبلی کے اسپیکر صدارت فرما رہے تھے۔ بیشتر وزراء حضرات کی وجہ سے مشاعرہ درباری رنگ پیش کررہا تھا۔ جسٹس محمد منیر صاحب کے علاوہ پاکستان کے بیشتر ارباب بست و کشاد موجود تھے۔ مشاعرے کا آغاز ہوا۔ مشاعرے کے منتظمین حضرات جالب کی موجودگی سے خوش نظر نہیں آتے تھے۔ سید محمد جعفری صاحب ظریف جبل پوری اور جناب شوکت تھانوی بھی تشریف فرما تھے۔ منتظمین نے ان حضرات کو یکے بعد دیگرے مائیکرو فون پر بلا کر مشاعرے کو کشت زعفران بنا دیا۔ شوکت تھانوی صاحب کے فوراً بعد منتظمین نے جالب صاحب کو اسٹیج پر بلایا۔ صاف عیاں تھا کہ جناب شوکت تھانوی کے فوراً بعد کسی سنجیدہ نظم یا غزل کا رنگ نہیں جمے گا۔ جالب نے اعلان کیا حضرات میں پہلی بار اپنی نظم دستور پیش کروں گا۔ منتظمین کو کچھ بھائی نہ دیا۔ جب جالب نے نظم شروع کی تو منتظمین میں سے ایک صاحب نے اٹھ کر کہا کہ یہ موقع نہیں جالب چلائے۔ بیٹھ جائیں میں موقع پرست نہیں ہوں۔ دوسرے لمحے جالب کہہ رہے تھے۔

ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں جانتا

بس پھر کیا تھا مجمع بے قابو ہوگیا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آمر اور اس کے ہم نوا عوام کی عدالت میں پیش ہیں۔ نظم ختم ہوئی تو جالب مشاعرے سے باہر آئے اور مجمع ایک جلوس کی صورت میں ان کے ہمراہ ہولیا۔ ارباب بست و کشاد کے رنگ فق اور چہرے زرد پڑگئے۔ دوسری مرتبہ جالب صاحب نے یہی نظم ملتان میرے گھر میں محترمہ فاطمہ جناح کی موجودگی میں پڑھی اس نظم کی وجہ سے جالب صاحب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے وہ مزید نکھر گئے۔ ملک بھر میں ایک باغی شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور یہیں سے سلسلہ دار و رسن شروع ہوا۔ بارہا در زنداں ان کے لئے کھلتا رہا۔ جالب ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ دور ایوبی کے آخری سالوں سے آج تک جالب مسلسل مصائب وحشت اور بربریت کا شکار ہیں مگر اب انھیں فاقوں او رمحرومیوں سے خوف انھیں

محسوس ہوتا ۔ جالب اب اپنے معاشرے کے ناسور ختم کرنے کا عہد کئے ہوئے ہیں ۔ دور جدید کے فرعون اور قارون نہ تو اسے خوف زدہ کرسکتے ہیں اور نہ خرید سکتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عوام کی امنگوں کی تکمیل کے لئے جو مشکل کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے شاید اس منزل پر پہنچنے تک ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئے ۔ جالب کا پہلا مجموعہ کلام " برگ آوارہ " چوہدری عبدالحمید صاحب مالک مکتبہ کارواں لاہور نے شائع کیا ۔ چوہدری صاحب ایک شریف النفس انسان ہیں جن کا خاندان اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے مشہور ہے ۔ آپ خود بھی شاعر ہیں ۔ ان کا مجموعہ کلام " شام صحرا " چھپ کر مقبول ہوا ۔ آپ نے کسی محفل میں جالب صاحب کو سنا اور " برگ آوارہ " کی اشاعت کا ذمہ لے لیا ۔ چوہدری صاحب نے " سر مقتل " بھی شائع کی اور اس کی وجہ سے جالب کی معیت میں تھانے کا منہ دیکھ آئے ۔ " عہد ستم " پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے رؤف ملک صاحب نے شائع کی اور اب چوہدری صاحب ان کے مجموعہ کلام "گوشے میں قفس کے " کی اشاعت کا اہتمام فرما رہے ہیں ۔

زیر نظر مجموعے کی ہر نظم اور ہر غزل یا قطعہ حیدر آباد سنٹرل جیل میں لکھا گیا ۔ جالب جب بھی کوئی نظم یا غزل لکھتے ۔ عام طور پر مجھے اس روز سرگوشی میں سنا دیتے تھے ۔ اس لئے میں ان کا ہم قفس ہونے کی حیثیت سے اس ماحول اور فضا سے آشنا ہوں اور ہر شعر کے محرکات کا مکمل احساس رکھتا ہوں ۔ ذرا آپ بھی دیکھئے کہ مسعود سعد سلمان کا یہ جانشین ہم شب کی تاریکی میں کس طرح نغمہ سرا ہے اور روزن زندان سے طلوع صبح فردا کا منظر دیکھ رہا ہے جالب نے آنے والے دور کی تصویر کشی اس طرح کی ہے ۔

کسی لہجے سے نہ مجروح سماعت ہوگی
جہل کے ناز اٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو
یاس انگیز اندھیرا نہ کبھی چھائے گا
آس کے دیپ بجھانے نہ پڑیں گے ہم کو
غم کے ماروں کی ہر اک شام چمک اٹھے گی
صبح فرخندہ جبیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہد حسیں کی صورت

جالب کی ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ فرمایئے اور جس ماحول میں یہ غزل لکھی گئی اس کے تناؤ کا تصور کیجئے تو یقیناً آپ بھی میری طرح اس سے لطف اندوز ہوسکیں گے کہ

حقیقت تو یہ ہے کہ جالب کے اس مجموعہ کلام کا کوئی بھی شعر لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں ۔ یہ ہمارے زخم خوردہ معاشرے کے خلاف ایک زہر آلود طنز ہے مگر یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ شاعر کے ہاتھ قلم ہوں گے یا وہ اپنی روش بدلے گا ۔

یہ منصف بھی تو قیدی ہیں ہمیں انصاف کیا دیں گے
لکھا ہے ان کے چہروں پر جو ہم کو فیصلہ دیں گے
ہمارے قتل پر جو آج ہیں خاموش کل جالب
بہت آنسو بہائیں گے بہت داد وفا دیں گے

مگر جالب اپنا لہجہ بدلنے کو تیار نہیں کیونکہ انہیں اصرار ہے کہ

بہت مشکل مری پہچان ہوگی
بدل ڈالوں اگر میں اپنا لہجہ

اس ضمن میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں

دنیا ہے کتنی ظالم جنتی ہے دل دکھا کے
پھر بھی نہیں بجھائے ہم نے دیئے وفا کے
تاعمر اس ہنر سے اپنی نہ جان چھوٹی
کھاتے رہے ہیں پتھر ہم آئینہ دکھا کے
خامشی پر ہیں لوگ زیرِ عتاب
اور ہم نے تو بات بھی کی ہے
کہتے تھے کہ اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

آئیے ذرا ایک بار آپ کو پھر سنٹرل جیل حیدر آباد کے اندر کی سیر کرائیں ۔ اس میں خوف کی کوئی بات نہیں ۔ گو باہر بہت اونچی دیواریں ہیں جن پر برقی رو کی تاریں نصب ہیں اور ان دیواروں کے اندر اور باہر شب و روز مستعد چاق و چوبند حفاظتی دستے متعین ہیں ۔ لوہے کے بلند و بالا آہنی دروازے کے اندر اور باہر باوردی چہرے نظر آئیں گے ۔ ایسے چہرے آپ کو کسی مغربی فلم کے جنگی مناظر میں نظر آئیں گے ۔ آپ ایسا محسوس کریں گے کہ شاید یہ چہرے ہماری تہذیب اور کلچر سے بھی آشنا نہیں مگر ایسی بات نہیں یہ اپنے ہی بھائی ہیں اگر یہ بولیں تو ہماری ہی زبان بول سکتے ہیں ۔ کچھ چہرے آپ کو اس طرح

گھوریں گے گویا آنکھوں سے ایکسرے مشین کا کام لے رہے ہیں مگر اندر ان تین بیرکوں میں جن کا میں اوپر ذکر کرچکا ہوں۔ آپ کو قہقہے سنائی دیں گے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں کی زبانوں میں گیت گائے جارہے ہیں۔ ادب پر مباحثے ہورہے ہیں۔ سیاست پر سیمینار ہورہے ہیں۔ کسی شہید کا دن منایا جارہا ہے یا پھر کسی بناوٹی خوشی پر دعوت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ مہینے میں ایک مرتبہ مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ہر تیسرا آدمی شاعری فرماتا ہے بلوچی زبان کے معروف شاعر گل خان نصیر اور حبیب جالب کے علاوہ باقی تمام حضرات ادب پر کراٹے یا فری اسٹائل کے داؤ مارتے ہیں مگر خاطر احباب کے لئے کم از کم سبحان اللہ کہنا پڑتا ہے اور عام طور پر زیادہ داد اسی کو دی جاتی ہے جس کا کوئی شعر سمجھ میں نہ آئے سوائے اردو شعراء کے باقی ہر ہر شاعر کا اردو میں ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اردو ہی رابطہ کی زبان ہے۔ ہر شام خان عبدالولی خان کے احاطے میں والی بال کھیلا جاتا ہے۔ کچھ بیمار لوگ سردار عطاء اللہ مینگل کی قیادت میں ایک طرف کرسیاں بچھا کر محظوظ ہورہے ہیں۔ کبھی کبھی بال کسی بیمار کے سر لگتی ہے تو کسی کی عینک کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ اس احاطے میں ایک گروہ میر غوث بخش بزنجو کے جلو میں شطرنج کھیل رہا ہے اور ان حضرات کے انہماک کا یہ عالم ہے کہ جب تک گھپ اندھیرا نہ ہوجائے۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ دوسرے احاطے میں شیر محمد صاحب مری برآمدے کے سامنے اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کے قریب میز لگائے اپنی محفل سجائے بیٹھے ہیں۔ قہوے کا دور چل رہا ہے معراج محمد خان سے مباحثہ ہورہا ہے۔ سردار خیر بخش مری جج کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ محمد عزیز میمن صاحب کا قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ کچھ حضرات چڑیا گھر کے شیر کی طرح دیوار کے ساتھ تیزی سے آجا رہے ہیں۔ ان کے ورزش کے انداز کو دیکھ کر ذرا سی بے بسی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس احاطے کے دوسرے برآمدے کے سامنے کوئٹہ کے ڈاکٹر عنایت اللہ خان صاحب اپنی محفل جمائے بیٹھے ہیں اور کچھ نوجوان بیٹھے ان کی باتوں سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کونے سے پشتو یا بلوچی کا نغمہ بلند ہوتا ہے کچھ دیر بعد کچھ اور ساتھی مل جاتے ہیں اور یہ کورس تالیوں کی تھاپ میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ برآمدے کے آخری کونے میں باورچی خانے کے سامنے والے چبوترے پر ریٹائرڈ کرنل سلطان محمد، جناب پرویز سلیم، عبدالمجید صاحب اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ چارپائیوں پر بیٹھے چائے کی پیالی پر سٹاریات اور فوجی ملازمت کے زمانے کے دلچسپ قصے سنا رہے ہیں اور ہر گزرنے والے کو چائے کی دعوت دیتے ہیں۔ انکی شربتی رنگ کی چائے

جسے سبز چائے کہتے ہیں کی پیالی چھوٹی سے چھوٹی اور اس میں شکر زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے چائے اتنی ٹھنڈی ہوتی ہے کہ کمزور آدمی کے جسم میں کپکپی پیدا ہوجانا لازمی ہے۔ معاش کا یہ عالم کہ رات گئے تک کام و دھن اس کے ذریعے سے لذت یاب رہتے ہیں۔ وہ چائے اس شفقت سے پیش کرتے ہیں کہ شوگر کا مریض نہیں، نہیں کرسکتا اور ہوالشافی کہہ کر چڑھا جاتا ہے۔ شیر محمد مری صاحب کی میز سے چند گز آگے برآمدے کے سامنے جالب صاحب اکیلے بیٹھے ایک درخت کو دیکھ رہے ہیں۔ جہاں ایک کوئل کا بسیرا ہے۔ وہ کو کو کرتی رہتی ہے۔ جالب صاحب کے خیال میں "پیا پیا" پکار رہی ہے اور وہ شاید ان کے گیتوں کا مواد مہیا کررہی ہے مگر میں اس سے بیزار ہوں۔ میرا بس چلے تو پتھر پھینک کر اسے اڑا دوں مگر جیل کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں اور پھر جالب صاحب کا مصرع مجھے بار بار یاد آتا ہے۔

دنیا ہے کتنی ظالم ہنستی ہے دل دکھا کے

کوئل جتنا چاہے تنگ کرلے مگر شعراء کو تو ضرور انسپائر کرتی ہے اور پھر ایک معصوم پرندے کو روڑا مارتے ہوئے سلطان باہو کا یہ مصرع بھی یاد آجاتا ہے۔

تاڑی مار اڑا نہ باہو اسیں آپے اڈن ہارے ہو

جالب صاحب جیل کے ابتدائی چند ماہ اداس رہے کیونکہ ان کے جواں سال بچے کی موت ان کے لئے ایک سانحہ تھی۔ اس مجموعہ کلام میں کئی جگہ انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کبھی کبھی محفل کو اپنے لطائف سے کشت زعفران بناتے مگر پھر بجھ جاتے اور یہی وجہ تھی کہ بعض احباب کے لئے معمہ بنے رہے ہیں۔ اپنے بچوں سے والہانہ محبت میں بھی وہ زمانے کو بدلنے کی سعی پیہم سے روگرداں نہیں ہوئے۔ نظم میری بچی میں لکھتے ہیں

تیری آشا کی بگیا کھلے گی
چاند کی تجھ کو گڑیا ملے گی
تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہوگا ستم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

جیل کے تمام عرصہ میں اپنے جواں مرگ بچے کے غم اور چھوٹی بچی کی جدائی کے

احساس نے انہیں اپنی گرفت میں رکھا ۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات کئی کئی دنوں تک وہ خاموش رہتے بالخصوص عید کے دن انہوں نے اپنے سیل کے اندر کی کنڈی لگا رکھی اور شام سے پہلے باہر نہ آئے کبھی کبھی ان کی طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ۔ جس کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی ۔ جالب بظاہر بھولے بھولے اور سیدھے سادھے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت وہ آہوئے زخم خوردہ کی طرح اپنے گرد و پیش پر گہری نظر رکھتے ہیں اور بات بات پر چونک اٹھتے ہیں ۔ ان کا اعتماد حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں جس پر اعتماد کرتے ہیں اس سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسی مجموعے میں لکھتے ہیں ۔

ہم نے سلوک یاراں دیکھا جو دشمنوں سا
بھر آیا دل ہمارا روئے ہیں منہ چھپا کے
دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

اوپر میں نے جیل کے جس ماحول کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے پیچھے ہر قیدی کی ایک قدر مشترک ہے ۔ ہر دل دکھا ہوا، ہر ایک کا گھر اجڑا ہوا، جس پر وحشت و بربریت اور موت کے گہرے سائے ہیں ۔ یاد رفتگان و گم شدگان سے دل بوجھل پسماندگان کی بے چارگی و درماندگی کا تفکر ہر در و دیوار پر مقدس مگر ارزاں خون کے چھینٹے اور پھر سامنے تختہ دار کوئی بھی انسان دوست یہ تمغے نے تو محسوس کرے گا کہ یہ قیدی منہ چڑا رہے ہیں ۔ استبدادی قوتوں کا، یہ اور بات ہے کہ یہاں کا شیوہ مردانگی ہی یہ ہے کہ کوئی اپنے مصائب اور تکالیف کا ذکر نہ کرے ۔ میں نے جیل کے آٹھ ماہ میں کسی قیدی سے اس کی زبان سے اس کی خانہ ویرانی کی داستان نہیں سنی کوئی اس کی غیر موجودگی میں ذکر کرے تو اور بات ہے ۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے جگر صاحب نے لکھا تھا کہ

زخم پہ زخم کھا کر بھی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں

میں تو پہلے ہی بیمار تھا صحت بحال کیسے ہوتی آہستہ آہستہ
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

طبیعت بے حد بگڑی تو لیاقت میڈیکل کالج میں داخل کرادیا گیا ۔ وہاں پندرہ روز ایڑیاں

رگڑتے رہے اور بالآخر ڈاکٹروں کی رپورٹ پر ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ چند دن بعد جالب صاحب بھی ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔ پانچ ماہ کی شدید علالت کے بعد ذرا طبیعت سنبھلی تو بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ جالب صاحب پھر کسی جیل میں ہیں اور ان پر کیا بیت رہی ہے۔ لیجئے میرے دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ پولیس مجھے بغیر وارنٹ گرفتار کرنے آئی ہے۔ اجازت دیجئے۔ خدا حافظ

ہاں مگر چلتے چلتے قرۃ العین طاہرہ کا ایک شعر سنتے جایئے

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

مخدوم علی خان

روشن مستقبل شاعر

جب میں نے اسکول جانا شروع کیا تو ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوچکا تھا اور ہم روز سویرے اخبار میں جنرل ایوب خان کی تصویر دیکھا کرتے تھے ۔ ایوب خان کے علاوہ معاشرے میں جن افراد کا وجود پایا جاتا تھا ان میں کچھ تو وہ لوگ تھے جو بہت بولتے تھے اور کچھ وہ جو بولتے ہی نہ تھے ۔ بولنے والے ابلاغ عامہ کے سرکاری ذرائع کا سہارا لئے حاکم وقت کی خدمات پر رطب اللسان تھے ۔ نہ بولنے والوں میں ہمارے دانشور تھے جنھوں نے بامعنی خاموشی سادھ رکھی تھی ۔ رہے سیاستدان تو وہ بھی مندرجہ بالا دو طریقوں میں سے کوئی سا ایک اختیار کئے اپنی ذات اور مفاد کے تحفظ میں مصروف تھے آج عمر کی تین دہائیاں گذر چکی ہیں اور میرے بچے اسکول جانا شروع کررہے ہیں لیکن جب اپنے اطراف پر نگاہ ڈالتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ کچھ نہیں بدلا کچھ بھی تو نہیں بدلا ۔ وہی قینچی کی طرح چلتی زبانوں کا شور اور وہی روح کو نگل جانے والا سناٹا ۔ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے ۔ ایسی صورتحال ایک تواتر کے ساتھ پیش آتی رہے ' کل کے باغی آج کے مصاحب بن بیٹھیں ' وفاداریوں کا رخ ہوا کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہے اور اس نظام کے خلاف کسی بھی سمت سے صدائے احتجاج بلند نہ ہو یا بلند ہوتو اس میں پائیداری نہ ہو ' تو یقین سا آنے لگتا ہے کہ جس عہد میں ہم جیتے چلے آئے ہیں بس یہی صداقتوں کا دور ہے اور ہماری آنکھوں نے جو دیکھا ہے اور کانوں نے جو کچھ سنا ہے یہی سچ ہے یہ حرف حق ہے ۔ لیکن ہر دور میں جبرو استبداد کے خلاف اپنے گریباں کا پرچم بلند کرکے اگر کسی شخص نے ہمیں اس فریب کا شکار ہونے سے بچایا ہے تو وہ حبیب جالب ہے ۔ اس نے یہ شعور پیدا کیا ہے کہ محض کامیابی کبھی بھی کسی فرد کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہوا کرتی ۔ اس نے نہ صرف ہمیں گنبد بے در کی گھٹن کا احساس دلائے رکھا بلکہ ہاتھ میں علم لے کر خود بھی کھلی فضاؤں کی سمت نکل کھڑا ہوا اور ہمیں بھی اس کی ترغیب دیتا رہا ۔

آج حرف آخر ہے بات چند لوگوں کی
دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
اٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی
جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی

جالب کا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ اصولوں سے اس کی محبت ابدی ہے۔ وہ کسی قیمت پر بھی ان کو قربان کرکے کسی سے مصالحت نہیں کرسکتا۔ انہی اصولوں کی وجہ سے نہ وہ چین سے کبھی بیٹھ پاتا ہے اور نہ دل کی بات زبان پر لائے بنا رہ سکتا ہے خواہ اسے اس صاف گوئی کی پاداش میں کتنے ہی دکھ اٹھانے پڑیں۔ وہ زخم کھا کر مسکرا تو سکتا ہے، قاتل کو معصوم ادا لکھ نہیں سکتا۔

دینا پڑے کچھ ہی ہرجانہ، سچ ہی لکھتے جانا
مت گھبرانا مت ڈر جانا، سچ ہی لکھتے جانا
باطل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی بجھ پائیں
وہ شمعیں روشن کرجانا، سچ ہی لکھتے جانا
پل دو پل کے عیش کی خاطر کیا دینا کیا جھکنا
آخر سب کو ہے مرجانا، سچ ہی لکھتے جانا

سچ کی اس لڑائی میں کتنے ہی ساتھی ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ کون سی صعوبت تھی جو اسے اٹھانی نہ پڑی لیکن وہ آج اس شہر میں کل نئے شہر میں لوگوں کی کم نظری اور فتنہ گری کی پرواہ کئے بغیر اپنا پیغام لئے سرگرداں رہا۔ اس طویل مسافت میں نہ تو اس کے پائے ثبات میں کبھی لغزش آئی نہ اس کی ہمت نے اس کا ساتھ چھوڑا، اور نہ ہی اسکی خود اعتمادی کبھی متزلزل ہوئی۔

ہم اہل محبت پالیں گے اپنے ہی سارے منزل کو!
یاران سیاست نے ہر سو پھیلائے ہیں رنگین جال تو کیا

لکھنے بیٹھا تو ارادہ کیا تھا کہ مضمون، حبیب جالب کی شاعری پر تحریر کروں گا شخصیت پر نہیں ذکر اس کے فن کا کروں گا سیاست کا نہیں، لیکن جب اوپر کی سطور پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ جالب کا فن اور اس کی سیاست، اسکی شاعری اور اس کی شخصیت ایک دوسرے میں یوں سمو گئے ہیں کہ انہیں جدا کرنا اور علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ کر بیان کرنا ناممکن ہے یا کم از کم میری استطاعت سے باہر ہے۔ یہاں پروفیسر کرار حسین کا قول یاد آتا ہے

ہے کہ "کسی شخص کی شاعرانہ عظمت کا ذکر کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کتنا عظیم انسان ہے" ۔ انہوں نے یہ اس لئے کہا کہ شاعری زندگی کا حصہ ہے ' یہ رگ و پے میں دوڑنے والے خون کی حرارت سے جنم لیتی ہے ۔ اس کا شاعر کی ذات سے رشتہ جسم و جاں کا رشتہ ہے ۔

ایک لگن کی بات ہے جیون ' ایک لگن ہی جیون ہے

ہماری سیاسی تاریخ کا سفر ملاحظہ کرنا ہو تو جالب کی شاعری میں سفر کیجئے ہر موڑ ' ہر دوراہا آنکھوں کے سامنے عیاں ہوجاتا ہے ۔ جب دور ایوبی میں ۱۹۶۲ء کا دستور عوام پر مسلط کیا گیا اور ہر جانب سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہونے لگیں تو یہ جالب ہی تھا جس نے بے باکی سے آگے بڑھ کر کہا تھا ۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو ' صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا ' میں نہیں جانتا

پھر ۱۹۶۴ء کے انتخابات میں جب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح ' ایوب خان کے مقابلے میں حزب اختلاف کی صدارتی امیدوار نامزد ہوئیں تو جالب بحالی جمہوریت کی اس وسیع تر لڑائی میں شامل ہوگیا ۔ وہ نہ رتبے کا طالب تھا نہ عہدے کا خواہشمند ۔ آمد صبح بہاراں کی امید لئے وہ جمہوریت کی اس جنگ میں ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے شامل ہوا تھا ۔ اور اسی پر اس کو فخر تھا ۔ عوام کے سامنے اس نے اپنی بات ہمیشہ کی طرح واضح اور دو ٹوک انداز میں کہی ۔

اُس طرف ظلم ہے بیداد ہے حق تلفی ہے
اِس طرف پیار ہے الفت ہے ادھر آجاؤ

انتخابات ہوئے اور اسی طرح ہوئے جیسے ہوا کرتے ہیں یعنی اس منفرد انداز سے جو تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کا خاصہ ہے ۔ مگر اس کا ایک بالواسطہ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام میں

بیداری کی لہر دوڑ گئی اور ایک ایسی تحریک منظم ہوئی جس نے ان ایوانوں میں دراڑیں ڈال دیں جن کی بنیاد ظلم ' بیدادا اور حق تلفی پر تھی تب وہ جو تاحیات حکومت کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور تخت پر یوں متمکن تھے جیسے اترنا ہی نہیں ' عوامی قوت کے ایک ہی ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ۔

کوئی ٹھیرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ !
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

تاریخ کے اس موڑ پر ہمارے سیاستداں سجدہ شکر بجالائے ۔ ایوانِ اقتدار میں محض ناموں کی تبدیلی ان کی خوشیوں کے لئے کافی تھی ۔ نظام کی تبدیلی کے تصور سے تو وہ خود بھی ہراساں تھے ۔ مگر جالب دور بہت دور دیکھ رہا تھا ۔ اس کی نگاہوں نے یحیٰی خان کے عزائم کو بھانپ لیا تھا ۔ لہٰذا اس نے بروقت صدا دی ۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

باول ناخواستہ منعقد کئے جانے والے انتخابات کے ذریعہ جمہوریت کی راہ ہموار ضرور ہوئی اور عوام کے نمائندے منتخب بھی ہوئے مگر جالب کی سوچ کس قدر صحیح تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اربابِ اقتدار کی تنگ نظری اور ہر مسئلے کو طاقت کی بنیاد پر حل کرنے کی عادت نے ملک کو ایک پر خطر اور خونیں مقام پر لاکھڑا کیا ۔ مشرقی پاکستان پر جب فوج کشی کا اعلان ہوا تو کتنے لوگ تھے جنہوں نے اس کی مخالفت کی ؟ لیکن جالب بخوبی جانتا تھا کہ مسائل محض ٹالنے سے نہیں ٹلتے ' عوامی امنگیں سنگینوں سے کچلی نہیں جاسکتیں تشدد کا جن ایک بار بوتل سے باہر نکل آئے تو پھر باآسانی بند نہیں ہوتا اور جب باہمی گفت و شنید کی جگہ مشین گن کا استعمال شروع ہوجائے تو اتحاد کی بنیادیں کھوکھلی ہوجاتی ہیں

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

جالب کو جو اندیشہ تھا وہی ہوا ۔ ہم نے منزل کھودی ۔ محبت کا زمزمہ آگ و خون کا دریا بن گیا ۔ ملک دو نیم ہوگیا ۔ ایک دور اپنے اختتام کو پہنچا ۔ دوسرے دور کا آغاز ہوا ۔ اس دور میں برسرِاقتدار آنے والوں میں جالب کے دوست اور اس کے سیاسی سفر کے ساتھی بھی

تھے لیکن اس اقتدار سے ' اس حکومت سے اس نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا - نہ وہ کسی نوکری کا طلب گار ہوا نہ کسی اعزاز کا - اس کی دوستی بے غرض تھی اس کی سیاست ذاتی اغراض سے بالاتر - اس کی جدوجہد کا مقصد بحالی جمہوریت تھا خوشحالی خاندان نہیں - اس دور میں بھی وہ غزل سرا رہا -

ایسی غزل کہی نہ کہیں گے تمام عمر
انعام و داد جس پہ ملے شہریار سے
کچھ اور ہوگیا ہے وہ شاعر نہیں رہا
وابستہ ہوگیا جو کسی تاجدار سے

ایک دور پھر ایسا آیا کہ دوست زیر عتاب آئے - ساتھیوں کی حکومتیں برطرف ہوئیں - قید وبند ' فرضی مقدمات اور جھوٹی شہادتوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا - اس مرتبہ چونکہ دکھ ان سے ملا تھا جن سے اس کی امید نہ تھی تو دل شکنی بھی زیادہ ہوئی مگر اس نے اس حال میں خود کو بھی سنبھالے رکھا اور دوسروں کو بھی سہارا دیا ہے -

غم سے مت گھبرانا ساتھی
ہمت ہار نہ جانا ساتھی

تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا - ایک بار پھر مارشل لاء لگا اور کتنے ہی سیاستداں عوامی تحریک کو چھوڑ نئے آنے والوں سے سمجھوتہ کر بیٹھے - وزارتیں بٹیں ' تقسیم انعام واکرام ہوا مگر جالب حسب سابق اس بٹوارے سے دور رہا - وہ جانتا تھا کہ خواہش اقتدار نے رہنماؤں کو ظلم وستم اور لطف و کرم میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم کردیا ہے وہ بخوبی آگاہ تھا کہ جمہوریت کی منزل کبھی مارشل لاء کے توسط سے حاصل نہیں ہوتی - وہ تو ہمیشہ سے سمجھاتا چلا آیا تھا -

کس دور میں تم رہتے ہو
صرصر کو صبا کہتے ہو
کیوں دشمن جاں کو پل پل
دیتے ہو صدا نادانوں

پر دولت اور اقتدار کے پجاریوں نے کبھی کسی کی سنی ہے جو اس کی سنتے ....

مانگی ہے ایک عمر اندھیروں سے روشنی
ہم نے بھی کب ثبوت دیا ہے شعور کا

اس عاقبت نا اندیشی کے نتائج وہی نکلے جن کا جالب کو خدشہ تھا۔ بندے خدا بن بیٹھے مگر اس دور میں بھی تمام تر پابندیوں کے باوجود گلشن کی دھواں دھواں فضا میں محبت جمہوریت اور عوامی حقوق کی بحالی کے ترانے تخلیق کر رہا ہے۔

ظلم کہیں بھی ہو ہم اس کا سر خم کرتے جائیں گے
محلوں میں اب اپنے لہو کے دیئے نہ جلنے پائیں گے
کٹیاؤں سے جب تک صبح نے منہ پھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

بحالی جمہوریت کی تحریک چلے تو وہ پنجاب کو جگانے کے لئے کوشاں نظر آتا سندھ میں ظلم ہو تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے خواتین اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے سڑکوں پر نکلیں تو جالب انکی مدد کو آپہنچتا ہے۔ اس تمام جدوجہد میں اسے نہ اپنی صحت کا خیال ہے نہ ڈاکٹروں کے مشوروں کی پرواہ۔ وہ تو جس روز اپنی شاعری کو عوامی جمہوریت کی راہ پر لے کر نکلا تھا اس نے تو اسی دن طے کرلیا تھا کہ

جینے کی دعا دینے والے یہ راز تجھے معلوم کہاں
تخلیق کا اک لمحہ ہے بہت ' بیکار جئے سو سال تو کیا

دنیا میں انقلاب ہمیشہ انہی لوگوں نے برپا کیا ہے جو رخ سحر کی لگن میں بے خطر آتش نمرود میں کود پڑے۔ یہی جنونی ' یہی دیوانے قوموں کی تقدیر بدلتے ہیں اور تاریخ انہیں سنہری الفاظ میں یاد رکھتی ہے۔ ژاں پال سارتر کی مثال لے لیجئے۔ اس کی شاعری اس کا فلسفہ ' اس کے ناول۔ اس کی سیاست ہمیشہ ظلم سے برسرپیکار رہے۔ کسی نظریے سے اسے خواہ کتنا ہی گہرا اختلاف کیوں نہ ہو وہ اس پر سرکاری پابندی کے خلاف صدائے احتجاج ضرور بلند کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر پیرس میں ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے اسے جب ایک سپاہی نے کوٹ کے کالر سے پکڑ کر گھسیٹا تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی عورت چلائی۔ " تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ شخص کون ہے؟ یہ سارتر ہے " سپاہی اس قدر نادم ہوا کہ اپنی لاٹھی وہیں پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اور یہاں

بڑے بنے تھے جالب صاحب
گرے سڑک کے بیچ
لاٹھی کھائی گالی کھائی
پڑے سڑک کے بیچ

جہاں تک جالب کی شاعری کی فنی نزاکتوں کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں ناقدین فرماتے ہیں کہ یہ فن کے تقاضوں پر پوری نہیں اترتی ' ان کا کلام جلسوں کے لئے موزوں ہے ادبی محفلوں کے لئے نہیں ۔ اس کا ادب میں کوئی مستقل مقام نہیں یہاں سوال یہ ہے کہ کیا کوئی بات اس بات سے زیادہ اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے جس کا پرچار جالب کی زندگی کا نصب العین ہے ۔ پھر جالب کا تو کچھ انداز ہی یہ ہے کہ وہ بات صاف صاف اور کھل کے کہنے کا عادی ہے ۔ قلم کو وہ قلم لکھتا ہے اس کی تشریح کے لئے استعاروں کی تلاش میں گم ہو کر خاموش نہیں ہو جاتا ۔

مجھ سے خفیف ہیں میرے ہم عصر اس لئے
میں داستان عہد ستم کھل کے کہہ گیا

اور پھر ہمارے لئے تو جالب کی شاعری کے بارے میں فیض صاحب کا یہ قول حرف آخر ہے کہ ۔ " ولی دکنی سے لے کر آج تک کسی بھی شاعر کو اتنے سامعین میسر نہیں آئے جتنے حبیب جالب کو ملے ہیں " خود جالب بھی اپنی اس پذیرائی کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتا ہے ۔

شہرت کی یہ دولت کیا کم ہے گر پاس نہیں ہے مال تو کیا

افکار عارف کا کہنا ہے موجودہ دور کے شعراء کو آنے والی نسلوں کے سامنے نادم ہونے سے اگر کوئی شخص بچائے گا تو وہ حبیب جالب ہے ۔ لیکن جالب ہمیں صرف ندامت ہی سے نہیں بچاتا وہ گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں امید کی شمع بھی روشن کئے ہوئے ہے ۔ اس کی شاعری امید کی شاعری ہے ۔ وہ یقین دلاتا ہے کہ ظلمت کا مقدر چھٹ جاتا ہے وہ نوید دیتا ہے کہ مٹ جائیں گے سب پروردۂ شب اور

ہو گا طلوع کوہ کے پیچھے سے آفتاب
شب مستقل رہے گی کبھی یہ نہ سوچئے

اُردو برِصغیر ہندو پاکستان میں احتجاج کی زبان رہی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران، جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا، غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحد رکھنے میں اُردو نے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہی سبب تھا کہ پاکستان کے قیام کے بعد اُردو کو قومی زبان کے طور پر اختیار کیا گیا۔ حالانکہ پاکستان کے کسی بھی صوبے کی مادری زبان اُردو نہیں تھی۔ اُردو میں احتجاج نہ صرف نثر میں بلکہ نظم میں اور بھی زیادہ مؤثر اور بلیغ وسیلۂ اظہار کے طور پر سامنے آیا۔ اِس صدی کے آغاز میں علامہ اقبالؒ نے برصغیر کے مسلمانوں کو اُن کی صحیح صورتِ حال سے آگاہی بخشی اور قومی پہچان اور ملّی تشخص کا شعور عطا کیا تاکہ وہ متحد ہو کر برطانوی راج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو سکیں اور اپنے لئے ایک روشن مستقبل کی صورت گری کر سکیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد فیض احمد فیضؔ نے اقبالؒ کی روایت کو آگے بڑھایا اور خلقِ خدا کے رنج والم کی حکایتیں اور ایک جمہوری اور عادلانہ نظام کے قیام کے لئے عوامی جدوجہد

کا احوال رقم کیا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں اظہار کی آزادی پر پابندیاں ہیں اور ابلاغِ عامّہ کے ذرائع پر حکومت کا قبضہ ہے اُردو شاعری احتجاج کے ایک ایسے پیرایۂ اظہار کی شکل اختیار کر گئی ہے جو ہر طرح کی سنسر شپ کی پابندیوں سے ٹکراجاتی ہے اور سُرخرو ہوتی ہے۔ جبر و استبداد کے اس ماحول میں حبیب جالب کی شاعری ایک فریاد، ایک مسلسل چیخ اور ایک مستقل چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔

حبیب جالب عام لوگوں کا شاعر ہے۔ وہ خلقِ خدا سے براہِ راست مکالمہ کرتا ہے بہت سہل اور سادہ مگر انتہائی مؤثر لب و لہجے میں۔ یہی سبب ہے کہ اپنے اثر و نفوذ اور عوامی مقبولیت کے باعث جالب کی شاعری عصری آوازوں میں نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔ جالب کے نغمے مزدوروں میں اور کسانوں میں، طالب علموں میں، دکانداروں میں، زندگی کے سب شعبوں میں ستائے ہوئے دکھی لوگوں میں شہروں شہروں، قریوں قریوں، گلیوں گلیوں میں اپنا جادو جگاتے ہیں۔ جالب کی زندگی اور شاعری اپنے مقصد پر اس کے مکمّل اعتماد کی آئینہ دار ہیں۔ عوام سے وابستگی اُس کا عقیدہ اور اس سے منسلک رہنا اُس کا مقصدِ حیات ہے۔

"حرفِ سرِدار" کی صورت میں ہم حبیب جالب کو عوام کی قوت اور برتری پر غیر متزلزل یقین کے سبب خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔

(حرف سردار کا پیش لفظ)

متفرق کلام

عزت سے جینا ہے اگر تو بجٹ گھٹاؤ مولانا
امریکہ کی چوکھٹ پر سر کو نہ جھکاؤ مولانا

کہا ہمیشہ جنگ تباہی ' آنسو ' آہیں دیتی ہے
کہا ہمیشہ جنگ سے اپنی جان بچاؤ مولانا

آپ کی جانبداری تو لکھی ہے آپ کے چہرے پر
آپ کرانے نکلے ہیں کیا بیچ بچاؤ مولانا

عالی شان مکان پجارو ٹھاٹ باٹ نوکر چاکر
کیسے ملتے ہیں ہم کو گر سکھلاؤ مولانا

اپنے رخ پر درد سجالو اب تو بے بس لوگوں کے
جب تک جنگ خلیج میں ہے سرمہ نہ لگاؤ مولانا

❀

جنگوں سے دور امن سے ــــ انسان کی طرح
زندہ رہو جہاں میں ایران کی طرح

اہل عراق بھی ہیں فصیلوں کی شکل میں
لشکر اگر عدو کا ہے طوفان کی طرح

نکلے ہیں اس نگر سے بمشکل سفید فام
آئے جہاں کہیں بھی یہ مہمان کی طرح

لوگوں کی کیا رضا ہے کوئی پوچھتا نہیں
حاکم ہیں میرے دیس کے سلطان کی طرح

اہلِ ہوس نے دولتِ دنیا کے واسطے
آبادیاں بنائی ہیں شمشان کی طرح

زردار آج کے یہ ستم گار آج کے
دیتے ہیں اجرتیں بھی ہمیں دان کی طرح

مالک بنے ہوئے میرے گھر کے ہیں ان دنوں
جالبؔ کبھی جو تھے میرے دربان کی طرح

❀

جن کے ہونٹوں پر لگی ہیں ڈالروں کی چپیاں
وہ ستم گر کو ستم گر کس طرح کہہ دیں میاں

جنگ نے بغداد کی راتوں کو ویراں کردیا
کس کے ہونٹوں پر نہیں ' بربادیوں کی داستاں

جنگ ہجرِ دوستاں ' قتلِ سرود نغمہ گر
جنگ شامِ کربلا ' آہ و فغاں ' اشکِ رواں

اس طرح اجڑا نہ تھا ' میرے خیالوں کا چمن
خون میں لت پت ہیں پتے ' دکھ میں ڈوبا سماں

چہرہ محبوب بھی اچھا مجھے لگتا نہیں
بجھ گئی ہے آرزوئے قربتِ زہرہ وشاں

چھوڑ دے اتنا سلگنا ' اے میرے دل چھوڑ دے
کچھ نہ کچھ ہوگا ' جہاں والے کو بھی فکرِ جہاں

ہر نفس ان کے حصارِ مرگ میں ہے زندگی
وہ سنے تیری غزل جالبؔ انہیں فرصت کہاں

❀ ۱۹۷۷ء

کہاں نسبت انہیں کعبے سے بھائی
کریں جو بُش کے در پہ جبہ سائی

ادھر جانوں کی شمعیں بُجھ رہی ہیں
ادھر برپا پتنگوں کی لڑائی

یہاں آپس میں ہم دست و گریباں
وہاں باطل سے پنجا آزمائی

سلامت آپ کی عزت ما آبی
نہ ہونے دیں وطن کی جگ ہنسائی

بلا لیں جنگ سے لشکر بلا لیں
کریں پھر امن کی نغمہ سرائی

محبت سے رہے آباد عالم
نہیں اچھی کسی پر بھی چڑھائی

بہے گا اور کتنا خون انسان
اری دنیا دہائی ہے دہائی

شکستہ ساز ہوں میری صدا کیا
تماشا بن گئی ہے بے نوائی

بتاؤں کیا بسر کیسے ہوئی ہے
جو دن گزرا تو غم کی رات آئی

آج پھر تم نظر نہیں آئے
پھر تمنا کے پھول مرجھائے

آج پھر سوگوار آنکھوں نے
لالہ و گل پہ اشک برسائے

آج پھر عہدِ غم کے افسانے
میری بے تابیوں نے دہرائے

اس بھرے شہر میں تمہارا پتہ
کس کو معلوم کون بتلائے

کن دیاروں میں کھو گئے ہو تم
ہم ستاروں کی خاک چھان آئے

تیری آنکھوں کا عجب طرفہ سماں دیکھا ہے
ایک عالم تری جانب نگراں دیکھا ہے

کتنے انوار سمٹ آئے ہیں ان آنکھوں میں
اک تبسم ترے ہونٹوں پہ رواں دیکھا ہے

ہم کو آوارہ و بے کار سمجھنے والو
تم نے کب اس بتِ کافر کو جواں دیکھا ہے

صحنِ گلشن میں کہ انجم کی طرب گاہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں جانے کہاں دیکھا ہے؟

وہی آوارہ و دیوانہ و آشفتہ مزاج
ہم نے جالبؔ کو سرِ کوئے بتاں دیکھا ہے

❀

بھیگیں نہ آنسوؤں سے کنارے سویز کے
بہتے رہیں سکون سے دھارے سویز کے

بجھنے نہ پائے موجِ ہوائے یہود سے
اک جوت جگ رہی ہے سہارے سویز کے

دائم فضا میں پرچمِ نصرت رہے بلند
موتی یونہی لٹائیں نظارے سویز کے

عُقبےٰ کا ہے خیال تو عقبہ کا ساتھ دو
ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنّا کا ساتھ دو

ناطہ ہر ایک توڑ کے افرنگیوں سے آج
خوددار ہو تو مشرقِ وسطیٰ کا ساتھ دو

مغرب کے راہزن کا جنوں پھر ہے جوش پر
گر امن چاہتے ہو تو دنیا کا ساتھ دو

❀

شہر پہ خوف کے سائے ہیں
یہ کیسے دن آئے ہیں!

روتے ہیں پیاسے نیناں
درد کے بادل چھائے ہیں

موت سے لڑنے والے لوگ
گھبرائے گھبرائے ہیں

چاند سے چہرے پھول سے لوگ
مُرجھائے مُرجھائے ہیں

چھوڑ کے ہم اُن گلیوں کو
آوارہ کہلائے ہیں

حال یہ ہے اب تجھ سے بھی
شرمائے شرمائے ہیں

گئے تھے شہر کراچی ہم
آنسو، آہیں لائے ہیں

❀

ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر، دیوار کو در، کرگس کو ہما کیا لکھنا

اک حشر بپا ہے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنبدِ بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

یہ اہلِ حشم، یہ دارا و جم سب نقش بر آب ہیں اے ہمدم
مٹ جائیں گے سب پروردۂ شب اے اہلِ وفا رہ جائینگے ہم
ہو جاں کا زیاں پر قاتل کو معصوم ادا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

لوگوں پہ ہی ہم نے جاں واری کی ہم نے انہی کی غمخواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

حق بات پہ کوڑے اور زنداں باطل کے شکنجے میں ہے یہ جاں
انساں ہیں کہ سہمے بیٹھے ہیں خونخوار درندے ہیں رقصاں
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

ہر شام یہاں شامِ ویراں آسیب زدہ رستے گلیاں
جس شہر کی دھن میں نکلے تھے وہ شہرِ دلِ برباد کہاں
صحرا کو چمن، بن کو گلشن، بادل کو ردا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

اے میرے وطن کے فنکارو ظلمت پہ نہ اپنا فن وارو
یہ محل سراؤں کے باسی قاتل ہیں سبھی اپنے یارو
ورثے میں ہمیں یہ غم ہے ملا اس غم کو نیا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

نام چلے ہرنام داس کا کام چلے امریکہ کا
مورکھ اس کوشش میں ہیں سورج نہ ڈھلے امریکہ کا

نردھن کی آنکھوں میں آنسو آج بھی ہیں اور کل بھی تھے
برلا کے گھر دیوالی ہے تیل جلے امریکہ کا

دنیا بھر کے مظلوموں نے بھید یہ سارا جان لیا
آج ہے ڈیرا زرداروں کے سائے تلے امریکہ کا

کام ہے اس کا سوڈابازی سارا زمانہ جانے ہے
اسی لئے تو مجھ کو پیارے نام کھلے امریکہ کا

غیر کے بل بوتے پر جینا مردوں والی بات نہیں
بات تو جب ہے اے جالب احسان ٹلے امریکہ کا

ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے
لیکن ان دونوں ملکوں میں امریکہ کا ڈیرا ہے

ایڈ کی گندم کھا کر ہم نے کتنے دھوکے کھائے ہیں
پوچھ نہ ہم نے امریکہ کے کتنے ناز اٹھائے ہیں
پھر بھی اب تک وادیٔ گل کو سنگینوں نے گھیرا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

خان بہادر چھوڑنا ہوگا اب تو ساتھ انگریزوں کا
تا بہ گریباں آ پہنچا ہے پھر سے ہاتھ انگریزوں کا
میکملن تیرا نہ ہوا تو کینیڈی کب تیرا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

یہ دھرتی ہے اصل میں پیارے مزدوروں دہقانوں کی
اس دھرتی پر چل نہ سکے گی مرضی چند گھرانوں کی
ظلم کی رات رہے گی کب تک اب نزدیک سویرا ہے
ہندوستان بھی میرا اور پاکستان بھی میرا

آج اپنا ہے نہ کل تھا اپنا
کیوں کہیں تاج محل تھا اپنا
ایسا اُجڑا نہ ہُوا پھر آباد
ہاں جو اک شہرِ غزل تھا اپنا

❀

صحافی سے

اب شعر وہی ہے اے جالبؔ جس پر کوئی افسر جھوم اُٹھے
کر ایسی غزل سے بسم اللہ دفتر کا دفتر جھوم اُٹھے
جینا ہے اگر اس بستی میں اے دوست قصیدہ خواں ہو جا
اخبار میں لکھ ایسی باتیں صاحب کا سکتر جھوم اُٹھے

❀

ابھی اے دوست ذوقِ شاعری ہے وجہِ رُسوائی
تری بستی میں ہم پر اور بھی الزام آئیں گے
اگر اب بھی ہمارا ساتھ تُو اے دل نہیں دے گا
تو ہم اس شہر میں تجھ کو اکیلا چھوڑ جائیں گے

اشک آنکھوں میں اب ہیں آئے سے
بات چھپتی نہیں چھپائے سے
اپنی باتیں کہیں تو کس سے کہیں
سب یہاں لوگ ہیں پرائے سے

❀

اشکوں کے جگنوؤں سے اندھیرا نہ جائے گا
شب کا حصار توڑ کر کوئی آفتاب لا
ہر عہد میں رہا ہوں میں لوگوں کے درمیاں
میری مثال دے کوئی میرا جواب لا

❀

وطن فروش

اصول بیچ کے مسند خریدنے والو
نگاہِ اہلِ وفا میں بہت حقیر ہو تم
وطن کا پاس تمھیں تھا نہ ہو سکے گا کبھی
کہ اپنی حرص کے بندے ہو بے ضمیر ہو تم

❀

صد شکر

اہلِ ستم کے حلقہ بگوشوں میں ہم نہیں
صد شکر ان ضمیر فروشوں میں ہم نہیں

خامشی سے ہزار غم سہنا
کتنا دشوار ہے غزل کہنا

دکھ اٹھانے میں ہے کمال ہمیں
کر گیا فن یہ لازوال ہمیں

غم یہاں پر وہاں پہ شادی ہے
مسئلہ سارا اقتصادی ہے

کسے خبر تھی ہمیں راہبر ہی لوٹیں گے
بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے

مرا قصور کہ میں ان کے ساتھ چل نہ سکا
وہ تیز گام مرا انتظار کیوں کرتے

میں بھی ہوں تری طرح سے آوارہ و بیکار
اڑتے ہوئے پتے مجھے ہمراہ لئے چل

ہم ان نجوم کی تابش بھی چھین سکتے ہیں
بنا دیا ہے جنہیں فخرِ آسماں ہم نے

نہ کلیوں میں رنگت نہ پھولوں میں باس
بہار آئی پہنے خزاں کا لباس

گھنی چھاؤں میں دو گھڑی بیٹھ لو
کڑی دھوپ میں جاؤ گے کس کے پاس

ستارو یونہی جگمگاتے رہو
رفیقو کہیں ٹوٹ جائے نہ آس

شہر سے بستی سے ویرانے سے جی گھبرا گیا
اے جنوں تیرے ہراساں ہونے سے جی گھبرا گیا

اک مکمل خامشی اِک بیکراں گہرا سکوت
آج صحرا کا بھی دیوانے سے جی گھبرا گیا

پھر گئے جالبؔ نگاہوں میں کئی اُجڑے چمن
موسمِ گل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا

تجھے پایا کہ تجھ کو کھو دیا ہے
یہ اکثر سوچ کر دل رو دیا ہے
ہمارا داغِ دل جائے نہ جائے
ترا دامن تو ہم نے دھو دیا ہے

❀

تیری بستی میں جدھر سے گزرے
ہائے کیا لوگ نظر سے گزرے
کتنی یادوں نے ہمیں تھام لیا
ہم جو اُس راہ گزر سے گزرے

❀

جنوں کے بس میں ہے میرا بری جہاں وطن
وہ ظلم اس پہ ہوئے ہیں کہ ہے نڈھال وطن
اسے رہائی ملے تو مری رہائی ہو
ازل سے ہے میری صورت خراب حال وطن

❀

جہاں آساں تھا دن کو رات کرنا
وہ گلیاں ہوگئی ہیں ایک سپنا
اب ان کی یاد سے پلکوں پہ روشن
اب ان کو کہہ نہیں سکتے ہم اپنا

❀

دوستو مشورے نہ دو ہم کو
مشوروں سے دماغ جلتا ہے
یہ کسی نے غلط کہا تم سے
ان کھلونوں سے جی بہلتا ہے

❀

دیارِ سبزہ و گُل سے نکل کر
دل و جاں نذرِ صحرا ہو گئے ہیں
کہاں وہ چاند سی ہنستی جبینیں
گھنی تاریکیوں میں کھو گئے ہیں

❀

ڈوب جائے گا آج بھی خورشید
آج بھی تم نظر نہ آؤ گے
بیت جائے گی اس طرح ہر شام
زندگی بھر ہمیں رُلاؤ گے

❀

فصلِ قرار آئے گی

ڈھلے گی شام سحر نغمہ بار آئے گی
ہم آئیں گے تو چمن میں بہار آئے گی
امیدِ عہدِ ستم کے گماشتوں سے کہہ
ہمارے ساتھ ہی فصلِ بہار آئے گی

رائٹرز گلڈ

ذہانت رو رہی ہے منہ چھپائے
جہالت قہقہے برسا رہی ہے
ادب پر افسروں کا ہے تسلط
حکومت شاعری فرما رہی ہے

❋

رنگ و بوئے گلاب کہہ لوں گا
موجِ جامِ شراب کہہ لوں گا
لوگ کہتے ہیں تیرا نام نہ لوں
میں تجھے ماہتاب کہہ لوں گا

❋

زلف کی بات کیے جاتے ہیں
دل کو یوں رات کیے جاتے ہیں
چند آنسو ہیں انھیں بھی جالب
نذرِ حالات کیے جاتے ہیں

❋

سبزہ زاروں میں گزر تھا اپنا
مست و شاداب نگر تھا اپنا
جب اٹھاتا ہے کوئی محفل سے
یاد آتا ہے کہ گھر تھا اپنا

❋

سچ کہہ کے کسی دور میں پچھتائے نہیں ہم
کردار پہ اپنے کبھی شرمائے نہیں ہم
زنداں کے در و بام حسیں دیرینہ شناسا
پہنچے ہیں سرِ دار تو گھبرائے نہیں ہم

❋

سو گئے انجمِ شب یاد نہ آ
اے مری جانِ طرب یاد نہ آ
مری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
کوئی آنسو نہیں اب یاد نہ آ

❋

آدم جی ایوارڈ

سینۂ انساں کا یارو
زخم سلے اب یا نہ سلے
اپنی تو بس دوڑ ہے یہ
آدم جی ایوارڈ ملے

❋

اے لوگو!

شیوخ و شاہ بھی کب ہیں ہمارے یار اے لوگو!
ہمارا خون پیتے ہیں یہ سب مکار اے لوگو!
یہ تخت و تاج والے غاصبوں ہی کے مصاحب ہیں
ہمارے راستے کی یہ بھی ہیں دیوار اے لوگو!

❋

غریبوں کا گلشن جلا ہی کرے ہے
خدا جو کرے ہے بھلا ہی کرے ہے
نہیں جس کو آتا مقدر بنانا
یونہی ہاتھ اپنے ملا ہی کرے ہے

❋

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دور تک تیرگی میں چلنا ہے
صورتِ شمع جل سکو تو چلو

❋

شہر بدر طلبا کے نام

فضا میں اپنا لہو جس نے بھی اچھال دیا
ستم گروں نے اسے شہر سے نکال دیا
یہی تو ہم سے رفیقانِ شب کو شکوہ ہے
کہ ہم نے صبح کے رستے پہ خود کو ڈال دیا

❋

آج کل

قانونِ اہلِ جور نے ایسے بنا دیئے
لرزاں عدالتوں کے ترازو ہیں آج کل
مسند نشیں ہوئی ہے تب و تاب شیطنت
انسانیت کی آنکھ میں آنسو ہیں آج کل

❋

کوچۂ صبح میں جا پہنچے ہم
صورتِ موجِ صبا پہنچے ہم
نزہتِ گل کا پیام آیا تھا
لاکھ تھے آبلہ پا، پہنچے ہم

❋

کتنے خاموش تھے چپ چاپ تھے رستے گلیاں
یہ زمیں بول اٹھی میرے سخن سے یارو
ملک میں عام کریں اپنے قلم کی دولت
یہ گذارش ہے مری اہلِ سخن سے یارو

❋

لبریز جام دردِ تہہ جام کو لکھو
حسنِ تمام بجھتی ہوئی شام کو لکھو
وجہ نشاط نشترِ آلام کو لکھو

❋

مدتیں ہو گئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے
چاند تارے بھی اُن کا اے جالبؔ
تھرتھراتے ہیں سامنا کرتے

❋

مری نگاہ سے وہ دیکھتے رہے ہیں مجھے
رہا ہوں میں بھی کبھی اس نگاہ کا معیار
یہاں نہ تلخ نوائی سے کام لو جالب
رہینِ درد نہیں ہیں یہ بستیاں یہ دیار

***

میں تو سورج ہوں ستارے مرے آگے کیا ہیں
شب ہے کیا شب کے سہارے مرے آگے کیا ہیں
جو ہمیشہ رہے شاہوں کے ثنا خواں جالب
وہ سخن ساز بچارے مرے آگے کیا ہیں

***

نت نئے شہر نت نئی دنیا
ہم کو آوارگی سے پیار رہا
ان کے آنے کے بعد بھی جالب
دیر تک ان کا انتظار رہا

***

برق پاشی

نظر جس کی تھی کبھی سپاہیوں کی بدمعاشی پر
توجہ ان دنوں ہے شیخ صاحب کی فحاشی پر
سلگتے ہیں نشیمن اور خوں شاخوں سے بہتا ہے
مشوش ہیں فقط وہ اس بلا کی برق پاشی پر

***

وہ کنارِ جو ملاقاتیں گئیں
ساتھ ان کے چاندنی راتیں گئیں

دل عجب قصوں میں اب ہے مبتلا
گیسو و رخسار کی باتیں گئیں

***

ہر اِک شاخِ تمنا جل رہی ہے
مری بندوق مجھ پر چل رہی ہے
اگر کہتے ہیں ہم قاتل کو قاتل
تو اُن کو بات یہ کیوں کھل رہی ہے

***

رحم آتا ہے

ہر ایک شاخ پہ برقِ تپاں ہے رقص کناں
فضائے صحنِ چمن تجھ پہ رحم آتا ہے
قدم قدم پہ یہاں پر ضمیر بکتے ہیں
مرے عظیم وطن تجھ پہ رحم آتا ہے

***

میں خوش نصیب شاعر

ہر دور کے بھکاری شاعر ادیب سارے
بکتے قدم قدم پہ دیکھے خطیب سارے
بیچا نہیں ہے میں نے اپنا ضمیر جالبؔ
میں خوش نصیب شاعر اور بدنصیب سارے

❀

ہر بوالہوس ہے معتبر دیارِ وفا یہاں
ہر راہزن ہے راہبر و میرِ کارواں
ہر اہلِ زر ہے خاک نشینوں کا ترجماں
لوگ اپنے قاتلوں کے ہیں عشاق میری جاں

❀

احمد ریاض کی یاد میں

پہلے ہی اپنا کون تھا اے دوست
اب جو تو ہو گیا جدا اے دوست

ساتھ کس نے دیا کسی کا یہاں
ساری دنیا ہے بے وفا اے دوست

تو جلا شمع کی طرح سرِ بزم
نور تھا تیرا ہم نوا اے دوست

کتنی خوش بخت ہے زمیں وہ بھی
اب جو دے گی ترا پتا اے دوست

یہ زمانہ ہے شعر کا دشمن
اس زمانے کا کیا گلا اے دوست

صبح آئے گی لے کے وہ خورشید
جس پہ تو ہو گیا فدا اے دوست

بیادِ جوشؔ

ہم نے دل سے تجھے سدا مانا
تو بڑا تھا تجھے بڑا مانا

میر و غالبؔ کے بعد انیسؔ کے بعد
تجھ کو مانا بڑا بجا مانا

تو کہ دیوانۂ صداقت تھا
تو نے بندے کو کب خدا مانا

تجھ کو پروا نہ تھی زمانے کی
تو نے دل ہی کا ہر کہا مانا

تجھ کو خود پہ تھا اعتماد اتنا
خود ہی کو تو نے رہنما مانا

کی نہ شب کی کبھی پذیرائی
صبح کو لائقِ ثنا مانا

ہنس دیا سطحِ ذہنِ عالم پر
جب کبھی بات کا برا مانا

یوں تو شاعر تھے اور بھی اے جوشؔ
ہم نے تجھ سا نہ دوسرا مانا

حسن ناصر

ترا لہو ہمیں دیتا ہے یہ پیام کہ ہم
تمام دہر میں لہرائیں امن کا پرچم
تجھے نظر میں رکھیں تیرے راستے پہ چلیں
سرِ زمانہ کریں سامراج کا سر خم

نہ تجھ کو اور نہ تری سوچ کو بھلائیں گے
ترے خیال و نظر کی قسم حسن ناصر
ترے خیال و نظر کے دیئے جلائیں گے

یہ رہزنوں کی حکومت نئی نہیں یارو
ہر ایک چہرے سے پردہ ہمیں اٹھانا ہے
ہماری جنگ رہی ہے رہے گی باطل سے
ہمیں دوام ہے ہم کو جہاں پہ چھانا ہے

ہم آ رہے ہیں ہم آئیں گے ہم ہی آئیں گے
ترے خیال و نظر کی قسم حسن ناصر
ترے خیال و نظر کے دیئے جلائیں گے

نذرِ ساحر

یوں وہ ظلمت سے رہا دست و گریباں یارو
اس سے لرزاں تھے بہت شب کے نگہباں یارو

اُس نے ہر گام، دیا حوصلۂ تازہ ہمیں
وہ نہ اک پل بھی رہا ہم سے گریزاں یارو

اس نے مانی نہ کبھی تیرگیٔ شب سے شکست
دل اندھیروں میں رہا اُس کا فروزاں یارو

اُس کو ہر حال میں جینے کی ادا آتی تھی
وہ نہ حالات سے ہوتا تھا پریشاں یارو

اُس نے باطل سے نہ تا زیست کیا سمجھوتہ
دہر میں اُس سا کہاں صاحبِ ایماں یارو

اس کو تھی کشمکش دیر و حرم سے نفرت
اُس سا ہندو نہ کوئی اس سا مسلماں یارو

اس نے سلطانیٔ جمہور کے نغمے لکھے
روح شاہوں کی رہی اس سے پریشاں یارو

اپنے اشعار کی شمعوں سے اجالا کر کے
کر گیا شب کا سفر کتنا وہ آساں یارو

اُس کے گیتوں سے زمانے کو سنواریں آؤ
روحِ ساحر کو اگر کرنا ہے شاداں یارو
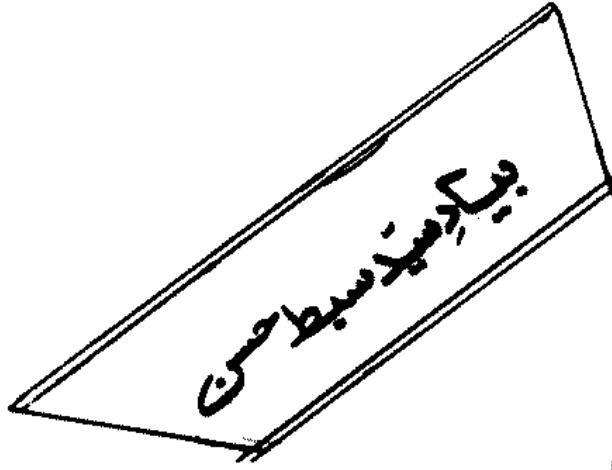
تہذیب تھا، شعور تھا سبطِ حسن تمام
وہ کیا اُٹھا کر خواب ہُوئی انجمن تمام

اُس کو کہاں تھی چند گلوں کی بقا عزیز
اُس کو تو آرزُو تھی کہ مہکے چمن تمام

اُس کی نگارشات سے بڑھتی رہے گی بات
ہوگا نہ اِرتقا کا کبھی بانکپن تمام

سیکھیں گے اور سکھائیں گے کیسے کریں حیات
اُس کے خیال و فکر سے اہلِ سخن تمام

لیتی ہے زیست اُن کے قدم اُس نے سچ کہا
ڈرتے نہیں ہیں موت سے جب مَرد و زَن تمام

غاصب نہیں رہیں گے وہ کیا خوب کہہ گیا
اُٹھیں گے جب عتاب زَدہ خستہ تن تمام

چرچا ہے اُس کے نام کا جالبؔ گلی گلی
جاگے ہیں اُس کی سوچ سے کوہ و دمن تمام

❋

رُوٹھ جاؤں تو محبت سے منانے والا
اب کہاں کوئی مرے ناز اُٹھانے والا

سر کے بَل جاتے ہیں دَربار میں سب اہلِ قلم
کون اب میری طرح سر نہ جُھکانے والا

عُمر بھر وہ بھی رہا قصر نشینوں سے الگ
دامِ زرتار میں وہ بھی تھا نہ آنے والا

حُکمرانوں کا رہا وہ بھی مُلازم نہ مشیر
اُس کو آتا تھا کہاں کام زمانے والا

خواب میں محو تھا خاموش پڑا تھا کیسے
خواب سے سارے زمانے کو جگانے والا

میں بھی ہوں آپ بھی ہیں کون مگر اُس جیسا
دشمنِ تاجوَراں تخت گرانے والا

رَونقِ بزمِ جہاں یُونہی رہے گی جالبؔ
کچھ مگر اور تھا وہ رنگ جمانے والا

❋

بیادِ فراق

کم پرانا بہت نیا تھا فراق
اک عجب رمز آشنا تھا فراق

دور وہ کب ہوا نگاہوں سے
دھڑکنوں میں بسا ہوا تھا فراق

شامِ غم کے سلگتے صحرا میں
اک امنڈتی ہوئی گھٹا تھا فراق

امن تھا پیار تھا محبت تھا
رنگ تھا نور تھا نوا تھا فراق

فاصلے نفرتوں کے مٹ جائیں
پیار ہی پیار سوچتا تھا فراق

ہم سے رنج و الم کے ماروں کو
کس محبت سے دیکھتا تھا فراق

عشق انسانیت سے تھا اس کو
ہر تعصب سے ماورا تھا فراق

بیادِ فیض

فیض اور فیض کا غم بھولنے والا ہے کہیں
موت یہ تیرا ستم بھولنے والا ہے کہیں

ہم سے جس وقت نے وہ شاہِ سخن چھین لیا
ہم کو وہ وقتِ الم بھولنے والا ہے کہیں

تیرے اشک اور بھی چمکائیں گے یادیں اس کی
ہم کو وہ دیدۂ نم بھولنے والا ہے کہیں

کبھی زنداں میں کبھی دور وطن سے اے دوست
جو کیا اس نے رقم بھولنے والا ہے کہیں

آخری بار اسے دیکھ نہ پائے جالب
یہ مقدر کا ستم بھولنے والا ہے کہیں

لتا

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

تیری اگر آواز نہ ہوتی
بجھ جاتی جیون کی جوتی

تیرے سچے سُر ہیں ایسے
جیسے سورج چاند ستارے

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

کیا کیا تو نے گیت ہیں گائے
سُر جب لاگے منؔ جھک جائے

تجھ کو سُن کر جی اُٹھتے ہیں
ہم جیسے دکھ درد کے مارے

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

میرا اجھ میں آن بسی ہے
انگ وہی ہے رنگ وہی ہے
جگ میں تیرے داس ہیں اتنے
جتنے ہیں آکاش پہ تارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

❋

(حیدرآباد جیل میں لکھی گئی)

میراجی

گیت کیا کیا لکھ گیا، کیا کیا فسانے کہہ گیا
نام یونہی تو نہیں اُس کا ادب میں رہ گیا

ایک تنہائی رہی اُس کی انیس زندگی
کون جانے کیسے کیسے دُکھ وہ تنہا سہہ گیا

سوز میرا کا ملا جی کو تو میرا جی بنا
دلنشیں لکھے سخن اور دھڑکنوں میں رہ گیا

درد جتنا بھی اُسے بیدرد دُنیا سے ملا
شاعری میں ڈھل گیا کچھ آنسوؤں میں بہہ گیا

اک نئی چھب سے جیا وہ اِک عجب ڈھب سے جیا
آنکھ اُٹھا کر جس نے دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا

اُس سے آگے کوئی بھی جانے نہیں پایا ابھی
نقش بن کے رہ گیا جو اُس کی رَو میں بہہ گیا

نذرِ مصحفی

اک شخص باضمیر مرا یار مصحفی
میری طرح وفا کا پرستار مصحفی

رہتا تھا کج کلاہ امیروں کے درمیاں
یکسر لیے ہوئے مرا کردار مصحفی

دیتے ہیں دادِ غیر کو کب اہلِ لکھنؤ
کب داد کا تھا ان سے طلبگار مصحفی

ناقدریٔ جہاں سے کئی بار آ کے تنگ
اک عمر شعر کہہ کے رہا بیزار مصحفی

دربار میں تھا بار کہاں اس غریب کو
برسوں مثالِ میر پھرا خوار مصحفی

میں نے بھی اس گلی میں گزاری ہے روکے عمر
ملتا ہے اس گلی میں کسے پیار مصحفی

نذرِ مارکس

یہ جو شب کے ایوانوں میں اک ہلچل اک حشر بپا ہے
یہ جو اندھیرا سمٹ رہا ہے یہ جو اجالا پھیل رہا ہے

یہ جو ہر دکھ سہنے والا دکھ کا مداوا جان گیا ہے
مظلوموں مجبوروں کا غم یہ جو مرے شعروں میں ڈھلا ہے

یہ جو مہک گلشن گلشن ہے یہ جو چمک عالم عالم ہے
مارکسزم ہے مارکسزم ہے مارکسزم ہے مارکسزم ہے

نورجہاں

ہجومِ یاس میں جوت آس کی تری آواز
ہم اہلِ درد کی ہے زندگی تری آواز

لبوں پہ کھلتے رہیں پھول شعر و نغمہ کے
فضائیں رنگ بکھیرے یونہی تری آواز

دیارِ دیدہ و دل میں ہے روشنی تجھ سے
ہے چہرہ چاند مدھر چاندنی تری آواز

ہو ناز کیوں نہ مقدر پہ اپنے نورجہاں
تجھے قریب سے دیکھا سُنی تری آواز

نہ مٹ سکے گا ترا نام رہتی دُنیا تک
رہے گی یوں ہی سدا گونجتی تری آواز

❋

یوسف کامران

اوجھل ہوا ہے جب سے وہ چہرہ بہار سا
عالم تمام لگنے لگا ہے غبار سا

وہ کیا اٹھا یقین زمانے سے اُٹھ گیا
وہ تھا تو اس جہاں پہ تھا کچھ اعتبار سا

کذب و ریا سے اُس کا کوئی واسطہ نہ تھا
جیتا وہ کس طرح سے یہاں بن کے پارسا

اس سے ملے بغیر نہ آتا تھا ہم کو چین
رہتا تھا وہ ہمارے لیے بے قرار سا

کس کو دکھائیں داغ کہیں کس سے حالِ دل
اب کون اس جہاں میں ہے اُس غمگسار سا

اس سے دیارِ دیدہ و دل تھا چمن چمن
وہ تھا جو ایک اُس کا ہمیں انتظار سا

لے کے پھرے ہیں دل کو بہت دشت و باغ میں
سایہ نہ مل سکا کہیں دیوارِ یار سا

دشوار کب تھے اس کی رفاقت میں مرحلے
جالبؔ نہیں ملے گا کوئی اپنے یار سا

❋

شہرِ دہلی

دیارِ داغ و بیخود شہرِ دہلی چھوڑ کر تجھ کو
نہ تھا معلوم یوں روئے گا دل شام و سحر تجھ کو

کہاں ملتے ہیں دنیا کو کہاں ملتے ہیں دنیا میں
ہوئے تھے جو عطا اہلِ سخن اہلِ نظر تجھ کو

تجھے مرکز کہا جاتا تھا دنیا کی نگاہوں کا
محبت کی نظر سے دیکھتے تھے سب نگر تجھ کو

بقولِ میر اوراقِ مصور تھے ترے کوچے
مگر ہائے زمانے کی لگی کیسی نظر تجھ کو

نہ بھولے گا ہماری داستاں تو بھی قیامت تک
دلائیں گے ہماری یاد تیرے رہگزر تجھ کو

جو تیرے غم میں بہتا ہے وہ آنسو رشکِ گوہر ہے
سمجھتے ہیں متاعِ دیدہ و دل دیدہ ور تجھ کو

میں جالب دہلوی کہلا نہیں سکتا زمانے میں
مگر سمجھا ہے میں نے آج تک اپنا ہی گھر تجھکو

لائل پور

لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد
دھڑکن دھڑکن ساتھ رہے گی اس بستی کی یاد
میٹھے بولوں کی وہ نگری گیتوں کا سنسار
ہنستے بستے ہائے وہ رستے نغمہ ریز دیار
وہ گلیاں وہ پھول وہ کلیاں رنگ بھرے بازار
میں نے ان گلیوں پھولوں کلیوں سے کیا ہے پیار
برگِ آوارہ میں بکھری ہے جس کی روداد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

کوئی نہیں تھا کام مجھے پھر بھی تھا کتنا کام
ان گلیوں میں پھرتے رہنا دن کو کرنا شام
گھر گھر میرے شعر کے چرچے گھر گھر میرا نام
راتوں کو دہلیزوں پر ہی کر لینا آرام
دکھ سہنے میں چپ رہنے میں دل تھا کتنا شاد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

میں نے اس نگری میں رہ کر کیا کیا لکھے گیت
جن کے کارن لوگوں کے من میں ہے میری پریت
ایک لگن کی بات ہے جیون کیسی ہار اور جیت
سب کے مجھ کو پیار ہے جالب سب ہیں میرے میت
داد تو ان کی یاد ہے مجھ کو بھول گیا بے داد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

اُچیاں کند اں والا گھر سی رہیندے ساں کھل کے
ایسی واوگائی اوربا رہ گئی جند ڑی رُل کے

چار چوفیرے درد ہنیرے جھجو ڈیرے ڈیرے
دکھیارے ونجارے آ گئے کتھر رستہ بھُل کے

یاد آئیاں کج ہوروی تیرے شہر دیاں برساتاں
ہوروی چمکے داغ دلاں دے نال اتھکاں ڈُھل کے

اپنی گل نہ چھیڑیں جالب شاعر کجھ وی آکھن
اپنی رنگت کھو دیندے نیں رنگ رنگاں وچ گھل کے

اُستاد دامن

ساڈے دیس نوں چوراں تے ڈاکواں توں نئیں مل نجات استاد دامن
اجّے دھون ہوئی ہو امریکیاں دی بدلے نئیں حالات استاد دامن

تیرے وانگ جینا تیرے وانگ مرنا سامراجیاں توں ساں نئیں ڈرنا
اساں چھڈنی نئیں حق سچ دی گل کہنا رات نوں رات استاد دامن

اساں لوکاں دے عشق وچ مبتلا ایں لوکی پیار کردے اپنے ڈنڈیاں نوں
اے ساتھ جانویں ساڈا دین نہ دین ڈینا لوکاں اساتھ استاد دامن

چین کھون نئیں دینا لُٹیریاں نوں خون پین نئیں دینا ڈُبڑیاں نوں
تیرے ذہن دی سوں تیری سوچ دی سوں ڈینی ظلم نوں مات استاد دامن

اساں نال پڑوسیاں نئیں لڑنا اساں بھینٹ امریکہ دی نئیں چڑھنا
اساں دیس دی نئیں توہین کرنی لینی نئیں خیرات اُستاد دامن

اِک شاہِ سُخن

اِک کُٹیا وِچ پیا رہیا اِک شاہِ سخن
دُنیا جنّوں کہندی سی دامن، دامن

ہوراں وانگوں اوہ درباری بنیا نئیں
بُھل کے وی شاعر سرکاری بنیا نئیں
لوکاں اُتّے وار گیا اپنا جیون

اک شاہِ سخن

اوہدے شعر ستم گاراں نوں کھلدے رہے
طوفاناں وِچ دِیوے اوہدے بلدے رہے
کردا رووے گا اوہدے اُتّے ناز وطن

اک شاہِ سخن

اِک مجبور عورت دا گیت

ایہہ گھنگرو نئیں زنجیراں نیں
دنیا نے پیریں پائیاں
ایہہ چھنکدیاں رُسوائیاں
نئیں سُندا کوئی دُہائیاں

اک نظم

ایدھر گھوڑا اودھر گاں
دس بندیا میں کدھر جاں

ایدھر مُلّا دی چھونی ایں
اودھر پنڈت دی تونی ایں

ایدھر حال اگر مندا اے
اودھر وی تے بھکھ چونی اے

آدے کتے ناں سُکھ دا ساں
دس بندیا میں کدھر جاں

❋

امریکہ توں جنگ اوندی اے

امریکہ توں جنگ اوندی اے
بھکھ اوندی اے ننگ اوندی اے

روٹی کپڑا، چھت نئیں اوندی
چہریاں تے رنگت نئیں اوندی
تاپ اوندا اے کھنگ اوندی اے
امریکہ توں جنگ اوندی اے

امن، محبت، پیار نئیں اوندا
کوئی اوتھوں غم خوار نئیں اوندا
اوتھوں بارش سنگ اوندی اے
امریکہ توں جنگ اوندی اے
بھکھ اوندی اے ننگ اوندی اے

❋

باز آجاوَ

بن دی باغ چو فیریوں نو سدا اے
کالا سپ ساڈا لہو چوسدا اے
آپ سازّ کے اپنے آ لھنے نوں
اساں آکھنا دوش لے رُوس دا اے

لوٹاں دی سرکار

ڈاکواں دا جے ساتھ نہ دیندا پنڈ دا پہریدار
اَج پیریں زنجیر نہ ہُندی جیت نہ بندی ہار
پگاّں اپنے گل وِچ پالو ٹروپیٹ دے بھار
چڑھ جائے تے مشکل لہندی لوٹاں دی سرکار

❖

(یحییٰ خان کے دور میں لکھی گئی)

غزل

جالبؔ سائیں کدی کدائیں چنگی گل کہہ جاندا اے
لکھ پوجو چڑھدے سورج نوں آخر ایہہ لیہہ جاندا اے

باج تیرے او دِل دے ساتھی دل دی حالت کی دساں
کدی کدی ایہہ تھکیا راہی رستے وچ بہہ جاندا اے

ساندل بار وسیندے ہیرے وسدے من تیرے بالے
دو پل تیرے غم دا پردہ اکھیاں وچ رہ جاندا اے

بانے دور آپے دی او دُنیا جتھے محبت سدا رہی
ہنجو بن کے دکھ وطناں دا اکھیاں چوں وہہ جاندا اے

فجرے اوہ چمکاندا ڈِٹھا جالبؔ ساری دُنیا نوں
راتیں جیہڑا ایک دُکھاں دے نس نس کے سہہ جاندا اے

❖

دُو جا گیت

چند وانگ شمع دے میری اے
راتاں نوں جلایا جاندا اے
دِن چڑھیاں بجھایا جاندا اے
ایبخ جشن منایا جاندا اے
اے کھیڈ اے ساری دولت دی
دسو کی خطا اے عورت دی
اِک محلاں دے وچ راج کرے
اِک نوں نچوایا جاندا اے
ایبخ جشن منایا جاندا اے

دل سا تجھ نہ دئیے تے منسا کی
بستی وِچ ظلم دی وسنا کی
حال اپنا کسے نوں دسنا کی
چُپ رہناں ای تقدیراں نیں
ایہہ گھنگرو نئیں زنجیراں نیں

دھی کمی دی

دھی کمی دی

وڈے گھر وچ نبتیاں کردی

بجھ پیندی ہو کے سبھسر دی

نہ اسے جیندی نہ اسے مردی

بڈھے خان دا حقہ

دن وچ سو سو واری تازہ کردی

خان دا پتر

بیٹھک دے وچ ہاسے پانے

بانہہ پھڑ لیندا اینویں سیدا اینویں کھیندا

کی دساں اوہ کی کی کہندا

ادھی راتیں چھوٹی بی بی کہندی

اٹھ تکیے ول چلیئے

جے کمی نے پنڈ وچ رہنا

فیر ایہہ سب کجھ کرنا پینا

ڈھول سپاہی

اکو کوٹھا اوہ وی چووے

ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ ردوے

دکھیا جاگے قسمت سووے

پیار نشانی سینے لا کے

یاراں دے دروازے اتے

وہنی بن کے آن کھلووے

اج نوڑی آیا نہ ماہی

دل دا جانی ڈھول سپاہی

رات کلینی

دنیا بھر دے کالے چِٹّے چور لُٹیرے
سوچیں پے گئے
کی ہووے گا رات جے مُک گئی
جے دھرتی دے کامیاں اَگّے
گردن جھک گئی
رات نوں روکو
روشنیاں دے ہڑ دے اَگّے
اُچیاں اُچیاں کنداں چِکّو
رات نوں روکو!

ہڑ دی گونج تے گھوکر سُن کے
تاجاں تے تختاں دی دُنیا کنب اُٹھی اے
اک منتھی اے
جدوں اینہاں دی لُٹ کھسٹ نوں خطرہ پیندا
رب رسول نوں خطرے دے وِچ پاؤندے نے
رب رسول دے حکم دے نال اے رین نئیں لگّے
خونی قاتل چور لُٹیرے کالے بگّے
جالب بھانویں لکھ اکٹھے ہو ہو بہیون
نئیں ہُن رہنی
رات کلینی

❋

شہنشاہی دا جشن مناؤ آیا اے فرمان
دیکھو ہُن وی صدیاں پچھے ایتھے دا انسان

مر جاندا اے جے میرے ہتھوں جاندی اِک وی جان
ایہہ جیوندے اُدھ موئے کر کے میرا پاکستان

اوہو پنجرا اوہو ای میں اوہو ای صیاد
اوہو پہرے ہنجواں اُتے سہمی اے فریاد

ضبط اے ہُن تک اِک شعراں وِچ لکھی سی رُوداد
انگریزاں نوں کڈھ کے وی میں ہویا نئیں آزاد

❋

کُڑے

نہ جا امریکہ نال کُڑے
ایہہ گل نہ دیویں ٹال کُڑے
ایہنے قتل آزادی نوں کیتا
ایہنے ایس دھرتی دا لہو پیتا
ایہنے کٹوایا بنگال کُڑے
نہ جا امریکہ نال کُڑے

ایہہ رُوس دے نال لڑوندا اے
اینویں لوکاں نوں مروّوندا اے
سانوں تیرا بڑا خیال کُڑے
نہ جا امریکہ نال کُڑے

گل ٹھیک ای کہندا ساقی دِی
کِتے چلا نہ جاوے باقی دِی!
کر رکھی دیس سنبھال کُڑے
نہ جا امریکہ نال کُڑے

❋

جام ساقی

گل سُن چپنا

گل سُن چپنا
راج لیا اپنا
وڈیاں وڈیریاں دا
ظالماں لٹیریاں دا
چھڈ ناں جپنا
گل سُن چپنا!
راج لیا اپنا

سراں دِیاں پوتیاں نے
پوتیاں پڑوتیاں نے
رنگیناں دے طوطیاں نے
کجھ تینوں دِتا دی
اینویں پیا ٹپنا
گل سُن چپنا
راج لیا اپنا
بندے نئیں اے پیار دے
اینویں تینوں چار دے
جھوٹ پئے مارے
ہوش کر پاگلا
چل پا کھپنا
گل سُن چپنا
راج لیا اپنا

گورے چِٹے صاباں کولوں
کالیاں نواباں کولوں
بچ ایہناں عذاباں کولوں
نئیں تاں تینوں نِدناں
پوے گا کلپنا
گل سُن چپنا
راج لیا اپنا

❋

ماں بولی

پُتّراں تیری چادر لائی
ہور کسے دا دوش نہ مائی

غیراں کر دِتی او اگ بالی
سینے ہو گئے پیار توں خالی

پُتّراں نُوں توں لگیں گالی
تینوں بولن توں شرماون

غیراں ایسی وا وگائی
پُتّراں تیری چادر لائی

ایہناں کول زمیناں وی نے
ایہناں ہتھ سنگیناں وی نے

دولت بینک مشیناں وی نے
ناں ایہہ تیرے ناں ایہہ میرے

ایہہ لوکی یُوسف دے بھائی
پُتّراں تیری چادر لائی
ہور کسے دا دوش نہ مائی

کدی کہندے پنج بزاراں وچ
کدی چھپندے رہئے دیواراں وچ
رہی شرم نہ رانجھن یاراں وچ
ہوئیاں بے بس لکھاں ہیراں نیں
ایہہ گھنگرو نیں زنجیراں نیں

مذہباں دے جھگڑے جھیڑے وچ کی رکھیا اے
اساں تے جام محبت والا پی رکھیا اے
پی لیندے نے کھا لیندے نے سو لیندے نے
یاراں خود نُوں وطنوں دور سُکھی رکھیا اے

مُنڈیا

چپ کر منڈیا نہ منگ رونیاں

کھائیں گا زمانے ہتھوں نیں تے سوٹیاں

دڑ وٹ کے توں کٹ ایتھے دِن چار

صدیاں توں بھکھے لوکی کھاندے آئے مار

اک مکی چک لے دوسری تیار

دِلاں وِچ جنہاں دے محبتاں دا نور

جان ٹھکرائے بنا کیتیاں قصور

رہن سکھی واجداں ولیکیا دے یار

صدیاں توں بھکھے لوکی کھاندے آئے مار

میاں عبدالخالق

دردمنداں دا دردی سی اوہ مُخلص یار سی یاراں دا

اوہدے تکھے بولاں اگے کم رہسی کیہہ تلواراں دا

سوچ سی اوہدی سُورج ورگی منزل امن آزادی سی

زخمی دِل ہندیاں ہویاں سی جیہڑا پھُل بہاراں دا

رہندی دُنیا توڑی رہنا اِس دھرتی تے اوہدا ناں

دِل سی اوہدا شیشے ورگا خالق سی دیواراں دا

ایہہ دُکھ ساری عمر نئیں بھلنا زخم کدی ایہہ جانا نئیں

ایناں سوہنا سُچا بندہ صید ہویا مکاراں دا

وچھڑے دل وی مل سکدے نے

دل دی کالک

ہنجواں نال ای دھل سکدی اے

زخم جگر دے دھو آئیں

ہنجواں نال ای سل سکدے نے

وچھڑے دل وی مل سکدے نے

رو آئیں

نفرت دی اگ

ہنجواں نال ای بجھ سکدی اے

اکھیاں دے وچ ہنجو بھر کے پیار دی ٹھنڈک

بو آئیں

دل دی کالک

ہنجواں نال ای دھل سکدی اے

دھو آئیں
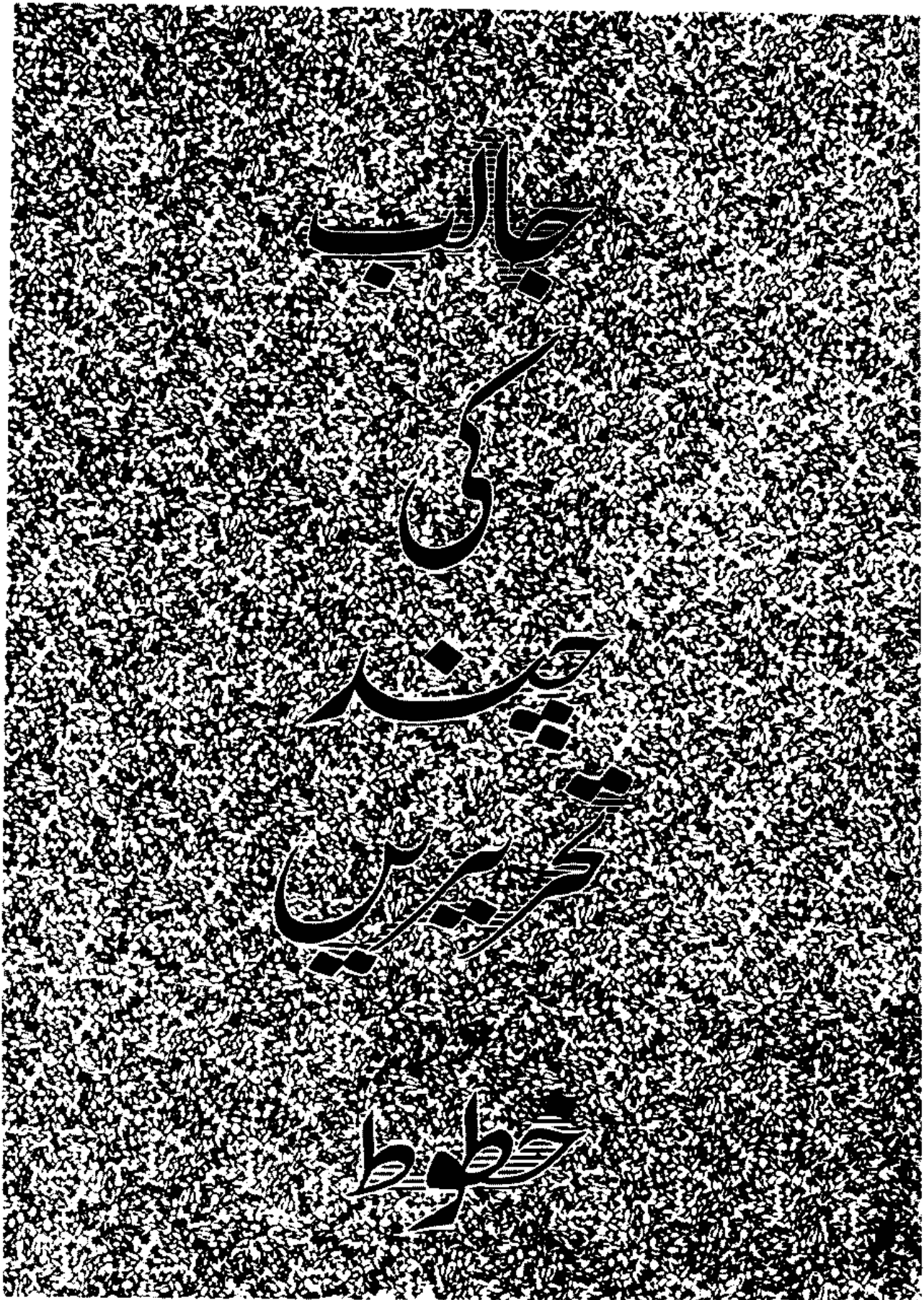
جالب
کی
چند
تحریریں
خطوط

بخطِ جالبؔ

اور سب بھول گئے حرفِ صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا

لاکھ کہتے رہیں ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا
ہم نے سیکھا نہیں پیارے بہ اجازت لکھنا

نہ صلے کی نہ ستائش کی تمنا ہم کو
حق میں لوگوں کے ہماری تو ہے عادت لکھنا

ہم نے جو بھول کے بھی شہ کا قصیدہ نہ لکھا
شاید آیا اسی خوبی کی بدولت لکھنا

اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کیا ہوگی
پڑھ کے ناخوش ہیں مرا صاحبِ ثروت لکھنا

دہر کے غم سے ہوا ربط تو ہم بھول گئے
سرو قامت کی جوانی کو قیامت لکھنا

کچھ بھی کہتے ہیں کہیں شہ کے مصاحب جالبؔ
رنگ رکھنا یہی اپنا اسی صورت لکھنا

حبیب جالب
لندن ۱۰ر جون ۱۹۸۶ء

زیرِ نظر کلیات برگِ آوارہ ' سرِ مقتل' عہدِ ستم ' ذکر بہتے خون کا' گوشہ میں قفس کے' گنبدِ بے در کے کلام پر مشتمل ہے۔ سرِ مقتل' ذکر بہتے خون کا اور گنبدِ بے در ضبط شدہ کتابیں ہیں۔ ان تین ضبط شدہ کتابوں کا انتخاب "حرفِ حق" کے نام سے مکتبۂ دانیال کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کلیات کے شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے عزیزی ہمایوں گوہر کے ذہن میں آیا۔ انہی کے زیرِ اہتمام یہ کلیات طبع ہو کر آپ کے سامنے ہے۔

یہ کلیات کیسی ہے' کیسی چھپی ہے' اس کے بارے میں قارئین کی رائے ہی زیادہ مستند سمجھی جائے گی۔

برگِ آوارہ دھیمے لہجے کی شاعری ہے جس میں چھوٹے ہوئے دیاروں بچھڑے ہوئے یاروں کی یادیں بکھری پڑی ہیں' جگہ جگہ عدم تحفظ کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ بعد میں آنے والی کتابوں میں دھیما لہجہ بلند آہنگ ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہوتا کہ

ایک منظم منصوبے کے تحت وطن عزیز کو خوفناک آمریت کے شکنجے میں جکڑا جا رہا تھا جتنا حبس بڑھتا گیا لہجہ اُتنا ہی تند و تیز ہوتا گیا۔ اسی لہجے کی وجہ سے میں کئی بار پس دیوارِ زنداں گیا اور زنداں سے ایک شعری مجموعہ لے آیا۔

ایک مدت سے جی چاہتا ہے کہ تفصیل سے ان شعراء کے بارے میں لکھا جائے جو ازل سے رجعت پسند عوام دشمن برسرِ اقتدار طبقے سے نبرد آزما رہے ہیں۔ مثلاً قرۃ العین طاہرہ، منصور حلاج، ابوالقاسم لاہوتی، ایران میں قاچاری اور پہلوی دور کے شعراء جن کے جسم میں موم بتیاں گاڑی گئیں، زندانوں میں ڈالے گئے اور وہ شعر پڑھتے رہے:

یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار
رقص چنیں میانۂ میدانم آرزو است!
اے خوش آں عاشقِ سرمست کہ در پائے حبیب
سر و دستار نداند کہ کدام اندازد!

سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے سلسلے کا شاعر ہوں، مولانا حسرت موہانی اور مخدوم محی الدین کا بھی پیرو کار ہوں۔ بچپن سے بزرگوں سے سنتا چلا آیا ہوں کہ اے خدا ایمان کے ساتھ قبر میں اُتار۔ اس دعا کا مطلب اب سمجھ میں آیا کہ مرتے دم تک لوگوں سے پیمان وفا باندھے رکھنے والے شاعر کو ہی عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔

چند خطوط

منو بھائی، افضل صدیقی کے نام

پیارے منو بھائی ! میں لندن بخیریت تو نہیں پہنچا لیکن پہنچ گیا ہوں ....

جان چکے ہوگے کہ مجھے کراچی ایئرپورٹ پر روک لیا گیا تھا۔ امیگریشن والے پکڑ کر اپنے دفتر لے گئے۔ حبس بے جا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں اس حالت میں دل و دماغ کے ساتھ ہمیشہ سے جو ہوتا آیا ہے وہی کچھ ہوا۔ بتایا گیا کہ تم بلیک لسٹ ہو اس لئے باہر نہیں جاسکتے۔ میں نے کہا عدالت عالیہ مجھے باہر جانے کی اجازت دے چکی ہے۔ ڈپٹی سیکریٹری کہہ چکے ہیں کہ حکومت اگر جالب کو باہر جانے کی اجازت نہ دیتی تو پاسپورٹ بھی نہ دیا جاتا اور مجھے روک کر تم توہین عدالت عالیہ کے مرتکب ہو رہے ہو مگر یہ شاید ان کے لئے بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔

میں نے یہ بھی کہا کہ تم لوگ اپنی دانست میں حب الوطنی کا ثبوت دے رہے ہو مجھے عدالت کی اجازت کے باوجود ملک سے باہر جانے سے روک دینے کی خبر سے ملک کی عزت و آبرو میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ میرے تمہارے صحافی دوست عبدالحمید چھاپڑا نے انہیں کہا کہ بے شک اسلام آباد سے اس امر کی تصدیق کرلو مگر وہ اپنی حب الوطنی پر ڈٹے رہے اور ہر بات سنی ان سنی کردی۔ دو گھنٹے بٹھائے رکھنے کے بعد کہا کہ ہم تمہیں ملک سے باہر ہرگز نہیں جانے دیں گے لیکن دفتر سے جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔

یہ زخم دل پر اٹھائے ایئرپورٹ سے باہر آیا تو میرے بیمار دل کی حالت غیر تھی۔ چھاپڑا نے کہا کہ آج رات کے کسی حصہ میں داخل ہونا پڑے گا وہ حوصلہ دیتا رہا کہ دو چار دن میں اجازت مل جائے گی۔ میں نے کہا میں اب باہر جانا ہی نہیں چاہتا وہ مجھے میرے بھائی کے گھر اتار گیا۔ رات کانٹوں پر گزاری صبح مجاہد بریلوی کے دفتر گیا کہ بتادوں واپس لاہور جارہا ہوں اور عدالت عالیہ کو بتاؤں گا کہ عطا کردہ اجازت میرے لئے کافی نہیں ہے۔ اتنے میں چھاپڑا نے اطلاع دی کہ اسلام آباد سے اجازت نامہ آگیا ہے مجھے اعتبار نہیں آیا اور دوبارہ

زخم کھانے کی ہمت بھی نہیں تھی ۔ کہا میں نہیں جاؤں گا ..... مگر اس نے سمجھا بجھا کر زبردستی ترکش ایئر لائنز کے طیارے میں بٹھا دیا ۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں جارہا ہوں ۔ جب جہاز رن وے سے اٹھا تو یقین آیا کہ اب کوئی کان سے پکڑکر جہاز سے باہر نہیں گھسیٹے گا ۔

استنبول میں جہاز دو گھنٹے رکا ۔ استنبول کی عمارتوں کو میں نے دیکھا ۔ مناظر بہت اچھے تھے جہاز دوبارہ اڑا تو ایک خوبصورت ایئرہوسٹس نے میرے قریب جھک کر مسکراتے ہوئے پوچھا " پینے کے لئے کیا لوگے ؟ " میں اس کی مسکراتی ہوئی دعوت کو مسکراتے ہوئے قبول کیا اور لندن تک تین شوگر فری کوکاکولا پی گیا ۔

بہت خوفزدہ کیاگیا تھا کہ لندن میں امیگریشن والے بہت سے سوالات پوچھتے ہیں ۔ میں اپنے ساتھ کچھ انگریزی اخبارات لے گیا تھا کہ ثابت کرسکوں کہ میں خاصا مشہور آدمی ہوں انگریزی نہ جاننے کے سبب میں نے سوالات کا کوئی جواب نہ دیا لیکن ایک سوال میری سمجھ میں آگیا " تمہارے کتنے بچے ہیں ؟ " ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ " آٹھ بچوں کا باپ ہوں " انہوں نے مجھے اجازت دیدی ...... میں یہ مطلب سمجھا کہ جس کے آٹھ بچے ہوں وہ یہاں نہیں رہ سکتا ' شادی نہیں کرسکتا اور پھر میری عمر اٹھاون برس کی نہ صرف ہے بلکہ نظر بھی آتی ہے ۔

میرے سابق حکمرانوں کو کیا پتہ کہ اپنے وطن میں میرے آٹھ بچے ہی نہیں ہیں ساڑھے آٹھ کروڑ دوست ' عزیز اور پیارے بھی ہیں اور انہیں میں کبھی نہیں چھوڑسکتا ۔ کسی خوف' کسی خطرے اور کسی لالچ میں نہیں چھوڑسکتا اور پھر میرا وجود بھی میرے وطن کی مٹی کی امانت ہے اور میں بھی وہی خاک اوڑھ کر سونا چاہتا ہوں جو فیض احمد فیض ' خواجہ خورشید انور اور میجر اسحاق محمد اوڑھ کر سوئے ہوئے ہیں ۔

لندن ایئرپورٹ پر لیڈی صبغت اللہ قادری اور کچھ دوست لینے آئے ہوئے تھے ۔ یہ خاتون جتنی اردو جانتی ہیں میں اتنی انگریزی نہیں سمجھتا ۔ ان کے گھر پہنچا ۔ بیرسٹر قادری معروف ہونے کے علاوہ مصروف بھی ہیں انہوں نے جلدی جلدی اپنے موکلوں سے اقبال جرم کرا کے فراغت حاصل کی اور میرے پوچھنے پربتایا کہ اقبال جرم سے ان کے موکلوں کو فائدہ پہنچے گا ..... (حیرت !!)

لندن میں پارلیمنٹ کی عمارت اور کراموبل کا مجسمہ دیکھا وہاں سے سعید انجم کے پاس ناروے پہنچا ان کے بقول ناروے میں پاکستانیوں کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع ہوا یہاں

اسی ہفتے انتخابات ہوئے اور سب سے بڑی پارٹی اپوزیشن میں بیٹھ گئی ہے ..... (حیرت !!!)
ناروے کی پارلیمنٹ کے دونوں طرف شیروں کے مجسمے ہیں جیسے کبھی لاہور کے شیرانوالہ گیٹ پر ہوتے تھے ۔ سعید انجم اب سویڈن لے آیا ہے یہاں کے انتخابات جیت کر سوشل ڈیموکریٹ کمیونسٹ پارٹی کے تعاون سے حکومت قائم کرچکے ہیں یہاں کے پاکستانی اچھا کھاتے ' اچھا پہنتے اور اچھے گھروں میں رہتے ہیں ۔ انہوں نے بتایا کہ بنیادی ضرورتیں پوری کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے میں نے کہا دیار غیر میں تم پاکستانیوں کو جو تحفظات حاصل ہیں ایک روز تمام پاکستانیوں کو پاکستان کے اندر حاصل ہوں گے ۔ ناروے اور سویڈن کے باشندوں نے پہاڑوں اور جزیروں کو آباد کردیا ہے ہرچند کہ یہ دنیا کے غریب ملکوں کی دولت ہے پھر بھی انسانی محنت قابل تحسین ہے ۔ یہاں کام کرنے کے قابل لوگ گھروں میں نہیں رہتے ۔ ہاتھ اور کام کے درمیان فاصلہ نہیں ہے ۔ محنت اور انسان کے درمیان فاصلہ نہیں ہے ۔ مناظر حسین ہیں لوگ خوش ہیں ' قومیں ترقی کررہی ہیں مگر یہاں کے مناظر کا حسن اور یہاں کی ترقی میرے کس کام کی ....
منو بھائی ! میں تو اپنے ملک کا حسن اور اپنے لوگوں کی ترقی چاہتا ہوں ...

تمہارا حبیب جالب
۲۰ ستمبر ۸۵ء سٹاک ہولم (سویڈن)

لندن ۷ ر مئی ۱۹۸۶ء

پیارے ساتھی افضل !

اب کے میں واقعتاً بخیر و عافیت لندن پہنچ گیا ہوں ۔ کراچی امیگریشن والوں سے میں نے ایک گھنٹہ پہلے ہی رابطہ کرلیا تھا ۔ کیونکہ ہوائی جہاز میں سامان چلا جاتا ہے تو اسے اتارنے میں بڑی دیر لگتی ہے بہت دیر تک جس بے جامیں رہنا پڑتا ہے ' عملے کے آدمی نے اپنے افسر سے پوچھا ' اور اس کے افسر نے مجھے تنگ نہ کرنے کا مژدہ سنایا ' یوں میں ہوائی جہاز میں بیٹھ گیا اور لندن پہنچ گیا ۔ اب لندن میں داخل ہونے کا مسئلہ تھا ۔ داخلہ کا فارم میرے مہربان ہمسفروں نے بھردیا ۔ امیگریشن آفیسر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ اپنے دوست کے ہاں قیام کریں گے ۔ میں نے اس سے کہا کہ انگلستان میں میرے بے شمار دوست ہیں اور میں بہت مشہور شاعر ہوں وہ میری یہ بات سن کر شاید تصدیق کیلئے اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس گیا ۔ اور مسکراتا ہوا واپس آیا ۔ اس کی مسکراہٹ سے میری چہرے پر بھی رونق آئی ۔

مزید رونق چھ مہینے کا ویزا دیکھ کر آئی - اب کے میں بغیر اطلاع کے لندن آیا تھا اسلئے کوئی میرے استقبال کے لئے نہیں آیا میں جلدی جلدی اندر سے باہر آیا - اور ایک دوست کی دکان کی طرف چل پڑا - چلو اس کا نام بھی لکھ دیتا ہوں شیر شاہ قریشی موصوف آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں - اور بادہ فروش ہیں

چلے گی اور چلے گی دکان بادہ فروش
دکان بک کے بکیگا مکان بادہ فروش

یہ شعر نجانے کس کا ہے ' قریشی کی صورت حال مندرجہ بالا شعر سے مختلف ہے قریشی صاحب توفیق بھی ہے اور صاحب دل بھی لندن میں کسی کا مہمان نواز ہونا بہت بڑا واقعہ ہے لندن میں تو لوگ آنے والے سے پوچھتے ہیں کہاں ٹھہرے ہیں اور کب جانا ہے ؟ آنے والا جب یہ جواب دیتا ہے کہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوں اور پندرہ بیس دن میں جارہا ہوں - تو لندنی کو بہت اطمینان ہوتا ہے - مگر میں تو اپنے بہت پیارے دوست نیر حسن ڈار کے ہاں مقیم ہوں جو ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں اور فیصل آباد کے رہنے والے ہیں ان کے بزرگوں اور عزیزوں کے ساتھ میرے دیرینہ مراسم ہیں ' میں بھی تو لائل پور فیصل آباد میں کچھ مدت رہا ہوں

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

یہ غزل اور " برگ آوارہ " کا بیشتر حصہ فیصل آباد میں ہی لکھا گیا - نیر حسن ڈار اور اس کے بھائی میری شاعری سن سن کر ہی جوان ہوئے ہیں دوست امن اخبار دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس میں آپ نے جس محبت سے میری خبر شائع کی ہے میں آپ کا بہت ممنون ہوں ' آپ نے جمہوریت کی بحالی کیلئے بے مثال کام کیا ہے - آپ ایک بے لوث بہادر ' صحافی ہیں اور بہت اچھے شاعر ہیں میں مسلسل قید و بند کی وجہ سے آپ سے معمر لگتا ہوں مگر آپ میرے بزرگ دوست ہیں ' آمروں کے حق میں ایڈیٹوریل لکھنے والے صحافیوں اور قصیدے پڑھنے والے شاعروں سے آپ کا کیا تعلق میں آپ کی عظمت کا معترف ہوں زمانہ آپ کا معترف ہے چند موقع پرستوں سے گھبرانے والے نہ آپ ہیں نہ میں

جھوٹی خبریں گھڑنے والے جھوٹے شعر سنانے والے
لوگو! صبر کہ اپنے کئے کی جلد سزا ہیں پانے والے

آپ کا دیرینہ نیاز مند حبیب جالب

لندن ۔ ۲۴ر مئی ۱۹۸۶ء

پیارے ساتھی افضل صدیقی صاحب!

امید ہے آپ اور میرے تمام خیرخواہ دوست بخیر ہوں گے ۔ دو روز پہلے سعیدہ گزدر سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی ۔ آگاہی ہوئی کہ میرا خط آپ کو مل گیا ہے ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے دل و نظر میں میری جگہ ہے ' یوں تو پہلے بھی آپ کی منصف مزاجی کا معترف تھا مزید ہوگیا ۔

کتاب کا نام " حرف سردار " رکھا ہے اور یہ نام مشتاق احمد یوسفی نے دیا ہے .... مشتاق احمد یوسفی کا نام بڑے طنز نگاروں میں شمار ہوتا ہے ۔ انہوں نے ایک بار میرے بارے میں کہا تھا کہ مار تو سڑک پر حبیب جالب کھائے اور عزت و شہرت گھر بیٹھنے والوں کو ملے یہ کیسے ہوسکتا ہے جو مار کھائے گا عزت و شہرت بھی وہی پائے گا ۔ ان میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اپنی عظمت سے لوگوں کو خوفزدہ نہیں کرتے ۔ کرشن چندر میں بھی یہی خوبی تھی ' اس کے پاس پہروں بیٹھنے وہ خودکوبڑا افسانہ نگار لگنے نہیں دیتا تھا ۔ سنتا تھا سناتا نہیں تھا ۔ یہی خوبی مخدوم محی الدین میں تھی بہت سادہ مزاج تھے ' بڑے شاعر تھے ' بڑے آدمی تھے ۔ ہاں ذکر تھا کتاب کا اس کی رونمائی جولائی میں ہوگی ۔ اگلے ہفتے ناروے چلا جاؤں گا ' پھر سویڈن دنیا کے سب سے اونچے مقام پر پہنچ کر غالب کا یہ مطلع پڑھوں گا ....

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ان دنوں پرہیز کی انتہا کر رکھی ہے ' صبح ایک گھنٹہ پیدل چلتا ہوں اور کریلے کا جوس پیتا ہوں ۔ صحت پہلے سے بہتر ہے مکمل صحت اب کہاں ۔ یہ بھی ہے غنیمت کہ چل پھر رہا ہوں ' آج صبح بادل چھائے ہوئے تھے ' ہوا سے ہرے ہرے پیڑ جھوم رہے تھے ۔ بہت عرصہ کے بعد یعنی مدت کے بعد مناظر کو بغور دیکھا جی خوش ہوا ۔ ناصر کاظمی کا شعر یاد آیا

منہ اندھیرے ذرا اٹھ کر دیکھو
کیا ترو تازہ ہوا ہوتی ہے

مگر جوش صاحب کا وہ شعر بہت ہی خوب ہے آپ کو یاد ہوگا کہ

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ایک مطلع دیکھئے اگر کہیں گے تو غزل لکھوں گا

ہجوم دیکھ کر رستہ نہیں بدلتے ہم
کسی کے ڈر سے تقاضا نہیں بدلتے ہم

ان دنوں احمد فراز کی الوداعی محفلوں سے لطف اندوز ہورہا ہوں ۔ انہوں نے اپنی ایک بڑی الوداعی محفل میں میرا یوں ذکر کیا کہ آمریت کے اس کٹھن سفر میں حبیب جالب نے بھی میرا ساتھ دیا ۔ چونکہ فیض صاحب کے بعد فراز کو بڑا شاعر کہا اور مانا جاتا ہے اس لئے یہ جملہ تاریخی ہوگیا ہے ۔

مجاہد بریلوی کو میرا سلام کہہ دیجئے گا اور جسے چاہے سلام کہہ دیجئے گا ۔ یہی دو ایک دوست ہیں مجاہد بریلوی ' چھاپڑا ' مشتاق گزدر ہمارے ساتھ چلتے ہیں ۔ سوائے زیاں کے اور کیا ہے ۔ کون چلے ہمارے ساتھ کہا جاتا ہے سچ بولنے کے لئے لابنگ کی جائے بھئی ہمارے پاس اتنے وسائل کہاں ' ہم ٹھہرے مولانا حسرت موہانی کے مقلد ۔

سنا ہے کہ کراچی کو گرمی نے گھیر رکھا ہے ۔ اچھا خدا کراچی کو ہر بلا سے نجات دلائے (آمین)

آپ کا
حبیب جالب

پریم پال اشک

حبیب جالب بحیثیت فلمی نغمہ نگار

اس حقیقت کو عیاں کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے کہ ایک فنکار ہمیشہ اپنے دور کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی تحریکات کی عکاسی ہر شاعر اپنے منفرد انداز سے کرتا رہا ہے۔ اس برصغیر کی ایک قدآور ادبی شخصیت حبیب جالب نے پاکستان ہی کا نہیں بلکہ پورے برصغیر کی سیاسی اور سماجی تحریکات کا شہر آشوب نہایت بانکے، تیکھے اور تمکنت آمیز انداز سے پیش کیا ہے۔ اس دور میں ہونے والی سماجی اور سیاسی لوٹ کھسوٹ کا مرثیہ انہوں نے نہایت غم و غصے کے ساتھ لکھا ہے۔ اسی لئے احتجاجی شاعری کے میدان میں اُن کا شمار صفِ اول کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ خواہ ان کا اُردو کلام ہو یا پنجابی، فلمی ہو یا غیر فلمی، ہر سمت ان کی صدائے احتجاج کی گونج اور دھمک نہایت شدت کے ساتھ سنی گئی ہے۔

جس شخص نے اپنی زندگی کے کئی برس قید و بند کی صعوبتوں میں گزارے ہوں، جس نے ہمیشہ جُھک جانے کی نسبت ٹوٹ جانے کو فوقیت دی ہو، جس نے جنرل ایوب خاں، ذوالفقار علی بھٹو، یحییٰ خاں، اور ضیا الحق جیسے ————— سربراہوں سے سرِ عام سینہ سپر ہو کر نبرد آزمائی کی ہو اور اس کے باوجود اپنی خو نہ چھوڑی ہو۔ اور مجاہدانہ انداز سے زندگی گزاری ہو اور اپنی شان تمکنت کو جس نے زیست کا حاصل جانا ہو، اُسے اُردو دنیا کیسے فراموش کر سکتی ہے۔

جہاں تک فلمی نغموں کا تعلق ہے۔ اس کی صورت ادبی شاعری سے قدرے مختلف ہوا کرتی ہے یوں تو فلمی نغمے عموماً فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار اور فلم کی کہانی کے موڈ، مزاج اور سچویشن کے

مطابق تحریر کئے جاتے ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ ہر نغمہ فلم کی کہانی کی ضرورت کو پورا کر ہی دے۔ یا موسیقار اسے دُھن عطا کر ہی دے۔ اس میں فلم کی کہانی کی سچویشن کے ساتھ ساتھ فلم ساز، ہدایت کار اور خصوصاً موسیقار کی پسند کو بھی دخل ہوتا ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

حبیب جالب نے فلمی شاعری میں بھی اپنے تیکھے تیور برقرار رکھے۔

حبیب جالب کے فلمی نغمے دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہاں بھی مصلحت اندیشی کا ثبوت نہیں دیا اور کہانی کے مزاج اور اپنی خو کو اہمیت اور فوقیت دی۔ اُن کے فلمی نغموں میں بھی ادب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ احتجاجانہ اور مجاہدانہ انداز بھی عود کر آتا ہے۔ اُن کے فلمی گیت خواہ پنجابی ہوں یا اُردو سب میں یہی کیفیت اُبھرتی ہے اگرچہ اُن کے یہاں خالص گیت کا انداز نہیں ملتا۔ نہ ہی ہلکے پھلکے سبک نرم اور کومل الفاظ اور تراکیب کی ہلکی ہلکی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اور نہ ہی چونکا دینے والے مکھڑے ملتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ اُردو اور ہندی کے موڈ اور مزاج میں اختلاف ہے۔ چونکہ گیت بنیادی طور پر ہندی کی صنفِ سخن ہے اور پاکستانی اُردو پر فارسی اور عربی غالب ہے، اسی لئے پاکستانی شاعری میں نغمے ہی کو اہمیت اور فوقیت حاصل ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حبیب جالب کے یہاں گیت کی روایت کم ملتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے فلمی نغمے توجہ طلب ہیں۔

یوں تو حبیب جالب نے حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ لیکن یہاں بھی انہوں نے اپنے کردار کی آن برقرار رکھی اور خودداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اداکار علاؤالدین جو اپنے دَور کا ایک لاجواب اداکار، بڑا انسان دوست اور قدردان انسان تھا وہ جالب کو فلم انڈسٹری میں لانا چاہتا تھا۔ تا کہ وہ فلم انڈسٹری کے لئے لکھے اور اُن کے مالی حالات بھی ٹھیک ہو جائیں لہٰذا وہ کوشش کر کے انہیں لاہور لے آیا اپنے پاس ٹھہرایا۔ جالب میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کبھی بھی اس پر حرف نہ آنے دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہی دنوں اس وقت کے مشہور ہدایت کار جعفر شاہ بخاری اپنی گاڑی میں آئے اور جالب میکلوڈ روڈ لاہور میں ایک دوکان سے پان خرید رہے تھے کہ گاڑی تھوڑی دور آکر رُکی اور جعفری صاحب نے اپنا آدمی بھیجا کہ جاکر اُنہیں بلا لائے تاکہ اس سے فلم کے گانے لکھوائے جائیں۔ جالبؔ اس بات پر بُرا مان گئے کہ کوئی کار میں بیٹھ کر اُسے اپنے پاس بلائے۔ اُنہوں نے اُس شخص سے کہا کہ جاکر کہہ دو کہ میں نہیں آتا۔ تب بخاری صاحب گاڑی سے اُتر کر اُن کے پاس خود آئے تو جالبؔ نے کہا "بخاری صاحب، غریبوں کی عزت امیروں سے

زیادہ نازک ہوتی ہے۔"

انہوں نے لاتعداد فلمی نغمے تحریر کئے لیکن ان کی مختلف ۱۲۱ اہم فلموں میں ۲۰ اُردو اور چار پنجابی فلمیں ہیں۔ ان میں فلم جوکر، ماں بہو اور بیٹی، ، موسیقار، بھروسہ، العاصفہ، پرائی آگ، گھر پیارا گھر، سیما، دو راستے، ناگ منی، زرقا، خاموش رہو، ہم ایک ہیں، کون کسی کا، ساز و آواز، یہ امن، قیدی، چوروں کی بارات، سماج، موت کا نشہ، حسینہ، چار سو بیس (پنجابی) زخمی عورت (پنجابی) رنگیلے جاسوس (پنجابی) سرفروش (پنجابی) شامل ہیں۔ ان کے موسیقار اور گلوکار مصلح الدین حسن لطیف خورشید انور، رشید عطرے، اے۔ حمید، نثار بزمی، ماسٹر عنایت حسین، خلیل احمد، منظور اشرف، مشتاق علی، وجاہت عطرے، مہدی حسن، نورجہاں، احمد رشدی، سلیم رضا، منیر حسین، مجیب عالم، ناہید نیازی، منہاز، نسیم بیگم، آئیرن پروین، غلام عباس، اے منیر کے نام فخر سے لئے جاسکتے ہیں۔ ان کے بیشتر فلمی نغمے گانے کا شرف برصغیر کی ممتاز گلوکارہ اور عہد ساز فلمی شخصیت نورجہاں کو حاصل ہے۔

حبیب جالب کی فلمی شاعری کا جائزہ لینے سے قبل برصغیر کی دو عظیم گلوکاراؤں نورجہاں اور لتا منگیشکر پر اُن کی دو نظموں کا جائزہ لے لینا بہت ضروری ہے۔ یوں تو اُنہوں نے اُن کے علاوہ فلمی دنیا کی ایک اور عظیم المرتبت شخصیت ساحر لدھیانوی پر بھی ایک نظم لکھی تھی۔ لیکن چونکہ ساحر کی شخصیت میں فلمی رچاؤ کم اور ادبی رنگ زیادہ ہے لہٰذا ان پر تحریر کردہ نظم کا تذکرہ یہاں بر محل نہ ہوگا۔ البتہ نورجہاں اور لتا پر تحریر کردہ نظمیں خصوصی طور پر توجہ کی طالب ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ نورجہاں کو انہوں نے دیکھا سنا اور اُن کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس لئے ان کی یہ نظم محض روایتی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی احساس اُن کے اس شعر سے بھی ہو جاتا ہے:-

دیارِ دیدۂ دِل میں ہے روشنی تجھ سے
ہے چہرہ چاند، مدھر چاندنی تری آواز
ہو ناز کیوں نہ مقدر پہ اپنے نورجہاں
تجھے قریب سے دیکھا سُنی تیری آواز

ان کی اس نظم کا مطلع پوری نظم کا حاصل ہے۔ جبکہ وہ آواز کو امید کی لَو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہجومِ یاس میں جوت آس کی تری آواز
ہم اہلِ درد کی ہے زندگی تری آواز

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ایک سچا فنکار مذہب وملت اور ملکی حدود کی قید وبند سے ہمیشہ آزاد ہوا کرتا ہے۔ یہی کیفیت حبیب جالبؔ کی ہے۔ انہوں نے حیدرآباد جیل میں لتا پر جو نظم لکھی اسے ایک فنکار کا کسی دوسرے فنکار کو حقیقی معنیٰ میں خراج عقیدت تصور کیا جانا چاہیئے۔ یہ نظم پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لتا کی آواز کا جادو حبیب جالب کے سر پر چڑھ کر یوں بولتا ہے۔

تیری اگر آواز نہ ہوتی بجھ جاتی جیون کی جیوتی

پوری نظم سے یوں لگتا ہے گویا وہ جیل میں ان کے نغمے سنتے رہے ہیں اسی لئے لکھتے ہیں۔

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے بیتے ہیں دن رین ہمارے

ایک گلوکار کو اس سے بہتر اور کیا خراج عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ کہتے ہیں۔

کیا کیا تو نے گیت ہیں گائے سر جب لاگے من جھک جائے

حبیب جالب نے لتا کے اندر میرا کی روح رچی بسی محسوس کی ہے۔ تبھی تو وہ اس شعر میں کہتے ہیں۔

میرا تجھ میں آن بسی ہے انگ وہی ہے رنگ وہی ہے

لتا کی آواز کا امرت رس کانوں میں یوں گھلتا ہے جیسے کسی نے کان میں چپکے سے قم باذن اللہ بول دیا ہو، کم وبیش یہی کیفیت حبیب جالب پر طاری ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

تجھ کو سن کر جی اٹھتے ہیں ہم جیسے دکھ درد کے مارے

بقول جگر کہنے کا مقصد یہ ہے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو روح سنے اور روح سنائے

حبیب جالبؔ نے اپنے فلمی نغموں میں بھی ایک غازی کی طرح روایت سے بغاوت کا علم بلند کیا ہے۔ وہ صحیح معنیٰ میں عوامی شاعر کی صورت میں آفاقی نوعیت کا پیغام دیتے ہیں فلم 'العاصفہ' کا یہ نغمہ ہمارے اس نظریئے کی تائید کرتا ہے۔

جاگو کہ جاگنے سے تقدیر جاگتی ہے
اُٹھو تمہاری منزل تم کو پکارتی ہے
باطل سے دب کے رہنا توہینِ زندگی ہے
اب دل میں آگ بھر دو، اب ختم رات کر دو
اے صبح کے نشانو
الفتح کے جوانو

حبیب جالب اپنے چمن کو جلتا نہیں دیکھ سکتے۔ اسی لئے وہ لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد کا تماشا ایک خاموش تماشائی کی طرح کھڑے ہو کر نہیں دیکھ سکتے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں۔

اپنے چمن کو جلتا دیکھوں اور خاموش رہوں آخر کیوں
اس دھرتی پر بہا ہے کتنے انسانوں کا خوں آخر کیوں
ساری زمینوں کو ہیں گھیرے
صدیوں سے خونخوار لٹیرے
عزت دولت میرے وطن کی
لوٹ رہے ہیں چند لٹیرے
کب تک یہ بربادی دیکھوں کب تک ضبط کروں آخر کیوں؟

گردشِ دوران کی چکی میں پسنے اور ظلم و تشدد کے شکار بننے کی وجہ سے حبیب جالب کے یہاں قنوطیت کا عنصر تو ہے ہی اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کی مثالیں یوں تو لاتعداد دی جاسکتی ہیں فلم جوکر کا نغمہ شوقِ آوارگی کا یہ بند ملاحظہ فرمایئے۔ کتنا درد، کتنی ٹیس اور کتنی کسک ہے ان کے لہجے میں فرماتے ہیں۔

یوں ادا ہم نے فرضِ محبت کیا آنسوؤں کو پیا
زخم کھاتا رہا، مسکراتا رہا
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا۔ شوقِ آوارگی

لوگوں کی کم نظری اور فتنہ گری کا شکوہ اور دل کی دولت کے لٹنے کے افسوس کا اظہار وہ اس فلم میں یوں کرتے ہیں۔

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے۔ فتنہ گر لوگ تھے
ہائے کیوں دل کی دولت لٹاتا رہا
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا
شوقِ آوارگی

لیکن اس کے باوجود اُمید اور آس کی ننھی سی کرن بھی ان کے دل میں روشن رہتی ہے۔ اسی لئے وہ رجائیت پسندی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ فلم گھر پیار کا گھر کے نغمے "رات کا سفر" کا یہ بند توجہ طلب ہے۔

ہنسیں گی سہمی ہوئی نگاہیں

چمک اٹھیں گی وفا کی راہیں
ہزار ظالم سہی اندھیرا
سحر بھی لیکن قریب تر ہے
رات کا سفر ہے

اسی طرح فلم ناگ منی میں "میرا ایمان محبت ہے" نغمے میں وہ یوں نغمہ سرا ہیں۔

مسکرا جان بہاراں کہ سویرا ہوگا
ختم صدیوں کے دریچوں کا اندھیرا ہوگا
شب کی تقدیر میں لکھا ہے گزر ہی جانا
راہ سورج کی کہاں روک سکے اہل ستم
میرا ایمان محبت ہے

حبیب جالب روایت سے بغاوت کا درس تو دیتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے عوام کو آزادی کی خاطر کٹ مرنے اور زنجیر پہن کر رقص کرنے کی بھی تحریک فلم زرقا میں یوں دیتے ہیں۔

دیکھ فریاد نہ کر، سر نہ جھکا پاؤں اٹھا
کل کو جو لوگ کریں گے تو ابھی سے کر جا
ناچتے ناچتے آزادی کی خاطر مر جا
منزل عشق میں مر مر کے جیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

اس کے ساتھ ہی وہ فلم موت کا نشہ میں ڈرگ اور نشیلی ادویات کے تاجروں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے کا پیغام یوں دیتے ہیں۔

بیچتے ہیں یہ جو زہر اُن کو بے نشاں کرو
اس خموش کشت وخوں کی ختم داستاں کرو
چہرۂ حیات پر یونہی نکھار آئے گا
بے حسی و بے کسی کا دَور بیت جائے گا
یہ جہاں مسکرائے گا

لیکن اس کے باوجود وہ عوام کو محبت اور اتحاد کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ فلم "ہم ایک ہیں" میں وہ عوام کو جہاں یہ پیغام دیتے ہیں وہاں ستمگروں کو تنبیہ بھی کرتے ہیں۔

یہ رشتے ہیں وہ خون کے
کبھی نہیں جو ٹوٹتے
ستم گروں سے یہ کہو
دکھائیں اُن کو توڑ کے
اُنہیں سے ہیں بندھے ہوئے
امیر کیا غریب کیا
ہم ایک ہیں ۔ ہم ایک ہیں

حبیب زمانے کا ہر ستم ہنس کر برداشت کرتے ہیں۔ اور ان کی ایک چپ میں متعدد طوفان پوشیدہ ہیں ۔جیساکہ اس کا اظہار اُنہوں نے فلم گھر پیارا گھر میں اپنے گیت "جو دکھ ملے ہیں ہنس کے سہے ہیں" میں کیا ہے ۔اسی طرح حبیب جالب شومئے تقدیر کا رونا نہیں روتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان پر ستم آسمان نے نہیں توڑے بلکہ اس کی ذمے دار دنیا ہے۔ فلم سازو آواز میں کہتے ہیں۔

کیوں کہیں یہ ستم آسماں نے کئے
آسماں سے ہمیں کچھ شکایت نہیں
دُکھ ہمیں جو دیئے اس جہاں نے دیئے

ان کی فلم پنجابی ہو یا اُردو وہ اپنے ہر گیت میں عوام کی زبوں حالی، غاصبوں کی لوٹ کھسوٹ اور اخلاقی انحطاط کا تذکرہ ببانگ دہل اس طرح کرتے ہیں۔

فلم چوروں کی بارات میں اُن کا یہ نغمہ دیکھیے۔

میں چور ہوں تو چور چوروں کا ہے یہ جہاں
ہے بات گھاٹے کی ایمانداری یہاں
آجائے گا نگاہ میں کھوئے گا جو زباں
میں چور ہوں تو چور

اسی گیت کا ایک اور بند یوں ہے :۔

رشوت چلا رہا ہے ہر اک کاروبار دیکھ
فائل پہ بن رہی ہے سڑک بار بار دیکھ
خون ہے سب کے منہ کو لگا
چوروں کے اس سماج میں انسانیت کہاں
میں چور ہوں تو چور

اسی طرح پنجابی فلم حسینہ چار سو بیس کا یہ نغمہ بھی توجہ کا طالب ہے۔

بن ٹھگیاں ایس دنیا اندر رہنیاں کون رئیس
دیوتا بن کے ایتھے پھردے بڑے بڑے ابلیس
حسینہ چار سو بیس۔ حسینہ چار سو بیس

یہی نہیں بلکہ حبیب جالب ایک اور پنجابی فلم رنگیلے جاسوس میں اپنے دل کے زخم یوں دکھاتے ہیں۔

پیسے لئی نا کچھ لوکی کی کی کج کردے
لہو دی تھال دگاں وچ زہر پئے بھردے
اللہ کولوں ڈر دے نہ بندے کولوں ڈر دے
پیسے لئی ایہہ جیندے نیئں تے پیسے لئی ایہہ مردے

دین پیسہ ایمان پیسہ
خون پیوے شیطان پیسہ

حبیب جالب کو بھی ایک نئے مسیحا کی تلاش ہے اسی امید میں وہ زندہ ہیں کہ کوئی مسیحا آئے گا جو بے کچلے انسانوں اور سماج کی ستائی ہوئی زخم خوردہ عورتوں کو دکھ کی سولی سے اتار دے گا اور ظلم وستم کی حکومت ختم کردے گا پنجابی فلم زخمی عورت میں وہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

کوئی ایسا مسیحا آوے
دکھ دی سولی تولاوے
بے غیرت گلیاں ڈھاوے
ظلماں دا راج مٹاوے
اک نواں سماج بناوے
جکڑی ہی زنجیراں وچ نار دیکھ لے
صدیاں تو لگا ایہہ بزار دیکھ لے

حبیب جالب کی فلمی غزلوں میں محض تک بندی یا قافیہ پیمائی نہیں ملتی اور نہ ہی ان میں روایتی شاعری کا مزاج پایا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی غزلیں محض کہانی کی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ بلکہ ان میں جہاں پورا ادبی مذاق پایا جاتا ہے، وہاں ان کا سماجی شعور ہر قدم پر بیدار رہتا ہے انکے یہاں غزل کا منفرد انداز اشارے کنائے کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ فلم ماں بہو بیٹا کی غزل کا یہ شعر دیکھئے۔

۱۷

نبھانے آئے تھے جو رسمِ دوستی ہم سے   انہیں کے تیرِ ستم کا یہ دل نشانہ ہے

اسی طرح فلم سماج کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا   جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

انہیں زندگی کی تمام آسودگیاں حاصل ہو جاتیں اگر وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتے لیکن وہ فلم سماج میں فرماتے ہیں۔

بہت مہرباں تھیں وہ گل پوش راہیں   مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

ایک نظم کے ذریعہ جو بات کئی بندوں یا اشعار میں کہی جاتی ہے۔غزل کے ایک شعر ہی میں وہی بات حبیب جالب 'ماں بہو بیٹا' میں زمانے کی بے دردی کا شکوہ اس انداز سے کرتے ہیں۔

بے درد زمانے کو ہے ہنس دینے کی عادت   ہر اک سے یہاں درد کی روداد نہ کرنا

اور یہی اُن کی زندگی کا حاصل رہا، اُن کا دل خون بھی ہو گیا لیکن پھر بھی انہوں نے اُف تک نہیں کی صرف اپنے غم کا اظہار اشعار کے ذریعہ کرنے کو اپنا شعار جانا۔ فلم 'ماں بہو بیٹا' میں وہ یوں کہتے ہیں۔

پھر اشک بہانے کی اجازت بھی نہ ہوگی
دل خون بھی ہو جائے تو فریاد نہ کرنا

دیکھیے فلم 'پرائی آگ' کے اس مطلع میں کتنا درد، کتنا کرب چھپا ہے، درحقیقت یہ غم، غمِ جاناں نہیں بلکہ غمِ دوراں ہے وہ شامِ غم سے پوچھتے ہیں۔

اے شامِ غم بتا کہ سحر کتنی دُور ہے
آنسو نہیں جہاں وہ نگر کتنی دُور ہے

انہوں نے اپنی نظم "روئے بھگت کبیر" میں فلمی دنیا پر نہایت تیکھا طنز کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سڑکوں پر بھوکے پھرتے ہیں، شاعر موسیقار
ایکٹرسوں کے باپ لئے پھرتے ہیں موٹر کار
فلم نگر تک آپہونچے سیٹھ، پیر فقیر
روئے بھگت کبیر

اس تجزیے سے یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ حبیب جالب کی فلمی شاعری میں ادبی لطافت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سماجی شعور کے عناصر بھی ملتے ہیں اور یہ عوام کے جذبات اور احساسات کے صحیح معنیٰ میں ترجمان ہے ❋❋❋❋

فلمی نغمے

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی

میرے شانوں پہ زلفوں کو لہراؤ گے، میرے کہلاؤ گے
یوں خیالوں کی دنیا بساتا رہا،
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا،
شوقِ آوارگی

یوں ادا ہم نے فرضِ محبت کیا، آنسوؤں کو پیا
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا،
شوقِ آوارگی

اُس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے، فتنہ گر لوگ تھے
ہائے کیوں دل کی دولت لٹاتا رہا
اُڑتے پتوں کے پیچھے اُڑاتا رہا!!
شوقِ آوارگی

فلم: جوکر موسیقار: مصلح الدین گلوکار: احمد رشدی

❀

اب اور پریشاں دلِ ناشاد نہ کرنا
وہ یاد بھی آئیں تو انہیں یاد نہ کرنا
بے درد زمانے کو ہے ہنس دینے کی عادت
ہر اک سے بیاں درد کی رُوداد نہ کرنا
پھر اشک بہانے کی اجازت بھی نہ ہوگی
دِل خون بھی ہو جائے تو فریاد نہ کرنا
چاہت پہ ہماری کہیں الزام نہ آئے
بھُولے سے کبھی شکوۂ صیاد نہ کرنا

فلم: ماں بہو بیٹا موسیقار: حسن لطیف
گلوکار: مہدی حسن

❀

اپنے چمن کو جلتا دیکھوں اور خاموش رہوں آخر کیوں
اِس دھرتی پر بہا ہے کتنے انسانوں کا خوں آخر کیوں
ساری زمینوں کو ہیں گھیرے
صدیوں سے خونخوار لٹیرے
عزت دولت میرے وطن کی
لُوٹ رہے ہیں چند لٹیرے
کب تک یہ بربادی دیکھوں کب تک ضبط کروں آخر کیوں
ہر دل پر ہے دہشت چھائی
کس نے ہے یہ آگ لگائی
دشمن دُور ہے چین سے بیٹھا
لڑتا ہے بھائی سے بھائی
قاتل کو پہچان کے بھی قاتل کا نام نہ لوں آخر کیوں
ظلم و ستم کے یہ متوالے
کریں ہیں کیا کیا دھندے کالے
اتنے بے حس اتنے ظالم
نام نبیؐ کا لینے والے
ان کے ہاتھوں بستے بستے شہر اُجڑنے دوں آخر کیوں

❀

اُس بے وفا نے داغِ تمنّا دیا مجھے
بدلہ مری وفا کا یہ اچھا دیا مجھے

دنیا میں اب کہیں بھی محبت نہیں رہی
آج اُس کی بے رُخی نے یہ سمجھا دیا مجھے

کیوں اُس کے در پہ اے دلِ بیتاب لے گیا
میں تو کہوں گا تو نے بھی دھوکا دیا مجھے

گلوکار : مہدی حسن

❀

اس درد کی دنیا سے گذر کیوں نہیں جاتے
یہ لوگ بھی کیا لوگ ہیں مر کیوں نہیں جاتے

ہے کون زمانے میں مرا پوچھنے والا
ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ گھر کیوں نہیں جاتے

شعلے ہیں تو کیوں ان کو بھڑکتے نہیں دیکھا
ہیں خاک تو راہوں میں بکھر کیوں نہیں جاتے

آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دعائیں بھی ہیں لب پر
بگڑے ہوئے حالات سنور کیوں نہیں جاتے

فلم : زخمی   موسیقار : خورشید انور

گلوکار : مہدی حسن

❋

اِس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کب رات ڈھلی، یہ تو اندھیروں کا سماں ہے
ویران ہیں صحرا کی طرح خواب ہمارے

کس طرح گذرتے ہیں یہ دن رات نہ پوچھو
آہوں کے سہارے کبھی اشکوں کے سہارے

فلم : موسیقار   موسیقار : رشید عطرے

گلوکار : سلیم رضا

❋

اک بھول سمجھ کر ہم دل کی اُلفت کا زمانہ بھول گئے
کیا ہم نے کہا تھا کیا تم نے سارا افسانہ بھول گئے

غم دل کی نشانی چھوڑ آئے
خاموش کہانی چھوڑ آئے
مت پوچھ ہماری نظروں کا!
تھا کون نشانہ بھول گئے

ہر رات نئی محفل میں ہے
آباد کسی کے دل میں رہے
اک بار جہاں ہم نے پی لی
پھر وہ میخانہ بھول گئے
اک پھول پہ ہم کب مرتے ہیں
دم سارے چمن کا بھرتے ہیں
کس کس کی محبت کا ہم نے
گایا نہ ترانہ بھول گئے

فلم: بھروسہ   موسیقار: اے حمید
گلوکار: منیر حسین

❋

الفتح کے جوانو، کعبے کے پاسبانو
اب وقت آگیا ہے گھر سے قدم نکالو
جانبازو کامرانو
الفتح کے جوانو

جاگو کہ جاگنے سے تقدیر جاگتی ہے
اُٹھو تمہاری منزل تم کو پکارتی ہے
باطل سے دب کے رہنا توہینِ زندگی ہے
اب دل میں آگ بھر دو، اب ختم رات کر دو
اے صبح کے نشانو
الفتح کے جوانو!
محکوم ہے فلسطیں ہے خاک اپنا جینا
تیروں سے نفرتوں کے چھلنی ہے آج سینہ
اِس کا نشاں مٹا دو جس نے ہے چین چھینا
لے کر رہو فلسطیں جھپٹو مثالِ شاہیں
اے عزم کی چٹانو
الفتح کے جوانو

فلم: العاصفہ

❋

بجھے نہ دل رات کا سفر ہے

رات کا سفر ہے

یہ نا سمجھ لوگ بے خطا ہیں

ہمارے غم کی کسے خبر ہے

رات کا سفر ہے

دکھائیں داغ اپنے کس کو اے جاں!

یونہی لٹے ہیں ہمارے ارماں

رہیں ہیں تر آنسوؤں سے داماں

یہ غم کا طوفاں ڈگر ڈگر ہے

رات کا سفر ہے

ہنسیں گی سہمی ہوئی نگاہیں

چمک اٹھیں گی، وفا کی راہیں

ہزار ظالم سہی اندھیرا

سحر بھی لیکن قریب تر ہے

رات کا سفر ہے

فلم : گھر پیارا گھر موسیقار : نثار بزمی

گلوکار : مجیب عالم

❀

اے شامِ غم بتا کہ سحر کتنی دور ہے

آنسو نہیں جہاں وہ نگر کتنی دور ہے

دم توڑتی نہیں ہے جہاں پر کسی کی آس

وہ زندگی کی راہ گذر کتنی دور ہے

اب کوئی پاسباں نہ کوئی اپنا ہمسفر

منزل ہماری کس کو خبر کتنی دور ہے

کوئی پکارتا ہے تجھے کب سے اے خدا

کہتے ہیں تو ہے پاس مگر کتنی دور ہے

فلم : پرائی آگ موسیقار : خورشید انور

گلوکار : مہدی حسن

❀

بھول جاؤ گے تم
کر کے وعدہ صنم
تمہیں دل دیا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

درد کا ہے سماں غم کی تنہائی ہے
جس طرف دیکھئے بے کسی چھائی ہے
آج ہر سانس پر ہو کے بے تاب دِل
دھڑکنے لگا تو یہ جانا
بھُول جاؤ گے تم

چاند کو دیکھ کر ہو رہا ہے گماں
پھُول کے رُخ پہ چھائی ہو جیسے خزاں
مسکراتا ہوا میری اُمید کا
چمن لُٹ گیا تو یہ جانا
بھُول جاؤ گے تم

کیسے گزرے گی شب، کیسے ہو گی سحر
اب نہ وہ منزلیں ہیں نہ وہ ہمسفر
دیکھتے دیکھتے رھگذر رھگذر
اندھیرا ہوا تو یہ جانا
بھُول جاؤ گے تم

فلم: سیما موسیقار: ماسٹر عنایت حسین
گلوکار: سلیم رضا

❀

پیار بھرے خوابوں کی مالا پل میں ٹوٹ گئی
کس منزل پہ آکے مجھ سے قسمت رُوٹھ گئی

بنا کے میرا نشیمن جلا دیا تُو نے
مری وفا کا مجھے یہ صِلا دیا تُو نے
کیا تھا عہدِ وفا تُو نے جو محبّت میں
مجھے تو یاد ہے اب تک بُھلا دیا تُو نے

فضا اُداس نظر بے قرار دل ویراں
ہر اک چراغِ تمنّا بُجھا دیا تُو نے
زمانہ میری تباہی پہ مُسکرائے گا
بھرے جہاں میں تماشہ بنا دیا تُو نے

فلم : دو راستے موسیقار : ماسٹر عنایت حسین

گلوکار : سلیم رضا

پیسے کی یہ دُنیا ہے پیارے
گاتے ہیں اسی کے گُن سارے
ہے تمنّا اِس جہاں میں
کوئی دِل سے ہمیں پکارے
پیسے کی یہ دُنیا ہے پیارے

یہ جنگ یہ فساد ہے
پیسے کے واسطے
یہ زندہ مُردہ باد ہے
پیسے کے واسطے
صبح ہے فریب کی
منافقت کی شام
لب پہ دوستی کا نام

تن توپے واروں

من توپے واروں

بگڑی بنا دے

توپے رو رو پکاروں

پریت کا ناطہ ٹوٹ نہ جائے

جیون مجھ سے رُوٹھ نہ جائے

پیا سے ملا دے، موری بگڑی بنا دے

تن توپے واروں . . .

رو رو نیناں ہار نہ جائیں

طعنے جگ کے مار نہ جائیں

بھاگ جگا دے، موری بگڑی بنا دے

تن توپے واروں . . .

آس نراشں میں ڈھلنے لگی ہے

من کی بگیا جلنے لگی ہے

آگ بجھا دے، موری بگڑی بنا دے

تن توپے واروں . . .

فلم : ناگ منی موسیقار : نثار بزمی

گلوکارہ : نور جہاں

❀

تو کہ ناواقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

آج قاتل کی یہ مرضی ہے کہ سرکش لڑکی

سرِ مقتل تجھے کوڑوں سے نچایا جائے

موت کا رقص زمانے کو دکھایا جائے

اِس طرح ظلم کو نذرانہ دیا جاتا ہے

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

دیکھ فریاد نہ کر، سر نہ جھکا پاؤں اُٹھا

کل کو جو لوگ کریں گے تُو ابھی سے کر جا

ناچتے ناچتے آزادی کی خاطر مر جا

منزلِ عشق میں مر مر کے جیا جاتا ہے

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

فلم : زرقا موسیقار : رشید عطرے

گلوکار : مہدی حسن

❀

جاگنے والو جاگو مگر خاموش رہو
کل کیا ہوگا کس کو خبر خاموش رہو
کس نے سُنی ہے اِس نگری میں دل کی بات
کس پہ ہوا آہوں کا اثر خاموش رہو
رات کے بعد اِک رات نئی آجائے گی
اِس گھر میں ہوگی نہ سحر خاموش رہو
ظلم کے پہرے، خوف کے سائے سر پہ ہیں
ہو جائے گی عمر بسر خاموش رہو

فلم: خاموش رہو موسیقار: خلیل احمد

گلوکارہ: ناہید نیازی

❀

چل میرے ہمدم سنگ سنگ میرے
جہاں مِلتے ہیں شام سویرے
مری اُمید بر آئی
ہوئی اب دور تنہائی
لگی ہے گونجنے اب تو
مرے کانوں میں شہنائی
کرم تُو نے کیا مجھ پر
میں دھرتی سے بنی امبر
پھروں اُڑتی ہواؤں میں
میں تیری ساجنا ہوکر
بیتے گا یہ جیون
قدموں میں تیرے
چل میرے ہمدم....

مِل سکی کب خوشی پہلے
تھی غم سے دوستی پہلے
کسے ہم داغ دکھلاتے
نہ تھا اپنا کوئی پہلے
نظر تُو نے مِلائی کیا
مقدّر میرا جاگ اُٹھا
محبّت ہوگئی خود سے
جو تُو نے پیار سے دیکھا
چھُٹ گئے سارے
دکھ کے اندھیرے
ہوں کیوں نہ اس دل میں
خوشیوں کے ڈیرے
چل میرے ہمدم...

❀

چھوڑ میرے یار کوئی اور بات کر
تجھ کو نہیں کچھ بھی خبر

کیا اندھیری شبوں میں ہوتا ہے
کون ہنستا ہے کون روتا ہے

آ تجھ کو زخم دکھاؤں
چہروں سے پردے سرکاؤں
دیکھ یہ رنگ و نور کے سودے
دیکھ دلِ مجبور کے سودے
سمجھ اشارے جان یہ باتیں
کیا کہتی ہیں جاگتی راتیں
پیٹ بھروں کے دیکھ وہ دنگے
اِدھر بیچارے بھوکے ننگے
دیکھ کر دل کا خون ہوتا ہے
کون ہنستا ہے کون روتا ہے

سہمے سہمے لوگ ہیں دیکھو
صدیوں کے یہ روگ ہیں دیکھو
دیکھ سحر بن وہ کٹیائیں
جلتی بجھتی وہ آشائیں
دیکھ دھواں سانسوں میں جاتا
جسم سے جاں کا ٹوٹتا ناطہ
عِلم جنہیں کرنا تھا حاصل
بیچ رہے ہیں پین و پنسل

کیوں انہی کا نصیب سوتا ہے
کون ہنستا ہے کون روتا ہے

فلم : ہم ایک ہیں   موسیقار : نثار بزمی
گلوکارہ : مہناز

❀

دے گا نہ کوئی سہارا
اِن بے درد فضاؤں میں
سو جا غم کی چھاؤں میں

اپنا دکھ ہے جیون بھر کا
پل کی بات نہیں ہے
رونے [illegible] ٹ جائے یہ
ایسی رات ، سبس ہے
رحم نہیں ہے اس نگری کی ہواؤں میں
سو جا غم کی چھاؤں میں

آج اگر اپنی ماں ہوتی ، گود میں لے کر سوتی
ننھے ننھے تیرے آنسو دیکھ کے کتنا رُلتی
بکھرے ہیں کانٹے پھول سے تیرے پاؤں میں
سو جا غم کی چھاؤں میں

فلم : کون کسی کا موسیقار : منظور اشرف

گلوکارہ : نسیم بیگم ، آئرن پروین

❀

سنگیت نہ جانے
دکھلائے گا کب تک ہمیں
یہ خواب سہانے

سُر تال ہے جیون
لیکن میرے ماحول میں

پامال ہے جیون
کیوں حسن کے دشمن ہوئے
کچھ لوگ پُرانے
سنگیت نہ جانے
کب زخم سِلے ہیں
نغموں کے عوض ہم کو سدا
اشک ملے ہیں
رویا وہی آیا یہاں
جو پھول کِھلانے
سنگیت نہ جانے

یہ جرم ہے میرا
میں لیتا ہوں کیوں نام یہاں
پیار سے تیرا
بدلہ مجھے اچھا دیا یہ میری وفا نے
سنگیت نہ جانے

فلم : ساز و آواز موسیقار : حسن لطیف

گلوکار : مہدی حسن

❀

دین پیسہ ایمان پیسہ

خون پیوے شیطان پیسہ

پیسے لئی کردے نے ایہہ قتلِ عام

پیسے دے غلام

ہنسائے پیسہ، رلائے پیسہ

پاگل سب نوں بنائے پیسہ

پیسے بنا دنیا چہ بندا اِک گالی اے

اوہدی دی کی زندگی اے جیب جیدی خالی اے

چہریاں تے جان میری پیسیاں دی لالی اے

جگ اُتے ہر کوئی پیسے دا سوالی اے

دین پیسہ ایمان پیسہ

پیسے لئی نہ پچھو لوکی کی کی کُجھ کردے

لہو دی تھاں رگاں وچ زہر پئے بھردے

اللہ کولوں ڈردے نہ بندے کولوں ڈردے

پیسے لئی ایہہ جیندے نیں تے پیسے لئی ایہہ مردے

دین پیسہ، ایمان پیسہ

خون پیوے شیطان پیسہ

❀

فلم : رنگیلے جاسوس

زنداناں دے در نئیں کھلدے

ہنجواں ہاواں نال
قسم خدا دی کُھلن گے
لوہے دیاں بانواں نال

بچ نی جندے میریئے
اَج بچ بچ کے مرجا
ہر ظالم نوں مار کے
جند وطن توں وار کے
اُچا ناں اپنا کر جا

سُولی تے پھُل کہنیاں جیہڑے ڈردے نیئں
زندہ رہندے موت کولوں وی مردے نیئں

دُور ہنیرے ہون گے
ختم لیٹرے ہون گے
ایہناں ظالماں توں نہ ڈرجا
بچ نی جندے میریئے
بچ بچ کے مرجا

میں نیئں نچدی ایہہ مجبوری میری بچ دی اے
میرے نچدیاں لاج وطن دی بچ دی اے

آن اے پیاری جان توں
ڈرنا کیہ طوفان توں
ہُن ڈُب جا یا تر جا
بچ نی جندے میریئے
بچ بچ کے مرجا

❋

فلم: سرفروش موسیقار: شتاق علی گلوکارہ: نورجہاں

ظلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

ہنستی گاتی، روشن وادی
تاریکی میں ڈوب گئی
بیتے دن کی لاش پہ اے دل
میں روتا ہوں تو بھی رو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

یہ جیون بھی کیا جیون ہے
آگ لگے اس جیون کو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

ہر دھڑکن پر خوف کے پہرے
ہر آنسو پر پابندی

اپنے ہونٹ سیئے ہیں تم نے
میری زباں کو مت روکو
تم کو اگر توفیق نہیں تو
مجھ کو ہی سچ کہنے دو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

❁

فلم : یہ امن موسیقار : اے حمید گلوکار : مہدی حسن، نورجہاں

غلط ہیں سب یہ فاصلے
یہ دُور کیا قریب کیا
گلے میں اونچ پنچ کی !!!
یہ میری جاں صلیب کیا
ہم ایک ہیں
ہم ایک ہیں

مگر یہ بات پیار کی
سمجھ سکے رقیب کیا
ہم ایک ہیں
ہم ایک ہیں

یہ پھول رنگ رنگ کے
کنوار، ہیں ہر اُمنگ کے
جو ان ان سے دھڑکنیں
یہ سُر ہیں جلترنگ کے

یہ رشتے ہیں وہ خون کے
کبھی نہیں جو ٹوٹتے!
ستمگروں سے یہ کہو
دکھائیں ان کو توڑ کے
اِنہی سے ہیں بندھے ہوئے
امیر کیا غریب کیا
ہم ایک ہیں
ہم ایک ہیں

❀

فلم: ہم ایک ہیں موسیقار: نثار بزمی گلوکارہ: مہناز گلوکار: غلام عباس

کیوں کہیں یہ ستم آسماں نے کئے
آسماں سے ہمیں کچھ شکایت نہیں
دکھ ہمیں جو دیئے اس جہاں نے دیئے

چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے زندگی
چھین لیتے ہیں جب چاہتے ہیں خوشی
اونچے اونچے گھروں میں ہے جو روشنی
جل رہے ہیں ہمارے لہو کے دیئے

لاکھ چلتی رہے یہ ہوائے ستم
دیپ بجھنے نہ دیں گے محبت کا ہم
دیکھنا بیت جائے گی شام الم
جی رہے ہیں یہی آس دل میں لئے

فلم : ساز و آواز　موسیقار : حسن لطیف

گلوکارہ : نور جہاں

❀

لو وہ چلی، ڈولی میں آسوں کی
دکھ بن کے آئے کہار
لاگے دنیا اندھیری

دل جل گیا، آہ لب پر نہ آئی
چاروں طرف درد کی شام چھائی
جائے گا دل سے نہ پیار
روئے زمانہ ہزار
دکھ بن کے آئے کہار
لاگے دنیا اندھیری

جو دکھ ملے ہیں
ہنس کے سہیں ہیں
اس چپ میں کتنے ہی
طوفاں چھپے ہیں
سمجھی نہ ہے گی پکار
روئے دل بار بار
دکھ بن کے آئے کہار
لاگے دنیا اندھیری

فلم : گھر پیارا گھر　موسیقار : نثار بزمی

گلوکار : مہدی حسن

❀

من میں اُٹھی نئی ترنگ
ناچے مورا انگ انگ
پنچھی تیرے سنگ سنگ
من چاہے اُڑ جاؤں
کسی کے ہاتھ نہ آؤں
اے سکھی ناں ناں ناں!

آج میرے جیون میں کیسی رے مچی ہل چل
جیارا مورا دھڑک گیا ہو گئی میں بے کل
جانے کیا ہے یہ اُمنگ
کتنے ہوئے شرماؤں
کسی کے ہاتھ نہ آؤں!!
اے سکھی ناں ناں ناں

رنگ بھرے نینوا بولی رے نئی بولے
چھپے چھپے من کے میرے بھید کوئی کھولے
جھومتی ہوا کے سنگ بادلوں میں کھو جاؤں
کسی کے ہاتھ نہ آؤں!
اے سکھی ناں ناں ناں!!

فلم: ناگ منی موسیقار: نثار بزمی

گلوکارہ: نور جہاں

❀

میرا ایمان محبت ہے، محبت کی قسم

ساری دنیا ترے قدموں پہ نچھاور کر دوں،
چاند تاروں سے مری جاں ترا دامن بھر دوں،
تیرے خوابوں پہ کبھی چھا نہ سکے شامِ الم
میرا ایمان محبت ہے

وہ جہاں ایک جہنم ہے جہاں تو نہ ملے
جل کے مر جاؤں جو یہ سایۂ گیسو نہ ملے
زندگی زہر بھرا جام ہے اب تیرے بغیر
تیری چاہت پہ ہیں قربان مرے لاکھ جنم
میرا ایمان محبت ہے

مسکرا جانِ بہاراں کہ سویرا ہو گا!!
ختم صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہو گا!
شب کی تقدیر میں لکھا ہے گزر ہی جانا
راہ سورج کی کہاں روک سکے اہلِ ستم
میرا ایمان محبت ہے

فلم: ناگ منی موسیقار: نثار بزمی

گلوکار: مہدی حسن

❀

نندیا روٹھ گئی اکھین سے ترس گیا میرا پیار
پھر پردیس نہ جانے دوں گی آجا اک بار

لوگ دیکھیں نہ تماشہ مری تنہائی کا
نغمہ فریاد میں ڈھل جائے نہ شہنائی کا

رات کٹتی نہیں لے چاند یہ اُن سے کہنا
دن گذرتا ہے تڑپ کر ترے سودائی کا

سب کہیں گے کہ مجھے چھوڑ گئے ہو تنہا
کیسے دیکھوں گی یہ عالم تری رسوائی کا

ساجنا پیار کیا ہے تو نبھاتے رہنا
دے نہ طعنہ یہ زمانہ تجھے ہرجائی کا

فلم : ماں بہو اور بیٹا   موسیقار : حسن لطیف

گلوکارہ : نورجہاں

❀

نہ شاخ ہی رہی باقی نہ آشیانہ ہے
بہت سکون سے اب گردشِ زمانہ ہے

نبھانے آئے تھے جو رسمِ دوستی ہم سے
اُنہی کے تیرِ ستم کا یہ دِل نشانہ ہے

خموش کیوں ہو، بتاؤ کہاں چلے جائیں
تمہارے در کے سوا اب کہاں ٹھکانہ ہے

فلم : ماں بہو اور بیٹا   موسیقار : حسن لطیف

گلوکارہ : نورجہاں

❀

انہیں یقین ہے ڈھلے گی اک دن ستم کی یہ شام اے فلسطین
اے فلسطین
ستمگروں کا نشاں نہ ہوگا ہمارا خون رائیگاں نہ ہوگا!!
شہید ہو کر بھی اپنے لب پر ہے تیرا ہی نام اے فلسطین

وطن سے جب تک مٹا نہ لیں گے نشان ہم سامراجیوں کا
قسم محمدؐ کی عظمتوں کی نہ لیں گے آرام اے فلسطین
ا

فلم: زرقا   موسیقار: رشید عطرے

گلوکارہ: نسیم بیگم، منیر حسین

❀

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

ملے تھے بہت ہمسفر زندگی میں
نہیں یاد کس کو کہاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھیں وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

ہر اک شب کسی زلف کے میہماں تھے
مہکتی گھٹا وہ سماں چھوڑ آئے

جو دامن پہ آئیں تو ہو جائیں رسوا
کچھ ایسے بھی اشکِ رواں چھوڑ آئے

فلم: سماج   موسیقار: اے حمید

گلوکار: مہدی حسن

❀

یہ بھی وقت گزر جائے گا
رات اگر غم کی آئی ہے
دن خوشیوں کا بھی آئے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

غم سے مت گھبرانا ساتھی
ہمت ہار نہ جانا ساتھی
ملے گی منزل کٹنے گی مشکل
ہر دکھیارا سکھ پائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

جان ہے کیا شئے آن کے آگے
انساں کیا جو غم سے بھاگے
ہر دکھ سہہ جا دل کی کہہ جا
گیت یہ جگ تیرے گائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

آنکھ کھلی تو ہم تھے قفس میں
اب بھی ہے سب کچھ غیر کے بس میں
سوگ ہے گھر گھر گنبد بے در
اور الم کیا دکھلائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

کھل جائیں گے در زنداں کے
جاگ اٹھیں گے بھاگ انساں کے
دیدۂ پرنم پیار کا پرچم
چاروں جانب لہرائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

یہ ہے موت کا نشہ
اسے جو منہ لگائے گا
وہ زندگی سے جائے گا

صبح و شام نسلِ نو کا قتلِ عام دیکھئے
موت دے رہا ہے موت کا نظام دیکھئے
جل بجھی حیا کی شمع اک دھواں سا رہ گیا
یہ دھواں نہ جانے اور کتنے گھر جلائے گا

یہ ہے موت کا نشہ
اسے جو منہ لگائے گا
وہ زندگی سے جائے گا

زندگی نہ مِل سکے گی بار بار سوچ لو!
کر رہے ہو جان موت پر نثار سوچ لو!
سوگوار جن کو چھوڑے جا رہے ہو دہر میں
کون اِن کے بوجھ کو تمہارے بعد اٹھائے گا

یہ ہے موت کا نشہ
اسے جو منہ لگائے گا
وہ زندگی سے جائے گا

تیرگی کے تاجروں سے پاک یہ جہاں کرو
بیچتے ہیں یہ جو زہر ان کو بے نشاں کرو
اِس خموش کشت و خوں کی ختم داستاں کرو
چہرۂ حیات پر یونہی نکھار آئے گا
بے حسی و بےکسی کا دور بیت جائے گا
یہ جہان مسکرائے گا

❀

(مشتاق گندوری کی فلم "موت کا نشہ" کا گیت)

پنجابی فلمی نغمے

باز ظلم توں آ ظالماں باز ظلم توں آ
اگلے پل دی خبر نیئں تینوں بن بن بہویں خدا

سیج تے جیہڑی رات سی آدنی مقتل دے وچ آئی
واہ جیدارا توں اک دھی دے سر توں چُنی لا ئی
ہنجو بن کے بہہ گیا کجلا زخمی ہو گئے چا

باز ظلم توں آ . . .

جناں دی توں ظلم کریں گا اج اساں سہہ جانا
بھانویں توں سُولی تے ٹنگ دے سچ اساں کہہ جانا
موت زندگی ہتھ نیئں تیرے توں کیہ کھو ہنے سا

باز ظلم توں آ . . . .

موسیقار: شتاق علی گلوکارہ: نورجہاں

❋

بن ٹھگیاں ایس دنیا اندر بنیاں کون رئیس
دیوتا بن کے ایتھے پھردے بڑے بڑے ابلیس
حسینہ چار سو بیس، حسینہ چار سو بیس

شام سویرے موتاں ویکھن دولت دے بیمار
پیسہ دھرم ایماں ایہناں دا ایہہ مطلب دے یار
راتاں دے پردے وچ کھیڈن عزتاں نال خبیث
حسینہ چار سو بیس، حسینہ چار سو بیس

انساناں دیاں لاشاں اُتے قاتل بھنگڑے پون
لے ہتھ ستمگاراں دے مجبوراں دا کون
جیہڑا سچ دا نعرہ لا دے ظالم دیندے پیس
حسینہ چار سو بیس حسینہ چار سو بیس

ساریاں شہراں تے چھائی اے اک دہشت دن رین
پتہ نیئں لگدا اِس دھرتی دا کھویا کِنے چین
حال وطن دا دیکھ کے میرے دل چوں اُٹھدی ٹیس
حسینہ چار سو بیس حسینہ چار سو بیس

فلم: حسینہ ۴۲۰ موسیقار: وجاہت عطرے
گلوکارہ: نورجہاں

❋

صدیاں توں لگّا اے بزار ویکھ لے
میں آں کہ توں کون گنہ گار ویکھ لے
زخماں دے پُھلاّں دی بہار ویکھ لے
عزّتاں دا ہوندا کاروبار ویکھ لے
بُجھلے دی بھجیّ بھجیّ دھار ویکھ لے
صدیاں توں لگّا اے بزار ویکھ لے

ایہہ چھنکدیاں رُسوائیاں
کِنّاں نے پیریں پائیاں
ایہہ اس دھرتی دیاں جائیاں
اساناں توں نہیں آیاں
بن ڈولیاں بن شہنائیاں
راتاں نوں ہون پرائیاں

کوئی ایسا مسیحا آوے
دُکھ دی سُولی توں لاوے
بے غیرت گلیاں ڈھاوے
ظُلماں دا راج مٹاوے
اِک نواں سماج بناوے
جکڑی زنجیراں وچ نار ویکھ لے
صدیاں توں لگّا ایہہ بزار ویکھ لے

فلم : زخمی عورت

نذرِ جالب

افضل صدیقی

چھپا ہے چاند یہ کہہ کر حبیب جالب سے
گلے ملیں گے گل تر حبیب جالب سے
کوئی بھی حال ہو دیکھا مگر نہیں جاتا
اداس شام کا منظر حبیب جالب سے
منافقت کا کوئی ایک حرف بھی نہ کہا
خطا ہوئی یہی اکثر حبیب جالب سے
بہت سے شعر کہے ہیں بہت سے لوگوں نے
کہا نہ ایک بھی بہتر حبیب جالب سے
یہی کہا ہے قصیدہ لکھو ہمارے لئے
ملا ہے جب کوئی افسر حبیب جالب سے
ہزار مسند و منبر پہ جم کے بیٹھا ہو
رہے گا پھر بھی وہ کم تر حبیب جالب سے
غریب ، غمزدہ ، بیمار ، خون تھوکتے لوگ
سکون پاتے ہیں مل کر حبیب جالب سے
بنام صدق ہمیشہ خفا ہی رہتے ہیں
تمام حاکم و افسر حبیب جالب سے
بسر ہو زندگی کیسے اگر نہیں معلوم
تو پوچھ لیجئے جاکر حبیب جالب سے
ابھی تو عمر ہی کیا ہے ، ابھی تو گزریں گے
مزید سال پچہتر حبیب جالب سے

بابا نجمی

سچائیاں دے عرش دا تارا جالب جے
تول کے دیکھو سبھ توں بھارا جالب جے
ہر اک دور دا آمر جس توں ڈریا اے
اچا سچا اوہ للکارا جالب جے
سچے راگ الاپے جنھے گلی گلی
اس دھرتی اوہ ونجارا جالب جے
وڈھ رہیا اے جیہڑا پیر ہنیرے دے
اکھاں کھول کے دیکھو آرا جالب جے
کیہ ہووے گا آون والے ویلے وچ
اج دی کروا پیا اشارا جالب جے

توقیر چغتائی

متاع جان داؤ پر لگا کر تو نکلا ہے
تو زر پہ بکنے والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے
ترے اشعار لوگوں کی زباں سے جب نکلتے ہیں
قصیدے لکھنے والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

صرف حبیب جالب کے یوم پیدائش پر

سلیمہ شاہد

مصلحت سے مفر جس کی تاکید ہے
آج اس شخص کا یوم تولید ہے
وہ اجالا ہے اور شب لب گور ہے
الاماں الاماں ہر طرف شور ہے
اس کے شعروں میں اب بھی وہی زور ہے
جس کا لہجہ خموش کی تردید ہے
آج اس شخص کا یوم تولید ہے
جس کے انکار میں ایک امید ہے
جس کے الفاظ میں ایک خورشید ہے
جس کی راتوں میں صبح کی تمہید ہے
آج اس شخص کا یوم تولید ہے
اک مسافر جو دن رات چلتا رہا

نذرِ جالبؔ

سید قادر نجف زیبی

حبیب جالب تمہارے غم میں
تمام عالم دھواں دھواں ہے
ہر آنکھ بے خواب بے نشاں ہے
تمہارے لہجے کے بانکپن میں
تمہارے چہرے کے دھیمے پن میں
تمہاری آنکھیں بغاوتوں کے علم اٹھائے
تمام عالم پہ چھا گئی تھیں
تمہارے چہرے کی سادگی میں، تمہاری آنکھیں
تمام قہر و غضب کی حامل بنی رہی تھیں

حبیب جالب
تمہارے کردار کی بلندی
تمہارے انکار کی صداقت
تمہارا انساں سے پیار کرنا
میں سوچتی ہوں تو حیرتوں کے دیئے سے جلتے ہیں

چاروں جانب
ہر ایک چہرہ ہے مصلحت کی ردا لپیٹے
مفاہمت کی قبا لپیٹے
نہ جانے کتنے گروپ کھڑے ہیں
اور ہاتھ میں شہرتوں کے کاسے
نہ پاسِ عزت نہ پاسِ حرمت
انا کی دولت سے ہاتھ خالی

ناآشنائے ادب کو ہم نے
ادب کی محفل سجائے دیکھا
نہ جانے کتنے ناشاعروں کو
مشاعروں میں کلام پڑھتے ہوئے سنا ہے

وہ زینہ زینہ چڑھے ہیں اوپر
مفاہمت کی قبا لپیٹے
اور ایک تم اپنے حق کی خاطر
سدا ہی لڑتے رہے جہاں سے
مگر جہاں بات ہو آدمی کی
وہاں تم اپنے حقوق بھولے
بس آدمی پہ وفا کی دولت لٹائے رکھی
خود اپنی ہستی مٹائے رکھی
مصیبتوں میں حیات گزری
کبھی نہ سکھ کی سویر دیکھی

نہ مصلحت کی قبا ہی اوڑھی

حبیب جالب
تمہارا انساں سے پیار کرنا
بس ایسے جیسے
کسی نے نیکی کا کام کر کے بہا دیا ہو
تمہارے غم میں قلم سے شعلے تو پھوٹتے ہیں
مگر تمہارے دکھوں کو میں نے
کبھی نہ اپنی خوشی سے بدلا
میں اپنے اس جرم پہ ہوں نادم
حبیب جالب
تمہاری آنکھیں بغاوتوں کی مشعل جلائے
ہمارے مردہ ضمیر و دل کو جگا رہی ہیں
رلا رہی ہیں
حبیب جالب

(ماہنامہ منشور کراچی اپریل ۱۹۹۳ء)

شان الحق حقی

قطعۂ تاریخِ وفات حبیب جالب

قولِ حق پیشِ حاکم جابر
یہ سعادت ہوئی تھی اسکو نصیب
" مردِ بے باک پاک، جادو لب
جالبِ خوش نوا حبیبِ لبیب"

۱۴۱۳ھ

(فنون لاہور جنوری، اپریل ۹۳ء)

شاہد شیدائی

صداقتوں کا پیمبر حبیب جالب ہے
بِکا نہ جس کا قلم وہ حبیب جالب ہے

بکھیرتا ہی رہا زمزمے محبت کے
مرے چمن کا دکھی عندلیب جالب ہے

سزا کے خوف سے احباب دور دور رہیں
ہمیشہ دارو رسن کے قریب جالب ہے

جہاں میں ایسے غریب الوطن بھی ہوتے ہیں
وطن میں رہتے ہوئے بھی غریب جالب ہے

نہ شاہ کا وہ مصاحب، نہ صاحبوں کا حلیف
اٹھا کے نکلا جو اپنی صلیب جالب ہے

فاضل جمیلی

میں خط لکھوں گا

میں خط لکھوں گا
حبیب جالب کے نام اک دن
میں اس کی خدمت میں عرض کر کے
سلام اک دن
اسے بتاؤں گا حال اپنا
میں اس کو بھیجوں گا اپنی تصویر
اسے دکھاؤں گا جسم اپنا
کہ جس پہ کوڑوں کے داغ اب تک
چراغ سا جگمگا رہے ہیں
اُسے سناؤں گا وہ کہانی
جو آمریت کی مہربانی سے آج تک بے زباں رہی ہے
جو قید و بند کی صعوبتوں میں لکھی تھی میں نے
اُسے سناؤں گا نظم اپنی
میں خط لکھوں گا
حبیب جالب کے نام اک دن
مجھے یقین ہے
وہ میرے خط کا جواب دے گا
بطور شاباش اپنی تازہ کتاب دے گا

فہمیدہ ریاض

از کجا آید ایں آوازِ دوست (رومی)

جب دیس کی قسمت پر سیاہی چھائی
جب تیغِ ستم تابہ افق لہرائی
جب خلق کے ہونٹوں کی ہوئی بخیہ گری
سہمے چہروں پر اُداسی چھائی
گونجی ہے صدا ایک کہ دل کھل سے گئے
یہ دوست کی آواز کہاں سے آئی
وہ نے کی طرح وقت کے ہونٹوں میں دبا
کرتا ہے حکایتِ غمِ جاناں کی بیاں
جمہور کے پندار کا حامل ہے سخن
ہر شعر کی ٹھوکر میں ہے اقلیمِ جہاں
جالب تجھے معلوم نہ ہوگا شاید
ہے غیرتِ جمہور مجسم تجھ میں
نادار کی جرأت تیرے تیور میں ڈھلی
اربابِ ستم دیکھ کے تھراتے ہیں
تاریخ کبھی ہم سے جو مانگے گی حساب
ہم پیش کریں گے تیرے نغموں کی کتاب
کیا بخت سیہ اپنا وطن لایا تھا
کس طور گزار رہے مسلسل یہ عذاب
تاریخ نے خلقت کو تو قاتل ہی دیئے
خلقت نے دیا ہے اُسے جالب سا جواب

محسن بھوپالی

نذرِ حبیب جالب

تذلیل کے حربوں سے، رنجور نہیں ہوتا
تحسین کے جملوں سے، مغرور نہیں ہوتا
جو کچھ بھی کہا اس سے انکار نہیں ہوتا
اور خوفِ حراست سے، مستور نہیں ہوتا
حق بات بھی کہتا ہے پھر ظلم بھی سہتا ہے
اور ملک میں رہتا ہے، مفرور نہیں ہوتا

(جشن جالب کی تقریب منعقدہ ۲۶ مئی ۸۸ء کو لاہور میں پڑھا گیا)

وہی روش ہے وہی دَور ہے، مگر چپ ہیں!
خرد ہے مہر بلب، صاحبِ نظر چپ ہیں!
وہ کون سا ہے ستم کل تھا اور آج نہیں
کسی کے لب پہ مگر حرفِ احتجاج نہیں
وطن کے دوش پہ ہیں پیر تسمہ پا کی طرح
خدا کے ملک پہ قادر ہیں جو خدا کی طرح
کوئی نہیں ہے انھیں بڑھ کے روکنے والا
کوئی نہیں ہے انہیں بڑھ کے ٹوکنے والا
سرِ بساطِ سخن یوں تو ہم نوا ہیں بہت!
نہیں ہے ایک بھی جالبؔ غزل سرا ہیں بہت

(ماہنامہ تخلیق لاہور فروری ۹۰ء)

محمد افضل

ابھی تو موسم ہے عاشقوں کا

حبیب جالب کا نوحہ

ابھی تو پچھلے غموں کا نوحہ
جو قریہ قریہ سسک رہا ہے
جو گرمیوں کی حرارتوں سے
بدن کی ہر آنکھ سے رواں ہے
اُسی سے فرصت کہاں
کہ ہم تیری فرقتوں کو
قبول کرتے
ابھی تو کچھ دیر اور رُکتے حبیب جالبؔ!
ابھی تو کچھ دیر اور رُکتے
ابھی تو سکتے میں ہیں مرے
یار نوحہ گر بھی
کہ جن کی آنکھیں زبان بن کر
کھڑے اندھیروں کو دیکھتی ہیں
ابھی تو زنجیر نوحہ گر ہے
ابھی تو ظلم و ستم کے مالک

اسی طرح سے مرے عقیدوں پر
اپنے شبخون مارتے ہیں
ابھی تو لوگوں کے قول
ان کے نہیں کہ بولیں
ابھی تو شہرِ ستم میں
ہر بے یقین کو احرام باندھتے ہیں
ابھی تو عہدِ خزاں ہے جس میں کہ سرخ پتے
لہو کی صورت ٹپک رہے ہیں
ابھی تو عہدِ ستم ہے جس میں
کہ سر بُریدہ ہر اک شجر سے
کچھ ایسے سورج نکل رہے ہیں
کہ جیسے منصور ہی کے سر ہوں
ابھی تو موسم ہے عاشقوں کا، حبیب جالبؔ!
ابھی تو کچھ دیر اور جیتے

(فنون لاہور جنوری۔ اپریل ۹۳ء)

مظفر وارثی

اعزاز رسن ہے عَلمِ دار ہے جالب
ہر دورِ ستم کے لئے دیوار ہے جالب
الفاظ کی حرمت ہے کہ ہے عظمت خامہ
یا حوصلہ و جراتِ اظہار ہے جالب
تصویرِ سیاست میں بھی اک رنگ ہے اس کا
تاریخ ادب کے لئے کردار ہے جالب
آئینے سے بھی کوئی رعایت نہیں کرتا
خودگر ہے خود آگاہ ہے خود دار ہے جالب
بے جان اصولوں کی اطاعت نہیں کرتا
دیوانگی ہے جہد ہے ایثار ہے جالب
کذّاب خداؤں سے محبت نہیں کرتا
سچائی کی مورت کا پرستار ہے جالب
انصاف کا طالب ہے بغاوت نہیں کرتا
جینے کے لئے مرنے کو تیار ہے جالب
اے تہمتو ' رسوائیو ' اے خواہشو ' خوابو
بکنے کے لئے آؤ خریدار ہے جالب
تاروں سے تعلق ہے نہ مضراب سے ناطہ
جو رت سے اٹھتی ہے وہ جھنکار ہے جالب
وہ بیچ میں بھی ' چاروں طرف بھی وہی اپنے
اک نقطہ مرکز ہے کہ پرکار ہے جالب
امروز کو پھر اس سے رقابت نہ ہو کیونکر
فردا کی محبت میں گرفتار ہے جالب
راہوں میں اندھیرا سہی سینہ تو ہے روشن
تقدیر ہے سوئی ہوئی ' بیدار ہے جالب
آواز میں کلیوں کے چٹکنے کی صدا ہے
ہو ذوق سماعت تو شرر بار ہے جالب
یہ نذرِ سخن اس کے لئے کم ہے مظفر
شاعر تو سبھی کا ہے ' مرا یار ہے جالب

نجیب احمد

دھنک سے خواب تھے کیا کیا پلک حنائی ہوئی
نہ شب ڈھلی نہ در صبح تک رسائی ہوئی

انہی کا خوں رہِ مقتل کی آبرو ٹھہرا
جو بات روک نہ پائے لبوں تک آئی ہوئی

درِ نجات کھلے منتظر ہے خلقِ خدا
بس ایک جاں ہے سو ہے داؤ پر لگائی ہوئی

دلوں کی بات دلوں نے قبول ہی کب کی
لبوں سے توڑ کے ناطہ کہاں پرائی ہوئی

نہیں کہ صرف گزشتہ عذاب تو نے سہے
کہ یہ گھڑی بھی ہے جالب تجھی پہ آئی ہوئی

قدم دھرے تو زمین نے جھلس دیا ہے نجیب
چلے تھے گھر سے تو سر پر گھٹا تھی چھائی ہوئی

حبیب جالب کی نذر

نقاش کاظمی

تو لفظوں کا جادوگر تھا
تو تھا آوازوں کا شور
تجھ میں تلواروں کی کاٹ تھی
اور زنجیروں کی جھنکار
تو تھا سچائی کے بہتے دریاؤں کا زور
تو نے وقت کی مصلحتوں کے
میخانوں سے دور
زندانوں میں
میدانوں میں
اپنی بزم سجائی
فن کاروں کی
میخواروں کی
تنہا شمع جلائی
تو نے کھیتوں کھلیانوں کے بیچوں بیچ

جوشیلے گیتوں کے سچے پھلوں کا پودا
سب سے الگ لگایا
سب کا بوجھ اٹھایا
ہم کو یاد ہے جالب تو نے
اک دن آ کے "سر مقتل"
قاتل ہاتھ کو پہنچوایا
لہو کا دیپ جلایا
تو نے اپنے لہجے میں
ساحر اور پابلو کی گھن گرج سے لے کر
جوش کے سج دھج
فیض کے سوز و ساز کا رنگ جمایا
اور گریبانوں کا پرچم
اونچا بہت اڑایا
اونچا بہت اڑایا

الطاف حسین قریشی

حبیب جالب کا تعلق نچلے طبقوں سے تھا اسی لئے اس نے نچلے طبقوں کے حقوق کی بات کی۔ اس کی شاعری میں انسانیت، انسان کے دکھ، سامراج کے خلاف مزاحمت کرنے اور ذہنی آزادی حاصل کرنے کا پیغام ہے وہ طبقاتی سوچ رکھنے والا' نڈر بہادر اور ایمان دار شاعر تھا۔ اگرچہ فیض احمد فیض بہت اہم اور بڑے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انقلاب اور انسان پرستی کی سوچ اور فلسفہ کو پھیلانے کا کام کیا ہے لیکن ان کے خیالات صرف درمیانے اور پڑھے لکھے طبقے تک پہونچ پائے جبکہ حبیب جالب کی عظمت اس بات میں ہے کہ اس نے فلسفہ اور انقلاب کا درس عوام کی روزمرہ کی بول چال کی زبان میں دیا لہٰذا وہ کھیت مزدور، کسان، صنعتی کارکن اور دوسرے نچلے طبقوں کا شاعر ہے اس نے مزاحمت، انقلاب اور طبقاتی جدوجہد کا پیغام گھر گھر پہونچایا۔ وہ ساری عمر بری روایات کلچر ملائیت

اور حکمرانوں کے خلاف لڑتا رہا عوام کو اپنے اشعار کے ذریعے بیدار کرتا رہا اس نے عوام کو اپنی سیاسی شاعری کے ذریعے ظالم طبقات کے خلاف لڑنے کی جرات بخشی اور یہ لڑائی خود بھی سڑک پر لڑی۔ اس نے اپنی پیٹھ پر لاٹھیاں کھائیں لیکن ظلم کا پردہ چاک کرنے کی عادت کبھی ترک نہ کی یہی وجہ ہے کہ جالب آج بھی پاکستان کے عوام کی دل کی دھڑکن ہے۔

رشید مصباح

حبیب جالب عوام کا شاعر تھا وہ لفظ کی حرمت اور عوام کی ترجمانی کی علامت تھا۔ اس نے تمام زندگی جبر کی طاقتوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے بسر کی اس نے سچ کہنے اور سچ کی آواز بلند کرنے کا فریضہ سرانجام دیا وہ دانشوروں اور عوام کے درمیان ایک مضبوط رابطے کی حیثیت رکھتا تھا۔ سچ بولنے، مزاحمت کرنے اور اپنے اشعار کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے کے جرم میں حکمرانوں نے ہمیشہ اس کی زندگی عذاب بنائے رکھی لیکن اس نے ہر حال میں حق بات کہی۔

ضیاء علیگ

حبیب جالب سے میری ملاقات کراچی میں ...... ۔ اُس وقت ہوئی جب وہ بحیثیت شاعر نہ معروف تھے نہ مقبول۔ وہ اکثر شام کو صدر بازار کے کافی ہاؤس (اُوپر کی منزل) تشریف لاتے تھے۔ جہاں روزانہ حاضری دینے کا میرا بھی معمول تھا۔ نہ میں حبیب جالب سے اس وقت متعارف تھا اور نہ ہی وہ مجھے جانتے تھے۔ مگر یہ تماشا وہ ہر شام ضرور دیکھتے تھے کہ میز کے اِرد گرد کچھ صحافی، کچھ ادباء اور شعراء بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک دن وہ خود ہی اجازت لے کر ہماری میز پر آگئے۔ اپنا تعارف کرایا۔ پھر سب سے پہلے مجھ سے ملے۔ اس کے بعد اُن کا اٹھنا بیٹھنا ہم ہی لوگوں کے ساتھ ہونے لگا۔ ان دنوں وہ مالی اعتبار سے بہت پریشان تھے۔ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور نہ رہنے کا کوئی معقول ٹھکانہ تھا۔ میں نے رتن تالاب گورنمنٹ گرلز کالج کے عقب میں ایک فلیٹ چھ سو روپیہ پگڑی دے کر لیا تھا۔ جہاں ایک پرانی مسہری اور چند کرسیاں اور ایک میز نیلام گھر سے لاکر ڈال دی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مکان کے تعلق سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا۔ میرے فلیٹ چلے آؤ، وہاں میں اور میرے کزن رہتے ہیں۔ ان کے پاس ایک بچھونا تھا اور ایک لوہے کا صندوق، وہ تین مہینے کے لگ بھگ، اسی طرح میرے

فلیٹ میں رہے کہ رات کو کسی وقت آکر اپنا بستر مسہری کے نیچے سے نکال کر فرش پر بچھا کر سو جاتے تھے۔ جب اٹھتے تھے تو نہا دھو کر تلاشِ معاش میں نکل جاتے تھے۔ کبھی دن میں آ جاتے تھے۔ (ایک کنجی انہیں کے پاس تھی) تو کرسی پر دراز ہو کر شعر کہتے تھے۔ یا خط وغیرہ لکھا کرتے تھے۔ پھر ایک دن وہ کہیں اور منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد پنجاب واپس چلے گئے۔ میری ان سے عرصہ تک ملاقات نہ ہوئی۔

ایک بار جب میں انجمن ترقی اُردو، سندھ برانچ کی طرف سے مشاعرہ کرنے والا تھا۔ تو کراچی سید محمد جعفری کے پاس گیا جن کے ذمہ کراچی کے مشاعروں کو مدعو کرنا' مشاعرہ گاہ تک لانا اور نذرانہ وغیرہ کی بات طے کرنا تھا۔ اس بار انہوں نے حبیب جالب کا نام تجویز کیا تو میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جعفری صاحب بھانپ گئے۔ مجھے یقین دلایا کہ وہ مشاعرے کا شاعر ہے۔ تمہیں اور تمہارے سامعین کو مایوسی نہیں ہوگی۔ تم اُسے بُلا کر تو دیکھو۔ میں نے مدعو کر لیا ـــــــ ریاست خیر پور میں بھی ایک دن پہلے مشاعرہ تھا۔ وہ ان تمام شعراء کے ساتھ (ادیب سہارن پوری۔ محشر بدایونی وغیرہ) کے ساتھ حیدرآباد سندھ تشریف لائے اور مشاعرے میں حد سے زیادہ کامیاب رہے۔ ایک تو ان کا حسن ادائیگی۔ دوسرے عوام پسند شعر، تیسرے کلام کا تیکھا پن ایک ہی کیا' سارے سامعین متحیر بھی ہوئے اور مسحور بھی (یہ حبیب جالب کی اِس شہر میں پہلی قدم رنجائی تھی) میرے سامنے ان کا جو ۸ - ۹ سال پہلے کا خاکہ تھا وہ اس سے بہت مختلف نکلے۔

افسوس کہ حبیب جالب سے پھر پاکستان میں میری ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ وہ اُردو کے جاں نثاروں کی دعوت پر ایک بار کینیڈا ضرور تشریف لائے' وہ بھی تن تنہا یعنی دوسرے ادباء اور شعراء کے ساتھ نہیں۔ ایک عظیم الشان مشاعرہ کا اہتمام صرف انہیں کی خاطر ہوا کہ باہر کا کوئی اور شاعر مدعو نہیں تھا۔ مجمع کا وہی عالم تھا جو ان مشاعروں میں ہوتا ہے۔ دس بارہ شاعر برصغیر سے تشریف لاتے ہیں۔ انہیں یہاں آنے کا ویزا بڑی مشکل سے ملا تھا۔ کئی اور نشستیں اُن کے اعزاز میں ہوئیں۔ مگر وہ ٹورنٹو سے بالا بالا ہی نکل گئے۔ یہ باہر سے آیا ہوا پہلا شاعر تھا جو صرف اپنے اعتقادات میں گم۔ اپنے Convictions سے لپٹا ہوا۔ اپنی شاعری میں گم۔ جسے یہ بھی خواہش نہ تھی کہ یہ نیاگرا فالز ہی دیکھ لے اس ملک میں جہاں اہلِ علم، اہلِ قلم، اہلِ دانش و بینش کی بے حد تعظیم و تکریم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں بقول حبیب جالب ؎

کبھی گریباں چاک ہوا کبھی ہوا دل خون
ہمیں تو یونہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ
جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کسے سڑک کے بیچ

حیف صد حیف

فیض احمد فیض جب یہاں آتے تھے تو صرف دو شاعروں کا ذکر محبت سے کرتے تھے۔ احمد فراز اور حبیب جالب۔
(تخلیق لاہور اگست ۱۹۹۳ء)

فیروز مکرجی

انور خالد کی ناگہانی موت کے چند دن بعد ہی حبیب جالب بھی ہمیں الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی موت پر پاکستان کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں کیا کچھ نہیں ہوا ہو گا اس کا اندازہ میں کر سکتی ہوں اور میرا خیال ہے حبیب جالب جیسی شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کر کے ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ اپنی سنگ دلی، اپنی بے مہری، اپنی تن آسانی کے لئے ان جیسی شخصیتوں سے معذرت خواہ ہوتے ہیں۔ اب وہ ہم سے بہت دُور چلے گئے ہیں انہیں ہماری رفاقت ہماری دولت ہماری ہمدردی کی ضرورت نہیں رہی وہ اس سے بہت بلند ہو گئے۔ اب ہم صرف الفاظ سے ہی اپنی بے اعتنائی کا مداوا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ اور اس خراجِ عقیدت میں صداقت بھی ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں اُن کی بلندی اور اُن کی قربانیوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ حبیب جالب جیسے انسان اب پیدا نہیں ہوں گے کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے سیاسی حالات بدل گئے ہیں اور ہماری قدریں بھی بدل گئی ہیں۔ وہ صرف حساس دل، دلکش ترنم اور سیاسی شعور کے ہی مالک نہیں تھے میرا خیال ہے ہمارے عہد کا کوئی بھی شاعر اس طرح عوام کے قریب نہیں آیا جس طرح وہ آئے تھے اور اپنی زندگی انہوں نے اُن کے ساتھ مدغم کر دی تھی وہ گفتار کے غازی تھے اور کردار کے بھی اسی لئے برطانیہ کے اُردو ادیبوں اور اُردو برادری نے جس طرح انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا وہ اُن کے دل کی آواز تھی۔ ہمارے جذبات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنا وطن چھوڑ کر دیارِ غیر میں آ کر بس گئے ہیں لیکن اپنے وطن کی یادیں اب بھی ہمارے دل میں تازہ ہیں وقت کی تیز رفتار کے ساتھ وہ مدھم نہیں ہوئی ہیں بلکہ اپنی ذہنی دنیا میں ہم ان کے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ جو نقشہ ہمارے ذہن میں ہے اس میں تبدیلی ہمارے لئے آسانی سے قبول کرنا مشکل ہے۔
ان میں صرف وطن کی گلیوں اور عزیزوں کی یادیں ہی شامل نہیں اُن ہستیوں کے نقش بھی شامل ہیں جو عہد ساز تھیں اسی لئے اُن کی موت کا اثر ہم پر شدید ہوتا ہے۔ جب بانو احمد کہتی ہیں کہ ظلم و تشدد، لوٹ کھسوٹ، مزدوروں کا غم، سرمایہ دارانہ نظام کا عذاب، غریبوں کا دکھ دیکھ کر کڑھنے والا شاعرِ انقلاب اپنے پیچھے ایک پیغام چھوڑ گیا اور عوام کو ایک سہارا دے گیا تو وہ ہمارے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مشتاق لاشاری نے بالکل صحیح کہا کہ حبیب جالب کے خاندان کی سرپرستی کرنا ہمارا اور ہماری قوم کا فرض ہے

اس سلسلے میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تحریر منو بھائی کی ہے۔ انہوں نے کھری کھری باتیں کی ہیں
انہیں حبیب جالب کی موت ہی نہیں زندگی میں ان کی اور ان کے خاندان کی تکالیف پر غم و غصہ بھی ہے۔
حبیب جالب کی بیوی نے پاکستان کے وزیر اعظم کے سوال پر۔ وہ بڑی تلخی سے لکھتے ہیں کہ کشور ناہید
نے تو کسی سے نہیں پوچھا تھا کہ حبیب جالب کے جیل میں بند ہونے کی صورت میں اُن کی بیوی بچوں کے
اخراجات پورا کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔ انہوں نے حبیب جالب سے دوستی کا دم بھرنے والوں پر ایک
جرمانہ عائد کردیا تھا اور اس وقت تک عائد کر رکھا تھا جب تک وہ جیل سے باہر نہیں آگئے تھے حبیب جالب
کے بیوی بچوں کی ایک چھت کی حفاظت کے لئے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کہاں کہاں نہیں گئیں بیگم
جالب کے سامنے دوستی اور انسانیت کی یہ مثالیں تھیں اس لئے انہوں نے بڑی خودداری سے نواز شریف
کے سوال کا جواب دے کر گورنمنٹ کی مدد کو رد کر دیا۔ حبیب جالب کے یہاں چراغ تلے اندھیرا نہیں ہے
اس لئے اس خاتون کے بار کو ہلکا کرنا ہم سب کا ہی فرض ہے۔ ہمارے سامنے شیر شاہ قریشی کی فراغ دلی
کی مثال ہے جنہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جالب ٹرسٹ کے لئے پانچ ہزار پونڈ دیں گے۔ ایسی رقم دینا
ہم سب کے بس کی بات نہیں۔ لیکن جس طرح کشور ناہید نے حبیب جالبؔ کے دوستوں پر جرمانہ عائد کردیا
تھا ہم بھی اپنے اُوپر کر سکتے ہیں اور ہر مہینے ایک رقم جالب ٹرسٹ کے لئے مقرر کر سکتے ہیں۔ لیکن ضرورت
اس بات کی ہے کہ اب کمیٹی قائم کی جائے۔ جس کے سپرد یہ کام ہو کہ وہ ایک فہرست تیار کریں۔ جس میں اس
شخص کا نام شامل ہو جو اُردو ادب سے شغف رکھتا ہے جو حبیب جالب کی شاعری، ان کی شخصیت، ان کی
قربانیوں سے متاثر ہوا ہے لیکن چندہ جمع کرنے کے لئے اُردو کے اخبارات اور ہفتہ وار رسالے اور ماہنامے
ذمہ داری لے لیں تاکہ برطانیہ کے سارے اُردو دانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے کتنی ہی کم رقم ہو
لیکن جالب ٹرسٹ کے لئے کسی ایک پتے پر بھیجیں اور کمیٹی کسی بھی بینک میں جالب ٹرسٹ کا ایک اکاؤنٹ
کھول کر اس میں جمع کرتی رہے یہ کام ایسا مشکل نہیں ہے کہ اگر ہم کوشش کریں تو کیا نہ جاسکے اس ملک
میں اس قسم کا کام ہوتا رہتا ہے اس کے علاوہ ہمارے سامنے کشور ناہید جیسی مشہور معروف ہستی
نے ایک مثال قائم کردی ہے میرا خیال ہے کہ یہ کام لگن سے کرنا ہوگا اور بار بار لوگوں کو یاد دلانا ہوگا کہ حبیب
جالب کا ہم پر کیا قرض ہے۔ حبیب جالب وہ شاعر ہیں جنہوں نے ساری زندگی دار پر گزار دی اگر فیض صاحبؔ
کے لئے فیض میلہ کر کے ان کے امن، بین الاقوامی دوستی اور حقوق انسانی کے پیغام کو زندہ رکھا گیا ہے تو
برطانیہ میں اُردو ادیبوں کا بھی فرض ہے کہ جالب کی قربانی، عام انسانوں کے حقوق کے لئے سینہ سپر کر کے لڑنے
کی جیلوں میں مصیبتیں اٹھانے کی داستانوں کو بھول نہ جائیں اب کون آئے گا جو ببانگ دہل جرأت رندانہ سے
اعلان کرے کہ:

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

کیا ہم اس آواز کو بھلا سکتے ہیں ؟ اگر نہیں بھلا سکتے تو ہمیں خود سے سوال کرنا ہے کہ اسے زندہ رکھنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں ۔

(اقتباس : ماہنامہ منشور کراچی اگست ۱۹۹۳ء)

قتیل شفائی

حبیب جالب پاکستان میں عوام کی فکری آزادی کا سب سے بڑا نمائندہ اور سپاہی تھا جو ہمیشہ انقلاب اور آزادی کے گیت گاتا رہا ۔ ظالم طبقوں کے چہرے ننگے کرتا رہا اس نے اپنے افراد خانہ کی تربیت بھی اسی رنگ میں کی ۔ اس کی وفات پر کسی نے جالب کے بیٹے سے کہا کہ جالب اتنا اہم اور قدر آور شاعر تھا لیکن حکمرانوں میں سے کوئی بھی اس کی وفات پر تعزیت کے لئے نہیں آیا ۔ تو اس کے بیٹے نے کہا کہ ان کا نہ آنا ہی ہماری عزت افزائی ہے کہ وہ حکمرانوں کا نہیں عوام کا شاعر تھا ۔

شوکت چوہدری

عظیم شاعر حبیب جالب عوام کا ہی ایک حصہ تھا ۔ وہ عوام، انقلاب اور جدوجہد کے فلسفے پر یقین رکھنے والا ایک انقلابی تھا اس نے جدوجہد کے راستے پر مسلسل ڈنڈے کھائے مگر عوام کے ساتھ کندھے سے کندھا جوڑ کر چلا ——————
جالب کا یہ درس ہے کہ حکمرانوں اور سامراج کے خلاف جدوجہد جاری رہے ۔ اور یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک عوام خود حکمران نہیں بن جاتے ۔

قمر یورش

جالب پاکستان کے لکھنے والوں کے لئے قلم اور عمل کے ذریعہ جدوجہد کرنے

کا بہت بڑا استعارہ ہے۔ اس نے تلخ سے تلخ زندگی گزاری عمر کا ایک بڑا حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بسر کیا لیکن کلمۂ حق ہر جگہ اس کی زبان پر رہا۔

یوسف حسن

حبیب جالب نے اپنے قلم اور عمل دونوں سے جو کارنامے انجام دیئے ان کے لئے پاکستان کے جمہوریت پسند اور روشن خیال عوام، دانش در اور اہلِ قلم اُن کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے، اور اُن کی تحسین کا پورا حق شاید کبھی ادا نہ ہو سکے۔ اُن کے ساتھ وہ سارے اہلِ قلم بھی اپنے اپنے درجے پر سراہے جانے کے لائق ہیں، جنہوں نے اس آمریت کی موافقت کرنے والے اہلِ قلم کے مقابلے میں قلم سے یا قلم اور عمل دونوں سے کسی نہ کسی سطح پر اس کی مخالفت اور جمہوریت پسند قوتوں کی معاونت کی، حبیب جالب اور ستار طاہر کے علاوہ مرحومین میں سے فیض احمد فیض، منظور عارف، ظہور نظر، حزیں لدھیانوی، خاور رضوی، سیف زلفی، احمد شمیم، تنویر جیلانی، اور سبط علی صبا کے نام یاد آرہے ہیں۔ یہ سارے اہل قلم بنیاد پرست آمر کے نقطۂ نظر کی رو سے "تیسرے دھارے" سے تعلق رکھنے والے "اسلام دشمن" اور "پاکستان دشمن" اہل قلم تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں آمریت دشمنی اور جمہوریت پسندی کا اظہار کیا۔ بنیاد پرست آمریت کے گیارہ سالوں میں پاکستان کو جو کچھ بنا دیا گیا اور پھر اس دَور میں جمہوریت پسند سیاسی اور ادبی قوتوں نے جو کام کئے اور جو عذاب سہے اس کا ابھی تک جامع جائزہ سامنے نہیں آیا۔ خاص طور پر جمہوریت پسند اہلِ قلم کی خدمات کا قلمی اعتراف تو کیا یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں ہوا، کہ اس دَور میں کتنی مطبوعات ضبط ہوئیں اور کتنے اہلِ قلم نے مختلف سزائیں بھگتیں عہدِ آمریت کے بارے میں ممتاز صحافی اور ادیب احمد بشیر نے لکھا ہے:-

"اس طویل سیاہ رات کے دَوران قوم کو غیر سیاسی بنایا گیا۔ تشدّد قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والا بن گیا۔ اسلام کو مسخ کیا گیا۔ فرقہ پرستی کو ریاستی تحفظ دیا گیا۔ عورتوں اور اقلیتوں کی تحقیر کی گئی۔ پریس کو خاموش کر دیا گیا ہیروئن نے گھروں اور درکشاپوں پر یلغار کی، پولیس کی دہشت گردی قابلِ قبول ٹھہری، عدلیہ کو بدعنوان بنا یا گیا، انتظامیہ کو شخصی جاگیر بنایا گیا، معیشت زمین بوس ہو گئی۔ نسل پرستی اور علاقہ پرستی نے پاکستانی

قوم پرستی کی تنسیخ کر دی۔ اور قوم اپنے مستقبل پر یقین کھو بیٹھی۔"

(ترجمہ) (دی فرنٹیر پوسٹ پشاور، ۸ راپریل ۱۹۹۳ء)

اور یہ سب کچھ ہوا کس کے نام پر؟ اسلام کے مقدس نام پر جو مساوات و مواخات اور عدل و آزادی کی سب سے زیادہ تعلیم دینے والا مذہب ہے۔ مگر اس دور میں آمریت کی موافقت اسلام دوستی اور پاکستان دوستی ٹھہری اور جمہوریت پسندی اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی قرار پائی ۔۔۔!

اکادمی ادبیات کی ایک اہلِ قلم کانفرنس (منعقدہ ۱۹۸۵ء) میں جن جمہوریت پسند اہلِ قلم کی تحریروں کے اقتباسات اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی کے کے طور پر پیش کئے گئے ان میں سے تین نام احمد فراز، اختر حسین جعفری اور احمد جاوید کے ہیں۔ حبیب جالب کے علاوہ جو جمہوریت پسند اہلِ قلم کسی نہ کسی طرح کم یا زیادہ زیرِ عتاب آئے۔ اُن میں سے کچھ یہ ہیں۔ محمود شام، نصر اللہ ملک، شفقت تنویر مرزا، سجاد حیدر ملک، سجاد شیخ، فہمیدہ ریاض، اور تنویر سپرا۔

(تخلیق لاہور۔ اگست ۱۹۹۳ء)

یونس ادیب

وہ ادیب جو انعام و اکرام، ایوارڈ، شہرت اور چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے حکمرانوں کے پٹھو بن چکے ہیں انہیں حبیب جالب کی زندگی سے سبق سیکھتے ہوئے اس کی راہ پر چلنا چاہیئے اور حکمرانوں سے رشتہ توڑ کر عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہیئے کہ اسی میں ان کی عظمت ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ حبیب جالب نے کبھی اپنے فن کو بیچا نہیں بلکہ اپنی شاعری کو عوام کی خدمت کے لئے وقف کیا اور عوام کے دشمنوں کو کبھی چین کی نیند سونے نہیں دیا۔ وہ عوام کی امنگوں اور خواہشوں کے لئے سچے خواب بنتا تھا اور ان خوابوں میں اپنے خون سے رنگ بھرتا تھا جو نچلے طبقوں کے دل دماغ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

❋ ❋ ❋

Regd. No. 43755/85
Registered with the Registrar of Newspapers in India

Phone : 2247619

اُردو کا واحد حوالہ جاتی جریدہ

Alami Urdu Adab 1994

عالمی اردو ادب

(The only Refrence Journal in Urdu)

Habib Jalib Number

Price **(Inland) Rs. 150/-** (Foreign) **US Dollar 30**

Place of Printing Sanjeev Offset Printers, Delhi.
Statement about ownership and other particulars about

FORM IV

(As required by Rule 8 of Press Registrar's Act)

Place of Publication	Delhi
Periodicity of Publication	Half Yearly
Printer's Name	Nand Kishore Vikram
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, Delhi - 110051.
Publisher's Name	Nand Kishore Vikram
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, Delhi - 110051.
Editor's Name	Nand Kishore Vikram
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar Delhi - 110051.
Owner's Name	Nand Kishore Vikram
Address	J-6 Krishan Nagar Delhi - 110051.

I, Nand Kishore Vikram hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Nand Kishore Vikram
Publisher.

بابت فارم ۴
رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق
بیان بابت ملکیت وجملہ تفصیلات

۱۔ سالنامہ عالمی اردو ادب
۲۔ مقام اشاعت: جے ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱
۳۔ وقفہ اشاعت: ششماہی
۴۔ ۵۔ ۶۔ پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نند کشور وکرم
۷۔ قومیت: ہندوستانی
۸۔ پتہ: جے ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

میں نند کشور وکرم اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ اندراجات درست اور صحیح ہیں

نند کشور وکرم

طابع و ناشر نند کشور وکرم نے سنجیو آفسٹ پرنٹرز سے چھپوا کر جے ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱ سے شائع کیا

Alami Urdu Adab (Annual) Delhi-110051

Volume 9 | 1994 | Price Rs. 150